

صُبحانے فسانے

اشفاق احمد

Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com

"اپنے محلے کے امام مسجد کے نام!"

Virtual Home
for Real People

ترتیب

05	1- اماں سردار بیگم
22	2- خود بدولت
37	3- آڑھت منڈی
50	4- بیرباز
62	5- ماسٹر روشی
74	6- خانگی سیاست
86	7- مسرور مرثیہ
96	8- شازیہ کی رخصتی
106	9- بے غیرت مدت خاں
115	10- بندر لوگ
123	11- ڈھور ڈنگر کی واپسی
131	12- رازداں
139	13- پل صراط اور پاسپورٹ
146	14- وکھو وکھو
153	15- قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا
159	16- مہمان عزیز
165	17- بیک گراؤنڈ

171

18۔ زرناب گل

176

19۔ دم بخود

181

20۔ بدلی سے بدلی تک

186

21۔ چاند کا سفر

190

22۔ سہیل کی سالگرہ



Virtual Home
for Real People

اماں سردار بیگم

میری والدہ کا نام سردار بیگم تھا اور گھر کے سب چھوٹے بڑے ان کو ”اماں جی“ کہہ کر بلاتے تھے لیکن ان میں میرے حساب سے کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جس کی وجہ سے ان پر کوئی مضمون لکھا جائے ان کو ادب اور تاریخ کے فورم سے ہو کر گزرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ ایک عام سی سیدھی سادھی اور گھر چوکھٹ کی بی بی تھیں جو زندگی کی پگڈنڈی پر سیدھے سبھاؤ چلتی ادھر سے ادھر پہنچ جاتی ہیں اور جن کے چلے جانے کے بعد کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوتی اور وہ پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کوئی خلا بھی نہیں چھوڑتیں!

اس وقت بھی جب میں یہ چند سطریں جلدی جلدی گھسیٹ رہا ہوں تو مجھے اپنی اماں کا چہرہ ان کی باتیں اور ان کا زمانہ یاد کرنے میں بڑی دقت ہو رہی ہے۔ وہ ہماری زندگیوں میں بہت قریب ہوتے ہوئے بھی کبھی شدت سے نظر نہیں آئیں۔ معدوم معدوم سی رہیں اور موہوم سے زندگی گزار کر ایک روز گھر کے پچھلے دروازے سے نکلیں اور میانی صاحب چلی گئیں۔ وہ دبدبہ اور طنطنہ اور جاہ و جلال جو آٹھ کامیاب بچوں کی ماں میں ہوتا ہے کہ اس کا سایہ بھی ٹیڑھا نہیں پڑتا، میری ماں میں سرے سے مفقود تھا۔ وہ زمین سے آسمان سے زمانے سے اور ان کے خالق و مالک سے بہت ڈرتی تھیں اور کچھ اس دیواروں سے لگ لگ کر زندگی گزارتی تھیں کہ کسی کو ان کے بچوں کی خبر نہ ہو جائے۔ کوئی گنتی نہ کر لے۔ کسی کو ان کے گھرانے کے ”ہونے“ کا علم نہ ہو جائے۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ ہم کو بھی اپنے جیسا گنہگار اور بے نام بنا کر اس دنیا میں داخل کر دیتیں اور پھر کسی کو علم تک بھی نہ ہوتا کہ اس عہد کے گوہر نایاب کس طرح مٹی میں مل گئے!

اس زمانے میں بچے نوکر نہیں پالتے تھے، مائیں پالتی تھیں۔ غریب مائیں، امیر مائیں، بھونڈی مائیں، پھوہڑ مائیں، اور اپاہج مائیں، پاک باز اور طوائف مائیں سبھی اپنے بچے خود پالتی تھیں۔ ان کے پاس بچے پالنے کا سستا اور آسان نسخہ تھا کہ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ بچے اپنی ماں سے چالیس پینتالیس گز کے ریڈیس میں کہیں بھی جاتے، کہیں بھی ہوتے، کہیں کھیلتے ان کو اچھی طرح سے معلوم ہوتا تھا کہ مشکل وقت میں ان کی پکار پر اماں بجلی کی طرح جھپٹ کر مدد کے لیے آ موجود ہوگی اور وہ اپنی مشکل اپنی ماں کے گلے میں ڈال کر گھر کے اندر کسی محفوظ کونے میں پہنچ جائیں گے۔ اس زمانے کی مائیں بچوں کو اپنی عقل و دانش سے یا نفسیاتی ذرائع سے یا ڈاکٹر سپوک کی کتابیں پڑھ کر نہیں پالتی تھیں بلکہ دوسرے جانوروں کی طرح صرف متا کے زور پر پالتی تھیں۔ بچے بھی کھلونوں، تصویروں، ماؤں کی گودیوں اور لمبی لمبی کیوٹی کمیشنوں کے بغیر پروان چڑھتے تھے اور ذہنی، جسمانی اور روحانی طور پر بڑے ہی سرسبز ہوتے تھے۔ ان کے پاس یقین کی ایک ہی

دولت ہوتی تھی کہ ماں گھر پر موجود ہے وہ ہر جگہ سے ہماری آواز سن سکتی تھی۔ جس طرح پکے پکے خدا پرست کو پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کے حلقے میں ہر وقت موجود ہے اور وہ جب اسے پکارے گا، رگ جان سے بھی قریب پائے گا اسی طرح بچے کو بھی اپنی پکار اور ماں کے جواب پر مکمل بھروسہ ہوتا تھا!

میری ماں کچھ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ گاؤں میں اپنے عالم فاضل، نوکری پیشہ چچاؤں کے چھٹی آنے پر جلدی جلدی جو کچھ پڑھ لیا، پڑھ لیا اس کے بعد انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ اخبار بڑی آسانی سے پڑھ لیتیں اور مضمونوں اور اداروں کے رخوں کو بھی سمجھ لیتی تھیں لیکن لکھنے کے معاملے میں ان کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ گرمیوں کی لمبی اور بھرپور دوپہر لگا کر وہ ایک کاپی کا صفحہ لکھ تو لیتی تھیں لیکن اسے پڑھنا کافی مشکل ہو جاتا تھا۔ اماں کے بچے بہت خراب تھے لیکن وہ اردو کے موثر الفاظ مثلاً 'مصدق'، 'تفحیک'، 'القصہ' اور وغیرہ بڑے شوق سے استعمال کیا کرتی تھیں۔ گوان الفاظ کے سپلنگ ہمیشہ غلط ہوتے تھے لیکن یہ فقرے میں سجتے بہت تھے۔ ان کے خط کا کوئی لفظ کٹا ہوا نہیں ہوتا تھا سوائے 'طولعمرہ' کے۔ وہ ہر بچے کے ساتھ طولعمرہ لکھنا ضروری خیال کرتی تھیں اور یہ لفظ بار بار کٹنے سے ہر بچے کے حصے میں کم از کم چھ طولعمرہ آ جاتے تھے اور نام کے سامنے ایک خوبصورت سی تجریدی جھالر بھی بن جاتی تھی۔ ان کے خطوں میں اکثر دوشعر بھی ہوا کرتے۔ جب کسی وجہ سے انہیں یہ احساس ہوتا کہ ہم میں تکبر، رعونت یا گھمنڈ کا کوئی شائبہ پیدا ہو گیا تو وہ اکثر لکھا کرتیں:

کبیرا ایسے ہو رہو جیسے نر بل نیر

پیچھے پیچھے ہر پھرے کہت کبیر! کبیر!!

اور دوسرے جب انہیں ہمیں "بک اپ" کرنا مقصود ہوتا تو اپنی مخصوص لکھائی میں رقم کیا کرتیں:

الوالعرفان دانش مند جب کرنے پہ آتے ہیں

سمندر پھاڑتے ہیں، کوہ سے دریا بہاتے ہیں

جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے دیکھا کہ اماں کو صبح تین بھینسوں کا دودھ دوہنا پڑتا تھا، بڑے ٹوکے کا گول پہیہ چلا کر دوپوے چارہ کترنا پڑتا تھا اور اٹھارہ آدمیوں کی روٹی پکانی پڑتی تھی۔ کبھی کبھی کچھ مہمان آ جاتے تو اٹھارہ سے بڑھ کر یہ تعداد اٹھائیس تک بھی پہنچ جاتی تھی لیکن ان کو یہ بوجھ ناگوارہ نہیں گزرتا تھا کہ ایک تو مہمان اپنا رزق ساتھ لاتے تھے دوسرے ان کے آنے سے گھر کی برکتوں میں اضافہ ہو جاتا تھا، تیسرے ان کی وجہ سے بچوں سے ہر قسم کی بلائیں دور ہو جاتی تھیں۔

اماں کا چولہا کھلے صحن میں تھا۔ نہ اس پر دھوپ سے بچنے کی کوئی اوٹ تھی نہ بارش سے بھگینے میں کوئی رکاوٹ۔ چودہ مرلے کے کھلے آنگن میں آسانی سے ایک چھتی ہوئی رسوئی بن سکتی تھی لیکن پتہ نہیں اباجی نے ایسا کیوں نہ کیا۔ اماں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بھٹیوں کی طرح گرم اور الاؤ سے زیادہ سرخ چولہوں کے پاس بیٹھ کر مزے سے روٹی پکایا کرتیں اور ہم اپنا اپنا کھانا اٹھا کر برآمدے میں پٹکھے تلے چلے جایا کرتے۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر پسینے کی دھار نمودار ہوتی تو وہ ہاتھوں میں پیڑا پکڑے پکڑے آستین سے اپنا چہرہ پونچھ لیتیں

لیکن جب ان دھاروں کا دوبہ قابو سے باہر ہو جاتا تو وہ اپنے کھر درے دوپٹے کا ”بنوں“ سا بنا کر اس سے اپنا شرابور چہرہ رگڑ رگڑ کر خشک کر لیتیں۔ اگلی روٹی پر پھر یہی عمل دہرانا پڑتا۔ آفتاب بھائی اگر گھر پر ہوتے تو وہ چولہے کی دیوار کے ساتھ ایک منجی کھڑی کر کے اس پر مجنوں ڈال دیتے اور اماں کے لیے سایہ مہیا ہو جاتا۔ بڑے مزے کا زمانہ تھا۔ ہم علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ صحت جسمانی کے حصول میں بھی کوشاں تھے اور اماں ہمہ وقت ہماری خدمت گزاری پر مامور تھیں۔

اب جب میں اپنی بہوؤں اور بھانجیوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اماں کا وہ ہولناک زمانہ یاد آتا ہے جب رات کے بارہ بجے کام کاج سے فارغ ہو کر دودھ کو جامن لگا کے ہارے میں رکھ کر چار پائی پر لیٹتی تھیں اور ملا کی اذان سے پہلے صبح کے کام کی چیزیں چولہے کے سامنے نصف دائرے میں رکھ کر بانگ کے ساتھ ہی مصلے پر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ نماز سے عجلت کے ساتھ فارغ ہوتے ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں تلاوت شروع کر دیتیں اور پاؤ بھر پارہ خالص پنجابی لہجے میں تلاوت کرنے کے بعد دوپٹہ گردن سے لپیٹ کر دودھ بلونے لگتیں۔ اماں کی دھانی آواز پر ہم سب جاگ جاتے لیکن اپنے اپنے بستروں میں اسی طرح پڑے رہتے۔ میری دونوں آپائیں ایک ساتھ وضو کر کے ایک ساتھ تخت پوش پر چڑھتیں اور روشنی پھیلنے تک بردابری ایک ساتھ نفل پڑھا کرتیں۔

جب لسی رڑکنے کی آواز بند ہو جاتی اور سارے میں پراٹھوں کی دھواں دھار خوشبو پھیلنے لگتی تو ہم ایک ایک کر کے اٹھتے اور منہ پر کپے یکے چھپا مار کر اماں کے سامنے پیڑھیوں پر آ بیٹھتے۔ بس یہی ایک وقت تھا جب ہمارے اور اماں کے درمیان کچھ واضح قسم کی گفتگو ہوتی ورنہ باقی کا سارا وقت تو اپنے اپنے کام میں بھسم ہو جاتا تھا۔

اب سوچتا ہوں تو کچھ عجیب طرح کے خیال اور انوکھی باتیں ذہن میں آ جاتی ہیں۔ اس وقت ان کا احساس ہو بھی جاتا تو پھر بھی ہم کچھ نہ کرتے۔ اب بھی تو بہت سی چیزوں کا احساس ہو چکا ہے اور احساس کی اس وسیع و عریض جھیل میں نت نئے احساس کے صاف پانی ہر روز شامل ہوتے رہتے ہیں لیکن کچھ بھی نہیں ہو پاتا۔ انسان دراصل بہت سہل انگار اور آرام طلب شے ہے۔ جب کبھی اس کا احساس اسے شدت سے تنگ کرنے لگتا ہے تو وہ دوسروں کے درپے ہو جاتا ہے اور ان کو شرم دلانے لگتا ہے کہ تم کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ کچھ جھڑکیوں اور الہنوں کا انداز تو اس غضب کا ہوتا ہے کہ وہ دنیاے ابلاغ میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر جاتے ہیں!

میری ماں کے زمانے میں عورت محبت کے میدان میں سب سے آگے ہوتی تھی اور جب انعام تقسیم ہونے کا وقت آتا تو غائب غلہ ہو جاتی۔ اس کو مکٹ سجا کے پہنچیاں پہن کے اور سرمہ کا جل لگا کے مہان خصوصی بننے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ نظروں سے اوجھل ہو کر ایسے اوہلے میں چھپ جاتی تھی کہ مدتوں اس کا اثر آثار کا پتہ تک نہ چلتا تھا۔ یہ مہارت شاید اس نے پردہ نشینی سے حاصل کی تھی۔ بڑے سے بڑا کام کرنے کا بعد بھی وہ ہیروئن کی سٹیج پر آنے سے کتراتے تھی۔ اس زمانے میں عورت کا روپ پری کا سا تھا۔ جب کوئی بھی نہ ہوتا تو وہ باغ لگا کر پھول کھلا کر تخت بچھا کر اور پکوانوں کے ڈھیر لگا کر غائب ہو جاتی تھی اور کہیں دور چھپ کر نوع انسانی کو خط و سرور کی محفل انبساط سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ وہ ہر کارکردگی کے پیچھے اپنی لاموجودگی کا امپریشن برقرار رکھ کے خلاق کے وسیع تر دائرے کا مرکز بنی رہتی اور اس کو اس بات کا احساس تک نہ ہوتا کہ وہ یہ کام شعوری طور پر کر رہی ہے یا کسی مقصد کے لیے کر رہی ہے۔

اماں کا ہر روز باریک باریک پالک، موٹے موٹے آلہ اور گول گول ٹماٹر کاٹ کر انہیں بڑے پریم اور چاؤ کے ساتھ دھونا، ساتھ ساتھ کچھ پڑھتے پڑھتے جانا، گھی پیاز نمک مرچ ہلدی دھنیا اس طرح دیکھی میں اتارنا کہ کسی کی نظر ڈالنے سے بھی گریز کرنا، ڈوئی کی ہر گھومتا کے ساتھ پانی کا چھینٹا دینے کے بجائے چوڑے پیندے اور بڑے منہ کے ڈمگماتے گلاس، ایلومینیم کے کٹورے، ہشت پہلو تانبے کی رکابیاں جو قلعی کے گھس جانے سے با تصویر ہو گئی تھیں، اصلی ریتی کی چھری جو درمیان سے گھس گھس کر کیلا کاٹنے والوں کی بانک بن گئی تھی اور مراد آباد جگ جس پر بڑے بڑے ابھرنواں پھول بنے تھے۔۔۔۔۔ چونکہ اس عہد کی عورتیں بور ہونے کے فن سے نا آشنا تھیں اسلئے وہ گیارہ گیارہ سال تک ایک ہی قسم کے برتنوں کو دھوئے جاتی تھیں اور ان کی کمپنی میں خوش رہتی تھیں۔ میری ماں کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اب جو تھالی دھونے کے لیے اٹھائی ہے اور جس کے گلاب کی ساری پنکھڑیاں گھس گئی ہیں لیکن اسکی ناشپاتی کی ڈنڈی بالکل سلامت ہے، یہ طشتری اسحاق کی ہے۔ جس کا سب کچھ معدوم ہو چکا ہے، اس میں افتخار کھاتا ہے اور جس کا گلاب اور ناشپاتی اپنے اصل رنگ روپ کے ساتھ قائم ہیں، وہ اشتیاق کی پلیٹ ہے۔ اب جن برتنوں کی نامزدگیاں اس قدر محترم ہوں، ان سے کوئی ماں کس طرح سے بور ہو سکتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں تو ہر بے جان برتن کیسٹ کی طرح بولتا ہے اور بچن میں ریڈیو کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ہر طرف میلہ سالگاہ رہتا ہے! کھانا کھاتے وقت ہم بہن بھائی بڑے دقیق مسائل گہری وارفتگی سے سلجھایا کرتے اور بحثا بحثی میں ہمارے فقرے کٹ کٹ کر آدھے سے بھی کم رہ جاتے۔ اس بین الکلیاتی مباحثے کے دوران اپنی اماں سے ہماری گفتگو اکثر ان جملوں تک محدود ہوتی تھی:

اماں آج نمک پھر زیادہ ہے۔

ہلدی کچی ہے، گھی پرانا ہے۔

مرچیں تیز ہیں۔

گونگلو کچے ہیں، ادراک سخت ہے۔

کھانا بد ذائقہ ہے۔

اماں کے پاس ہر اعتراض کا ایک ہی شافی جواب ہوتا تھا کہ بے خیالی اور بھلکڑ پن سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ورنہ نمک مرچ اور سبزی گوشت تو سب ٹھیک ٹھاک تھے۔

کھانے کے بعد ان اوقات میں بڑی آ پا اور آفتاب بھائی فلسفے کی پیچیدہ گتھیاں سلجھا رہے ہوتے تو کبھی کبھی اماں بھی اس میں دخل دے دیا کرتیں۔ جب بھائی جان بنی نوع انسان کی ذہن حالی اور ہندوستان کے پائمال و پریشان مسلمانوں کی بے بسی اور بے آبرو کا نقشہ کھینچتے تو سب کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اس سلسلے میں جب بے حس امیر مسلمانوں اور بدکردار مسلم رؤسا کا ذکر چلتا تو ہماری آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں خون اتر آتا۔ اماں ہلکے سے خوف، ذرا اسی ہچکچاہٹ کے ساتھ دبی ہوئی آواز میں کہتیں، ”ہمیں اپنے غریب بہن بھائیوں کی حالت زار دیکھ کر اور ان کے بے سروسامانی اور بے آبروئی پر ترس کھا کر ان کی مدد نہیں کرنی چاہئے بلکہ اللہ رسول کے حکم کی وجہ سے ان کی دستگیری کرنی چاہئے۔ ترس کھانے اور آنسو بہانے کے مقابلے میں اللہ کے رسول کا حکم زیادہ زور آور اور زیادہ ڈاڈھا ہے۔ ہم کو

حکم ماننا ہے، ترس نہیں کھانا۔“

مٹھلے بھائی ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے کہہ دیتے ”اماں یہ باتیں آپ کی سمجھ سے اوپر کی ہیں اس لیے آپ ان میں دخل نہ دیا کریں۔ ہو سکے تو ان کو غور سے سنا کریں اور ان پر عمل کی کوشش کریں۔“ اماں معذرت بھرا، شرمندہ سا چہرہ لے کر خاموش ہو جاتیں۔ لیکن کبھی کبھی پھر ایسا موقع آ جاتا کہ ان کے منہ سے ایسی ہی کوئی بات نکل جاتی اور اباجی سمیت ہم سارے پنچے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جاتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان سے محبت نہیں کرتے تھے یا ہمارے گھر میں ان کی کوئی عزت نہیں تھی یا ہم ان کو مان نہیں دیتے تھے۔ ایسی بات نہیں تھی۔ ہمارے نزدیک وہ اتنی ہی معزز و محترم تھیں جس قدر پڑھ لکھے گروہ کے نزدیک ان پڑھ عوام الناس کا ٹولہ ہوتا ہے ماں ہونے کے رشتے سے اور انسان ہونے کے حوالے سے ہم اپنی ماں کا بڑا احترام کرتے تھے لیکن تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باعث ہم ان کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بڑی خوبصورت، بہت ہی حسین اور بے حد وجیہہ خاتون تھیں لیکن ان کے اور ہمارے درمیان کوئی علم کی قدر مشترک نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اور ہمارے درمیان کوئی ڈائیلاگ نہیں تھا۔ کبھی کبھار جب ہم اپنی شرافت علمی کی بدولت ان کے قریب آنے کی کوشش بھی کرتے تو وہ کوئی ایسا جملہ بول جاتیں جس کی پڑتال ہماری کتابوں سے نہیں ہوتی تھی اس لئے ہم ایک مرتبہ پھر ان سے دور ہو جاتے۔ مثلاً ایک مرتبہ میرے والد اور بڑے بھائی زندگی اور موت پر اپنی خوبصورت آرا کا اظہار کر رہے تھے اور ہم سارے چھوٹے مہبوت ہو کر ان کے فلسفیانہ افکار سے مرعوب ہو رہے تھے کہ میرے والد نے کہا ”بات یہ ہے آفتاب میاں کہ موت ایک معمہ ہے اور اس کا کچھ پتا نہیں چلتا“۔ اماں جو قریب بیٹھی بھنڈیاں کاٹ رہی تھیں رہ نہ سکیں اور سر اٹھا کے بولیں ”موت اگر ایک معمہ ہے ڈاکٹر صاحب تو موت ہی اس کا حل بھی تو ہے!“ اباجی نے غضب ناک آنکھوں سے اماں کی طرف دیکھ کر کہا ”جس بات کی سمجھ نہ ہو سر دار بیگم اس میں دخل نہیں دیا کرتے۔“ اماں پھر سر جھکا کر بھنڈیاں کاٹنے میں مشغول ہو گئیں۔

اماں کی یہ باتیں مجھے اب یاد آ رہی ہیں تو میں انہیں زور لگا کر بیان کرنے لگا ہوں۔ اس وقت تو میں بھی ابا اور اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔

ہمارے گھر میں میری بڑی آپا کے مضمون ”تہذیب نسواں“ اور ”عصمت“ میں شائع ہونے لگے تھے اور اماں گرمیوں کی لمبی دوپہر صرف کر کے ان مضامین کو بڑی مشکل سے اٹھاتی تھیں۔ آپا نے کئی مرتبہ کہا بھی کہ اماں یہ آپ کے پڑھنے کی چیزیں نہیں ہیں کہ ان میں عورتوں کے مشکل مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے لیکن وہ آپا کی بات کا جواب دیئے بغیر بڑی کاوش سے ان پر چوں کو ڈھونڈتیں اور اپنی بیٹی کے مضامین کا مطالعہ کر کے خوش ہوتیں۔ آپا کو ہندوستان کے دور دراز شہروں سے تعریفی خط آنے شروع ہو گئے تھے اور ہم سب بڑے فخر کے ساتھ ان خطوں کو باجمات پڑھا کرتے تھے۔ اماں بھی گھومتے پھرتے کام کاج کرتے، بہانے بہانے ہمارے پاس رک کر خطوں کی عبارت سنا کرتیں اور دل ہی دل میں اتریا کرتیں۔ ایک روز جب بڑی آپا نے اباجی کی موجودگی میں اعلان کیا کہ اس وقت ہندوستان کے سبھی پڑھ لکھے لوگ میری تعریف کرتے ہیں اور میرا مان بڑھاتے ہیں تو اماں نے واشگاف الفاظ میں کہا ”جب سبھی لوگ کسی شخص کی تعریف کرنے لگ جائیں تو اس شخص کو آپ ہی شرم آنی چاہیے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب سب لوگ تمہاری تعریف و توصیف اور قدر افزائی پر

یکجا ہو جائیں تو تمہیں چوکنے ہو جانا چاہیے۔ یہ بہت ہی بری بات ہے۔“ یہ بات سن کر میری مضمون نگار آپا کا چہرہ اتر گیا اور ان کی آنکھیں بھر آئیں تو اباجی نے ہاتھ کے قہر آگیاں اشارے سے اماں کو کمرے سے نکال دیا۔ دراصل بڑی آپا ہمارے ابا کی ساری اولاد میں سب سے زیادہ لاڈلی تھیں اور ہم سب ان کے جلو میں باادب با ملاحظہ ہوشیار ہو کر چلا کرتے تھے۔

کھانے پینے کے معاملے میں اماں کا دستور زرا لاکھا تھا۔ جب گھر کے سب لوگ، نوکر چاکر، مہمان اور کبھی کبھی آنے والے فقیر بھی کھا چکے تو اماں کی باری آتی۔ وہ پہلے تو دیکچوں میں آدھی چپہ روٹی پھیر کر انہیں دروتہ جام سے لٹھیرتیں پھر انہیں نیبویا آم کے اچار سے کھاتیں اور ساتھ دھنیا گھولوا چٹنی میں انگلی ڈبو ڈبو کر لقمے کے ساتھ ساتھ چاٹی جاتیں۔ اس وقت اماں چند ایسی لامعلوم بیماریوں میں مبتلا تھیں جن کے علاج دریافت نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً پھل کھا کر ان کے معدے میں جلن ہونے لگتی تھی، مٹھائی کھانے سے ان کی آنکھیں سوج جاتیں اور پتی اچھلنے لگتی، دودھ پینے سے سرد در شروع ہو جاتا اور پلاؤ کباب کھانے سے تنفس میں تیزی آ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے پراٹھے کے ساتھ بھنا گوشت کھا لیا تھا تو مرتے مرتے بچیں۔ ٹھنڈا شربت، گرم چائے، آئس کریم اور فالودہ کھانے سے ان کی انتڑیوں میں سدے پڑ جاتے تھے اور مرتبہ کھانے سے ان کی نگاہ کمزور ہو جاتی تھی۔ ہم نے ساری زندگی ان کو کبھی ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوتے دیکھا نہیں لیکن ان کی بیان حلفی پر یقین رکھا کہ اگر وہ ایسی بے اعتدالی کریں گی تو یقیناً ان خوف ناک بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں گی۔

اماں باسی کھانے پرانے ساگ، اترے ہوئے اچار اور ادھ کھائی روٹیاں بہت پسند تھیں۔ دراصل وہ رزق کی قدردان تھیں، شاہی دسترخوان کی بھوک نہیں تھیں۔ میری چھوٹی آپا کئی مرتبہ خوف زدہ ہو کر اونچی آواز چیخا کرتیں:

”اماں حلیم نہ کھاؤ پھول گیا ہے۔ بلبلے اٹھ رہے ہیں“

”یہ ٹکڑا پھینک دیں اماں، سارا جلا ہوا ہے“

”اس سالن کو مت کھائیں، کھٹی بو آرہی ہے“

”یہ امرود ہم نے پھینک دیئے تھے ان میں کیڑا نکلا تھا“

”لقمہ زمین سے نہ اٹھائیں، اس سے جراثیم چمٹ گئے ہیں“

”اس کٹورے میں نہ پیئیں، یہ باہر بھجوا یا تھا“

لیکن اماں چھوٹی آپا کی خوف ناک للکاروں کی پروا کئے بغیر مزے سے کھاتی چلی جاتیں۔ چونکہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں اس لئے

جراثیموں سے نہیں ڈرتی تھیں، صرف خدا سے ڈرتی تھیں!

اولاد کے بارے میں میری اماں کا بالکل دیہاتی ماؤں جیسا تھا۔ وہ جب بھی اپنے بچوں کی بھلائی کا سوچتیں، سب سے پہلے کل دنیا کی خیر مانگتیں۔ اس کے بعد دنیا بھر کے بچوں کی اور پھر ان کے طفیل اپنے بچوں کی صحت و سلامتی اور دین و دنیا میں سرخروئی کی طلب گار ہوتیں۔ میں نے ان کو بڑے بڑے سانحوں اور بڑی سے بڑی افتاد پر کبھی گھبرائے ہوئے یا بھرائے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن جب کبھی بد قسمتی سے انہیں پولیس کی وہ دین نظر آ جاتی جس میں قیدی جیل سے کچھری لائے جاتے تھے تو ان کا رو رو کر برا حال ہو جاتا۔ وہ قیدیوں کو

مجرموں یا ملزموں کے بھیس میں نہیں دیکھتی تھیں بلکہ ماؤں کے بیٹوں کے روپ میں دیکھتی تھیں۔ ہاتھ باندھ کر اور چہرہ اوپر اٹھا اٹھا کر ایک ہی التجا کئے جاتیں کہ یا اللہ ان کو معاف کر دے ان کو ان کو آزاد کر دے ان کو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملا دے۔ اماں کے ساتھ کبھی باہر جاتے ہوئے ایسی وین کا مل جانا ہم سب کے لئے سوہان روح بن جاتا تھا اور ہماری کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس وین کو آتے دیکھ کر کسی بغلی گلی یا محققہ راستے سے نکل جائیں تاکہ اس پر اماں کی نظر نہ پڑے۔

جب میں ایف اے میں داخل ہوا اور میں نے درسی کتابوں کے علاوہ لائبریری میں دوسری غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو میں نے محسوس کیا کہ اماں میں علمی کے باوجود کچھ خوبیاں بھی ہیں جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتیں۔ لیکن جب میں ان خوبیوں کو تلاش کرنے بیٹھا تو مجھے وہ تین سے زیادہ نظر نہ آئیں۔ اماں کو اپنا آپ اپنی خوبیاں اپنے کام اور اپنی مہربانیاں چھپانے کا ایسا اچھا ڈھنگ آتا تھا کہ وہ موہڈی ہو کر بھی بیک گراؤنڈ کے اندر زندگی بسر کرتی تھیں۔ کسی کو پتہ نہ چل جائے کوئی جان نہ لے کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ یہ کام اماں سردار بیگم نے کیا ہے اور اپنی کلا جگانے کے لئے کیا ہے۔ ایک مرتبہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنی شادی پر تو توجہ کا مرکز ضرور بنی ہوں گی تو انہوں نے کہا ”میری شادی دراصل میری شادی نہیں تھی وہ تاج بی بی کی شادی تھی۔ اس شادی میں میرے گھر والوں نے مجھے بھی ساتھ بٹھا دیا اور تمہارے ابا سے میرا نکاح ہو گیا۔ اصل میں وہ شادی میری پھوپھی زاد بہن تاج بی بی کی تھی اور چونکہ اصل دلہن وہی تھی اس لئے سب کی توجہ اس ہی پر مرکوز تھی۔ میری شادی تو میری پھوپھی نے میرے والدین سے یہ کہہ کر نمٹا دی تھی کہ سردار بیگم کا چھابا بھی ساتھ ہی کاٹ دو پھر کہاں لوگ بار بار آتے پھریں گے!“

جب میں ادیب بن رہا تھا اور بڑی رات گئے گھر آتا تو اماں کو میرے اس دیر سے آنے پر بڑی تشویش تھی۔ جب تک میں نہ آتا وہ چار پائی پر جھوٹ موٹ سوئی ہوئی کچھ پڑھتی رہتیں۔ جب میں آتا تو وہی اٹھ کر دروازہ کھلتیں اور وہی جلدی سے تو اڈال کر میرے لئے گرم گرم روٹی پکاتیں۔ میں نے ٹی ہاؤس سے اور کافی ہاؤس سے بہت کچھ کھایا ہوتا لیکن اماں کی خوشنودی کے لئے مجھے ان کے پاس چوکی پر بیٹھ کر باقاعدہ کھانا کھانا پڑتا۔ ماں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”تو اتنی رات گئے کہاں سے آتا ہے؟“ تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب میں یہ بات اپنی پیاری ماں کو کس طرح سے سمجھاؤں کہ میں ادیب بن رہا ہوں اور ادیب رات کو دیر سے ہی گھر آیا کرتے ہیں۔ مجھے اپنی بہت سی کمیوں کو پورا کرنا تھا اور کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنی تھیں۔ میرے تین افسانے چھپ چکے تھے اور مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ مرزا یاس یگانہ چنگیزی کون ہیں۔ میں اپنے کالج کی بڑی کلاس میں تھا بڑی عمر کا تھا پنختہ کا تھا لیکن مجھے فراق کا ”ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی“ والا شعر نہیں آتا تھا اور اس کے اندرونی مطالب معلوم نہیں تھے۔ ہمارے کالج میں تھرڈ ایئر کا ایک لڑکا مظفر علی سید نامی علم کا دریا تھا اور اس کو مشرق و مغرب کے سارے رموز سے گہری آشنائی تھی۔ سنگ میل پشاور میں میرا چوتھا افسانہ شائع ہو چکا تھا لیکن مجھے ڈی ایچ لارنس کا علم نہ تھا۔ مظفر علی سید نے مجھے بتایا کہ لارنس کا ایک ناولٹ ”The man who died“ پنجاب پبلک

لائبریری میں موجود ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک نمبرڈ نسخہ ہے اور پرائیوٹ سرکیولیشن کے لئے چھاپا گیا ہے۔

اسی نے مجھے بتلایا کہ میراجی کی نظم ”لب جو یار“ کا کیا مفہوم ہے اور ”کیسے تلوار چلی کیسے زمین کا سینہ۔۔۔۔۔“ کا مطلب ہے۔

مظفر علی سید ہی نے مجھے میرا سین سے روشناس کرایا اور بتایا کہ میرا جی ساری عمر اس سے اپنا مدعا بیان نہیں کر سکا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بمبئی چلا گیا تھا، عین اسی طرح جس جارج مور کے ساتھ ہوا تھا۔ میں جارج مور کے بارے میں الف سے بے نہیں جانتا تھا لیکن میں نے اس طرح سے سر ہلایا جیسے میں نے اس کا سارا لکھا از بر کر رکھا ہو۔ مظفر علی سید نے کہا ”جارج مور اپنی ایک من پسند خاتون کو یہ بتلانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے شدید محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزر سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی محبت کے اظہار کے لئے سڑک کے ایک ایسے موڑ کا انتخاب کیا جہاں اس کی محبوبہ ہر روز سیر کی غرض سے جایا کرتی تھی۔ اس نے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ مور نے سوچا کہ اس موڑ پر نہ سہی تو اگلے پل پر میں اس سے ضرور بات کروں گا۔ لپک کر وہاں پہنچا تو اس کی محبوبہ دریا کنارے گل فروش سے ایک گلدستہ خرید رہی تھی۔ سوچا یہ مناسب مقام نہیں، خط لکھنا چاہئے۔ گھر آ کر ایک درود بھرا خط لکھا اور اپنی لینڈ لیڈی کے حوالے کر دیا کہ اسے احتیاط سے پوسٹ کر دینا۔ لینڈ لینڈی ڈاک خانے جا رہی تھی تو اسے آواز دے کر روکا کہ خط میں کچھ تبدیلیاں کرنی ہیں۔ تبدیلیاں ہو چکیں تو سوچا کہ ایسا خط مجھے خود پوسٹ کرنا چاہئے گھر سے نکل کر بڑی سڑک کے لال حصے پر پہنچا تو رک گیا کہ یہ لیٹر بکس ایسا ضروری خط پوسٹ کرنے کے لئے مناسب نہیں، اگلے چوراہے والے میں ڈالوں گا جہاں سے دن میں تین مرتبہ ڈاک نکالی جاتی ہے۔ مناسب حصے پر پہنچا تو خیال آیا کہ کیوں نہ ایسا اہم خط جی پی او جا کر سپر ڈاک کیا جائے! جی پی او بہت دور تھا۔ معاملہ اگلے دن پر ڈال دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خط جارج مور کی زندگی میں پوسٹ ہی نہ ہو سکا، ادھر ادھر ہو گیا۔ حال ہی میں اس کے سوانح نگار نے خط شائع کیا ہے جس میں وہی باتیں ہیں جو میرا جی، میرا سین سے کرنی چاہتا تھا۔

اماں نے دبی زبان میں مجھ سے پھر پوچھا کہ ”تو اتنی رات گئے کہاں سے آتا ہے؟“ میں رات رات گئے تک ادیبوں اور دانشوروں کی محفل میں رہتا تھا اور ان سے بڑی تیزی کے ساتھ وہ گریس رکھتا تھا جن کی بدولت وہ نامی گرامی شاعر، ادیب اور مفکر بن گئے تھے اور لوگ سڑک کے دونوں کنارے منہ میں انگلیاں ڈال کر انہیں دیکھتے تھے۔ منٹو بمبئی سے لاہور آ کر لکشمی مینشن میں آباد ہو گیا تھا۔ وہ حلقہ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین دونوں کی بزموں میں افسانے پڑھتا تھا اور آستین چڑھا کر پڑھتا تھا۔ اس نے میرے افسانے دیکھ کر کہا ”خواجہ تم نے جب بھی اپنی کتاب چھاپی، میں اس کا فلیپ لکھوں گا۔ تم بڑے ڈرپوک سے افسانے لکھتے ہو اور چونکہ وہ میرے مزاج کے الٹ ہوتے ہیں، اس لئے مجھے پسند بہت ہیں۔“

محمد حسن عسکری، احمد ندیم قاسمی، مولانا صلاح الدین اور مختار صدیقی میرے پسندیدہ رائٹر تھے اور ان سے ایک محتاط حد تک بے تکلف بھی ہو گیا تھا۔ زو بی میرا واحد بے تکلف دوست تھا اور اس نے لارنس باغ کے اوپن ایر تھیٹر میں اپنا سٹیڈیو بنالیا تھا۔ دن کا میرا زیادہ وقت اس سٹیڈیو میں گزرتا اور راتیں ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس اور مال روڈ کی مرگشت کے حوالے ہو جاتیں۔

اماں نے ایک مرتبہ پھر ہولے سے پوچھا ”تو اتنی رات گئے کہاں سے آتا ہے؟“ میں نے قیمہ مٹر لپٹے گرم روٹی کے لقمے کو ہاتھ میں روک کر کہا ”اماں میں ادیب بن رہا ہوں، دانشور بن رہا ہوں اور چونکہ ادیبوں اور دانشوروں کی راتیں عام طور پر گھروں سے باہر گزرتی ہیں اس لئے میں راتیں باہر گزارنے پر مجبور ہوں۔“

اماں نے حیران ہو کر پوچھا ”تو ادیب کیوں بننا چاہتا ہے؟“

میں نے کہا ”میں علم پھیلا نا چاہتا ہوں اور لوگوں کو عقل سکھانا چاہتا ہوں۔ میں کتابیں لکھوں گا۔ تصنیف و تالیف کروں گا۔“
 ”اور یہ جواتنی ساری کتابیں پہلے لکھی رکھی ہیں۔۔۔۔۔۔“ اماں نے پوچھا ”ان کا کیا بنے گا؟ ان کو کون پڑھے گا؟“ مجھے اپنی اماں کی سادہ لوحی پر ہنسی آ گئی اور میں یہ سن کر دنگ رہ گیا کہ میری اماں کو تصنیف و تالیف کے عمل سے بھی واقفیت نہیں ہے۔ میں نے ہنس کر کہا ”میری پیاری اماں! اب تک کی چھپی ہوئی کتابیں لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ میرے حساب سے اوسط درجے کی تحریریں ہیں اس لئے میں خود نئی کتابیں لکھ کر زمانے کے سامنے پیش کروں گا اور ان کے علم میں اضافہ کروں گا۔“
 اماں کو میری یہ بات ٹھیک سے سمجھ آ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ میری طرف کئے بغیر نئی روٹی بیلے ہوئے پوچھا ”تو اپنی کتابوں میں کیا پیش کرے گا؟“

میں نے تڑپ کر کہا ”میں سچ لکھوں گا ماں اور سچ کا پرچار کروں گا۔ لوگ سچ کہنے سے ڈرتے ہیں اور سچ سننے سے گھبراتے ہیں۔ میں انہیں سچ سناؤں گا اور سچ کی تلقین کروں گا۔“
 میری ماں فکر مند سی ہو گئی۔ اس نے بڑی دردمندی سے مجھے غور سے دیکھا اور کونیلوں پر پڑی ہوئی روٹی کی پروانہ کرتے ہوئے کہا ”اگر تو نے سچ بولنا ہی ہے تو اپنے بارے میں بولنا دوسرے لوگوں کی بابت سچ بول کر عذاب میں نہ ڈال دینا۔ ایسا فعل جھوٹ سے برا بھی ہوتا ہے۔“

مجھے اپنی اماں کی سادہ لوحی پر بہت ہنسی بھی آئی لیکن اس کے احترام کی وجہ سے میں ہنسا نہیں آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاتا رہا اور اس کے روٹی پکانے کی آواز سنتا رہا۔ میری ماں بے چاری یا تو کھانا پکا سکتی تھی یا گھر کے دوسرے کام کر سکتی تھی اس میں باریک باتوں کی سمجھ مطلق نہیں تھی!

اصل میں اماں دماغ کے بجائے دل کو سوچ کا مرکز سمجھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جو بھی بات ہو جو بھی سوچ یا تصویر کی جو بھی لہر پیدا ہوتی ہے وہ انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس لئے دل ہی عقل کا اور فکر کا منبع ہے۔ دماغ کو وہ سر کے اندر ستر کے طور پر خیال کرتی تھیں تاکہ اس پر مضبوطی سے پکڑی باندھی جاسکے یا برقعے کی ٹوپی فٹ کی جاسکے۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ نے جو تدبیر کا اور تفکر کا حکم دیا ہے تو دل کے تفکر اور تدبیر کے لئے دیا ہے کیونکہ دماغ سے تو ایسی باتیں سوچی ہی نہیں جاسکتیں جن کا تعلق روح سے اور اللہ کے احکام سے ہوتا ہے۔

مجھ سے بڑے بھائی اسحاق نے اور ہمارے سب سے بڑے بھائی جان نے اماں کے ساتھ اس معاملے پر تفصیل سے بحث کی اور انہیں ہر چند قائل کرنے کی کوشش کی کہ سوچنے اور غور کرنے کا کام صرف دماغ کرتا ہے اور انسان کی ساری یادیں اور یادداشتیں اس کے دماغ میں محفوظ ہوتی ہیں جن کے کارڈ نکال نکال کر وہ نئے تجربات اور نئے مشاہدات کے ساتھ ملاتا ہے اور ان میں اصلاح و تطبیق کرتا رہتا ہے۔ لیکن اماں جو کبھی بھی ایسے مباحث میں دخل نہیں دیا کرتی تھیں اپنی پراڑی رہیں اور دل ہی کو فکر اور خیال کا ہیڈ کوارٹر سمجھتی رہیں۔ بلکہ اس گفتگو میں انہوں نے ایک اور عجیب بات کی جس پر ہم دل کھول کر ہنسنے اور ”اماں پیاری زندہ باد“ اور ”اماں اماں ہپ ہپ ہرے“ کے

نعرے مارتے رہے۔

میری بڑی خالہ جو مزاروں مجاوروں اور دھمالوں قوالوں کی رسیا تھیں، ایک مرتبہ ماں کو اپنے پسندیدہ قوال عظیم پریم راگی کا گانا سنوانے لے گئیں۔ اماں عظیم پریم راگی کی شکل و صورت، اس کے بھیس لباس اور پوشش پیرہن سے اتنی متاثر ہوئیں کہ دیر تک بت بنی فن کی اور فنکار کی بولتی فلم اپنے قلب و نظر پر اتارتی رہیں۔ جب لوٹ کے گھر آئیں اور ہم نے ان سے ان کے نئے تجربے کی بابت پوچھا تو انہوں نے کوئی شافی جواب نہ دیا، بس غموں غاں سا کر کے رہ گئیں۔ لیکن جس روز اسحاق بھائی اور آفتاب بھائی جان نے ان سے دل اور دماغ کے بنیادی فرق پر سیر حاصل گفتگو کی تو انہوں نے اپنے مشاہداتی علم پر پوری ٹیک لگا کر بڑے یقین کے ساتھ کہا ”آفتاب میاں! یادداشت خالی دماغ میں ہی نہیں ہوتی بلکہ بدن کے ہر اس انگ میں ہوتی ہے جو کسی خاص فعل کی مسلسل پرورش کرتا ہے اور اس فعل کو محبوب جانتا ہے۔“ بھائی جان نے بڑی حیرانی کے ساتھ عینک کے پیچھے اپنی روشن روشن آنکھیں گھما کر اسحاق بھائی کو دیکھا کہا ”اماں یہ آپ نے کیا بات کر دی۔ اسے ایک مرتبہ پھر تو دہرائیں۔ آپ سے تو ایک بڑا خیال سرزد ہو گیا ہے۔“

اماں نے شرمندگی کے ساتھ ہولے سے نفی میں اپنا سر ہلایا تو اسحاق بھائی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا ”بتائیں بتائیں اماں، گھبرائیں نہیں۔ آپ کے دل میں یہ خیال کیسے آیا؟“ اماں نے حوصلہ پا کر کہا ”جب عظیم پریم راگی باجہ بجا رہا تھا تو اس کی انگلیاں کالے اور سفید سروں پر جگہ دیکھے بغیر، ر کے بغیر اور صحیح چابی کو پہچانے بغیر بجلی سی تیزی کے ساتھ چل رہی تھیں۔ ان ساری سروں کی یادداشت ان کی مہارنی، ان کا حافظہ راگی کی انگلیوں میں تھا، اس کے دماغ میں نہیں تھا۔ اور جب عظیم پریم راگی گارہا تھا اور تان پلٹے لے رہا تھا تو سارا گیت اور اس کے سارے بول اس کے حلق کے حافظہ سے برآمد ہو رہے تھے اس کے دماغ سے نہیں۔“ ہم نے اس وقت تو تالی بجا کر اور ”تھری چیز زفار ما“ کر کے اماں کو ان کی تحقیق پر شرمندہ کر دیا لیکن آج میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس وقت مغربی ممالک میں میموری کے ڈسپلن پر جو ریسرچ ہو رہی ہے، اگر کسی نے یہی بات سلیقے کے ساتھ کسی ولایتی زبان میں کھول کر بیان کر دی تو سائنسی دنیا میں ایک نمایاں تبدیلی آ جائے گی۔

ان ساری باتوں کے باوجود میری اماں میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی کہ اس پر باقاعدہ ایک مضمون لکھا جاسکے یا اس کو دنیا کی ان ماؤں کے مقابلے میں کھڑا کیا جاسکے جنہوں نے اپنی زندگیوں میں عظیم کارنامے سرانجام دیئے اور اپنی زندگیاں انسانیت کو عظمت عطا کرنے کے کئے وقف کر دیں۔۔۔۔۔ میری ماں تو ان عورتوں میں سے تھی جو گاڑی کی جھڑکی سے ڈر کر سامنے کے لبا ب ڈبے میں گھس جایا کرتی ہیں اور زندگی کے کپار ٹمنٹ میں مناسب جگہ نہ پا کر گاڑی کے فرش پر ہی بیٹھ جایا کرتی ہیں، وہ بھی ایسی جگہ پر جہاں غسل خانے میں جانے والی ہر بی بی کے لئے انہیں بار بار اٹھنا پڑتا ہے اور اس وقت تک کھڑے رہنا پڑتا ہے جب تک بی بی واپس آ کر اپنی سیٹ پر نہ بیٹھ جائے۔۔۔۔۔ میری ماں تو ان عورتوں میں سے تھی جن کو اگر رنگ ریز ڈانٹ کر کہے ”بی بی یہی رنگ پیلا کپاہی ہے“ تو وہ ڈر کے مارے اپنے پلو سے پیسے کھول کر فوراً اسے دے دیتی ہیں اور یہ نہیں پوچھ سکتیں کہ ”بھائی اگر یہ پیلا کپاہی ہے تو پھر اس کا رنگ جو گیا کیوں ہے!“ اب میں کیا کہوں اور کیا لکھوں اور کیسے بتاؤں کہ میری اماں ان عورتوں میں سے تھی جو دن بھر گھاس کھو کر شام کو گولمنڈی میں کسی اہلکار کی

ڈانٹ سہ کر اور اپنا سارا پولہ اسے سے کر خالی ہاتھ گھر واپس آ جایا کرتی ہیں اور پھر خالی ہاتھ گھر آنے پر گھر والوں کے طعنے لہنے بھی برداشت کرتی ہیں۔ میری ماں تو ان عورتوں میں سی تھی جو گھر سے ملکہ بننے کے لئے نکلتی ہیں اور رسم تاج پوشی ادا ہو چکنے کے بعد اپنے محل میں ٹاکی مارتی ہوئی عورت کے ہاتھ سے ٹاکی لے کر خود بھی اس کے ساتھ شامل ہو جایا کرتی ہیں۔ اب ایسی عورتوں پر تو ماضی میں کبھی مضمون لکھے گئے اور نہ آئندہ لکھے جانے کی توقع ہے۔ ایسی عورتیں تو ہوا کے جھونکے کی طرح ہوتی ہیں کہ اس کے لمس سے ٹھنڈک کا احساس تو ہوتا ہے مگر خود کہیں نظر نہیں آتا!

میری ماں جو اپنے چچاؤں کی بے حد لاڈلی بھتیجی اور اپنے خاندان کی پہلوٹھی کی اولاد ہونے کے رشتے سب کی آنکھوں کا تارا تھیں، بہ اختیار خود اور حسب دل خواہ اپنی برتری کو ستے داموں بیچ کر ان جھاڑو ٹوکے والیوں کے گروہ میں شامل ہو گئی تھیں جن کا اول و آخر ظاہر و باطن، بلحاظ مادی، رنج و غم اور سود زیاں صرفان کے بچے ہوتے ہیں۔ اگر میری ماں کے بچے نہ ہوتے تو وہ خود بھی نہ ہوتیں۔۔۔ ادھر کارخ کبھی بھی نہ کرتیں اور زندگی کے ان طول بلد سے تعلق ہی نہ رکھتیں۔ وہ اپنے بچوں کی تخلیق اور انہی کا حوالہ تھیں۔ ان کا صرف ایک ہی فریم ورک تھا: اور ان کے بچوں کا ایک ہی مقصد تھا: خدمت، حضوری، سروس اور بندگی کی طلب گاری۔ جس طرح ہر سمجھ دار بچہ اپنی ماں کو اپنی بچہ شدگی کا تحفہ اور تسلی دے کر اسی سے فل سروس لیتا ہے اس طرح ہم سب بہن بھائی اپنے ”اولاد اپنے“ کا لیٹر آف کریڈٹ کھول کر ماں سے ہر شے درآمد کر لیتے تھے، وہ خوشی سے اپنا سب کچھ سپلائی کئے جارہی تھیں، اپنا سب کچھ نچھاؤڑ کئے جاتی تھیں اور ہم دونوں ہاتھوں سے ہر شے ہنسی خوشی سمیٹنے جارہے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں میرے بڑے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں تو میری ماں دادی بن جانے کے بعد اپنے بیٹوں پوتوں، نواسے نواسیوں اور بہوؤں کے درمیان کافی مقبول ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ بے تکلفی کے مظاہرے کر لیتے تھے اور وہ بھی اکثر اوقات بلا جھجک ہماری باتوں کے جواب دے دیا کرتی تھیں۔ لیکن انہی ایام میں بد قسمتی سے ایک موقع ایسا بھی آیا جب اماں ہم سب کی زندگیوں سے مکمل طور پر خارج ہو گئیں۔ ہم نے ان کے احترام میں کوئی کمی واقع نہ ہونے دی البتہ ان کے ذہنی طور پر ماؤف ہو جانے کی وجہ سے ان سے بصداد بقطع تعلقی کر لی اور درگزر کرنے والے ایک نئے صوفی کی طرح ان سے تھوڑا بہت رابطہ ضرور رکھا لیکن اس رابطے میں پسرانہ بے تکلفی کو کوئی جگہ نہ دی۔

جس طرح گین نے رومن ایمپائر کے زوال کے اسباب بڑی وضاحت سے بیان کئے ہیں اور سلطنت مغلیہ کے زوال جادونا تھ سرکار نے روشنی ڈالی ہے اسی طرح اپنی ماں کے زوال پر میری بھی نظر ہے۔ اس کے زوال کی بہت سی وجوہات نہیں ہیں بلکہ سارے زوال کا ایک ہی باعث ہے۔ اس ایک باعث نے ہماری ماں کو جیتے جی ہم سے علیحدہ کر دیا اور ہم نے اختیاری طور پر اس سے اجتناب برتنا شروع کر دیا ہم ان کے ادب اور احترام میں کسی کمی کے روادار نہیں تھے لیکن ساتھ ساتھ ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ ہمارے بچوں پر ہماری آئندہ نسلوں پر ان کی سوچ کا، ان کے رویے کا اور ان کی وضع کا کوئی اثر نہ پڑ جائے۔ ہمیں ڈر لگنے لگا تھا کہ اماں کے طرز فکر کی چھائیں ہماری اولاد پر ضرور پڑیں گی اور وہ اپنی ناروا تاثیر سے ہمارے بچوں کو رجعت پسندی کی طرف ضرور مائل کر دیں گی۔ اس خوف کے پیش نظر ہم

سب نے اپنے روابط ان سے قریباً قریباً ختم کر لئے اور ان کو آسودگی کو ساتھ اکیلے زندگی بسر کرنے پر مائل کر دیا۔

اس سارے سانحے میں ہم دونوں پارٹیوں کا کوئی قصور نہیں۔۔۔۔۔ نہ ماں کا نہ ہمارا۔ نہ ہی ہماری وجہ سے یہ واقعہ ظہور پزیر ہوا۔

یہ بھی امریکہ کا ایک شاخسانہ تھا۔ ہمارا سارا گھر بیٹھے بٹھائے اس کی لپیٹ میں آ گیا اور اس نے ہمارے اور ہماری ماں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی۔

ہوایہ کہ ایک دن پشاور کے بڈا بیر ہوائی اڈے سے ایک امریکی یوٹو طیارہ اونچی پرواز پر اڑا اور اس نے روس کی سرحدوں میں داخل ہو کر فوجی ٹھکانوں کے بہت ہی حساس قسم کے فوٹو اتار لئے۔ روس کے ریڈ واروں نے چیخ چیخ کر یہ خبر روسی کنٹرول روموں میں نشر کی لیکن جب تک روس کے مدفعی لڑاکا طیارے اپنی فضاؤں میں بلند ہوئے امریکی یوٹو جہاز اپنی کاروائی مکمل کر کے واپس پشاور پہنچ گیا تھا اور تیز نظر کیمروں سے اتاری ہوئی تصویریں پر اس ہونے کے لئے لیبارٹری بھیجی جا چکی تھیں۔۔۔۔۔ روس نے اپنے سارے ریڈ یوٹیشنوں کے دہانے کھول کر پوری دنیا میں یہ بات الم نشرح کر دی کہ چونکہ یہ جہاز پشاور کے امریکی اڈے سے اڑا رہا تھا اس لئے ہم نے اپنے ہر نقشے میں پشاور کے گرد ایک سرخ دائرہ ڈال دیا ہے اور اپنے ہوا بازوں کو اس شہر کے طول بلد اور عرض بلد کی جزئیات فراہم کر کے حکم دے دیا ہے کہ اب شہر پشاور کو دنیا کے نقشے سے اور کرہ ارض کے سینے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے۔ اس شہر کو تباہ کرنے کی تاریخ اور وقت سے ہم جلدی ہی دنیا کو آگاہ کر دیں گے۔

جب روس کا یہ اعلان دنیا کے اخباروں میں چھپا تو ہم سب کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ روس ایسا ملک نہیں تھا جسے پاؤں پڑ کر منایا جاسکے اور معافی مانگی جاسکے۔ پھر ہم سے غلطی بھی اتنے بڑے سٹیفنڈرڈ کی ہوئی تھی کہ اگر روس کی جگہ کوئی اور ملک ہوتا تو ہمیں کوشش کے باوجود معاف نہ کر سکتا۔

آکاش وانی نے اس خبر کو نون مرچ لگا کر دنیا کی تقریباً ہر زبان میں نشر کرنا شروع کر دیا۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد بھارت کے دانشوروں کا ایک پینل اپنے ریڈیو پر جمع ہوتا اور اس واقعے کے آئندہ اثرات سے دنیا کو مطلع کرتا۔ پاکستان میں بھی اس حماقت پر شدت کا رد عمل ہوا اور لوگوں نے بیک آواز پشاور سے امریکی اڈے اٹھانے اور امریکی بیس کو بند کرانے کے لئے احتجاج شروع کر دیا۔

اس وقت پاکستان میں شاید ہی گھر ہو جس میں اس خبر کا اور بعد ازاں اس واقعے کے متوقع رد عمل کا ذکر نہ چلتا ہو۔ اور لوگوں کی طرح اس معاملے میں ہمارا گھر انہ بھی بہت پریشان تھا۔ ہم سب بہن بھائی خوف اور رنج و غم کی اندھی غار میں اتر کر اپنی حکومت کا سپا پکایا کرتے اور اپنے سربراہوں پر لعنت بھیجا کرتے۔ بھائی جان کو اپنے جسور و غیور پٹھانوں کے مرکزی شہر کا آن واحد میں مٹ جانا تاریخ کا سب بڑا المیہ نظر آتا تھا۔ میرا تایا زاد بھائی مجید خان جو میرے بچپن کا یار تھا، حال ہی میں صوبہ سرحد کے محکمہ جنگلات میں ایک آفیسر لگا تھا۔ اگلے مہینے اس کی شادی ہو رہی تھی۔ میری ماں نے اس کی دلہن کے لئے اعلیٰ درجے کے جوڑے تیار کرائے تھے۔ اباجی نے اس کی شادی کے اخراجات کا ایک بنک ڈرافٹ بنوا کر اسے بھجوا دیا تھا لیکن اب دیکھتے دیکھتے سارا معاملہ الٹ گیا تھا۔ جب پشاور ہی ختم ہو رہا تھا تو بھائی مجید خان کی شادی کیسے ہو سکتی تھی۔ جب ان کا اور ان کی دلہن کا وجود ہی ختم ہو رہا تھا تو پھر جوڑے سلوانے اور ڈرافٹ بھجوانے کا فائدہ! میری

بڑی آپا کو پشاور کے تباہ ہونے کا سب سے زیادہ رنج تھا۔ وہ باڑے سے ہر سال چھ بڑے (Pears) سوپ اور تین (Stillman's) کریم کی ڈبیاں منگوا کرتی تھیں۔ یہ سامان چونکہ چچا عبدالغنی خان کی معرفت پشاور سے آتا تھا اور اب پشاور کے گرد سرخ نشان لگ چکا تھا اس لئے آپا کی سپلائی بھی بند ہو گئی تھی۔

اتوار کے روز، چھٹی کے دن جب ہم سب بہن بھائی اپنی حکومت، اپنے ملک اور اپنے بڑوں پر مجموعی تبرائج رہے تھے اور پشاور کے ختم ہو جانے پر پیشگی مرعے پڑھ رہے تھے تو اماں کو یہ بات بہت ہی بری معلوم ہوئی۔ اس نے عین ہمارے سامنے، یقین کی صورت .. استادہ ہو کر، پہلی مرتبہ سخت لہجے میں کہا ”یہ تم کیا ہر وقت پشاور کے بارے میں منحوس باتیں کرتے رہتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔۔۔“ تو افتخار بھائی نے فضا میں کھلے ہاتھ کی کی ڈگڈگی بجا کر کہا ”بگد و بول گیا ہے اماں۔ اب روس پنجابے آوے گا تے سستی کنک و کاوے گا۔“ اماں نے غصے میں آ کر کہا ”لعنت ہو تم پر اور تمہارے روس پر۔۔۔ اور ساری دنیا کے کافروں پر۔“

”خبردار اماں“ افتخار بھائی پھر گئے ”اگر تم نے روس کے خلاف کچھ کہا تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ بڑی آپا نے افتخار بھائی کے لہجے پر ان کی سرزنش کی ماورہ سب نے آپا کا ساتھ دیا۔ بھائی جان نے اماں کو سمجھایا کہ ”اماں روس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ وہ جب چاہے کسی بھی ملک پر بمباری کر کے اسے تباہ کر سکتا ہے۔ پاکستان تو اس کے لئے ایک معمولی سی بستی ہے۔“

بڑی آپا نے کہا ”اماں جی روس نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ پشاور کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”وہ اس پر بمبارڈمنٹ کرے گا“ اقبال بھائی نے کہا ”اور اسے سطح زمین کے ساتھ ملا دے گا۔“

”روس کو بمبارڈمنٹ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں“ اسحاق بھائی نے بتایا ”روس تو گھر بیٹھے بیٹھے جس شہر کو چاہے، تاخت و تاراج کر سکتا ہے۔ اس کے پاس سائنس کی ایسی کلامنتر ہے کہ وہ ہوائی جہاز بھی بغیر جس وکٹ کو چاہے، اس کی کلی اڑا سکتا ہے۔“

چھوٹی آپا نے ڈر کر کہا ”اگر پشاور کے ساتھ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو کل لاہور کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔“

اقبال بھائی نے بڑی رنجوری میں سر ہلا کر کہا ”افسوس! ابھی کل کی بات ہے پشاور سے کیا اعلیٰ درجے کا خشک میوہ آیا کرتا تھا، اور اب کچھ بھی نہیں۔“

اماں کو غصہ آ گیا۔ اس نے چار پائی کے پائے پر اپنا پاؤں جما کر کہا ”میرے ڈرپوک اور خوف زدہ بچو تم کو کیا ہو گیا ہے اور تم کن اونچائیوں سے کیسی گھاٹیوں میں اتر گئے ہو کہ تم کو اللہ پر کوئی یقین ہی نہیں رہا۔“

”اللہ پر تو ہمیں پورا یقین ہے اماں“ آپا نے گرہ لگائی ”لیکن ہم سامنے کی صورت حال پر آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ہمیں اللہ نے سوچنے سمجھنے کی بھی صلاحیت دی ہے۔“

اماں نے کڑک کر کہا ”یہ تم کب سے صورت حالات کے نجومی بن گئے ہو جو گھر بیٹھے مستقبل کے فتوے جاری کر رہے ہو۔۔۔۔۔ کیا پتہ کل کو پشاوِ تورہ جائے مگر تمہارا روس باقی نہ رہے اور کسی بمباری کے بغیر ہی ختم ہو جائے!“

اماں کا یہ کہنا تھا کہ ہم بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان کے پیچھے پڑ گئے۔ جس کے منہ میں جو آیا اس نے کہا اور بغیر کسی لحاظ کے ادب

کی ساری حدوں کو کراس کر کے کہا۔ آفتاب بھائی جنہوں نے اماں ک سامنے کبھی اونچی سانس تک نہیں لی تھی، انہوں نے بھی زچ ہو کر کہا ”اماں جس بات کا علم نہ ہو اس میں یکڑ نہ مارا کریں۔“

یہ دن اماں کی سلطنت میں ان کے زوال کا پہلا دن تھا اور یہ فقرہ کہ ”کیا پتہ پشاو رہ جائے اور روس نہ رہے“ ان کے تنزل اور انحطاط کا پہلا اور آخری سبب تھا۔

میں اباجی کے ساتھ والے کمرے میں کوئی پرانی سرخ تلاش کر رہا تھا اور کسی کو علم نہ تھا کہ میں اس ساتھ والی کوٹھری میں ہوں کہ میری اماں کی پیشی ہوگئی۔ جو بیان حلفی انہوں نے اپنے خاوند کے روبرو دیا، میں اس کا سمعی شاہد ہوں۔

اباجی نے پوچھا ”کیا یہ بات سچ ہے سردار بیگم کہ تو نے بچوں سے یہ کہا کہ کیا پتہ پشاو رہ جائے اور روس نہ رہے؟“

اماں نے کہا ”جی ڈاکٹر صاحب یہ سچ ہے۔ میں نے بالکل یہ کہا۔“

”تم کو کیسے معلوم ہوا۔۔۔“ اباجی نے قدر تلخ آواز میں پوچھا ”کہ روس جیسا عظیم الشان طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک جاسکتا ہے اور پشاو جیسا کم زور، پس ماندہ اور رجعت پسند شہر رہ سکتا ہے؟“

”میں نے یقین سے تو نہیں کہا ڈاکٹر صاحب!“ اماں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا ”لیکن اللہ کی نزدیک کیا مشکل ہے۔ وہ کچھ

بھی کر سکتا ہے۔“

اباجی نے قدرے غصے میں آ کر تھوڑی سی گرج دار آواز میں کہا ”اللہ ہمارے تمہارے جیسا بے اصولا نہیں۔ اس کے کچھ اصول ہیں، ضابطے ہیں، دستور ہیں اور وہ ان کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس کا ایک سسٹم ہے اور وہ اپنے سسٹم سے باہر نہیں جاتا۔ وہ اپنے اصول پر اور اپنے سسٹم پر ہر گھڑی قائم رہتا ہے۔“

اماں کافی دیر تک خاموش بیٹھی رہیں، پھر جرات کر کے بولیں ”میں تو یہی سمجھتی ہوں ڈاکٹر صاحب کہ اللہ قادر مطلق ہے اور وہ جو

چاہے کر سکتا ہے۔“

اباجی نے انہیں سمجھانے کے انداز میں قدر نرمی کے ساتھ کہا ”دیکھو سردار بیگم! جب تک اللہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جائے گی، اس کے لئے تدبیر اور تفکر نہیں کیا جائے گا، اس کے لئے فہم پیدا نہیں کی جائے گی اس وقت تک ایسی ہی فرسودہ اور روایتی سوچ چلتی رہے گی جیسی تمہاری ہے۔“

اماں نے کہا ”ڈاکٹر صاحب کا اگر اللہ کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے اور اسے صرف مانا جائے تو وہ جلدی میں آ جاتا ہے بلکہ۔۔۔“

اماں کی یہ بات اباجی کو ناگوار گزری اور انہوں نے دو ٹوک فیصلہ سناتے ہوئے کہا ”دیکھو سردار بیگم! اس گھر میں ایک ہی حکم چلے گا اور ایک ہی فیصلہ صادر ہوگا کہ آپ کو بچوں سے معافی مانگنی پڑے گی اور اپنے الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔“

اماں نے ہنس کر کہا ”ڈاکٹر صاحب! میں تو انسانوں کی صف کا سب سے کمزور اور بودہ شخص ہوں اور مجھے اپنی بات منوانے کی کوئی ضد نہیں ہے۔ یہ بچے تو میرے اپنے ہیں، میں تو سارے جہاں کے بچوں سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں لیکن مجھ سے اپنے الفاظ واپس

نہیں لئے جاسکیں گے۔“

”تو پھر اس گھر میں آپ کا رہنا مشکل ہوگا!“ اباجی نے سنجیدگی سے کہا اور اماں ان کی بات کا جواب دیئے بغیر باہر آ گئیں۔

اماں نے اپنے بچوں کی خاطر اپنے گھر کی خوشیوں کے لئے اور اپنی اولاد کے کارن سب سے معافی مانگ لی۔ نہ صرف اپنے کہے ہوئے الفاظ واپس لئے بلکہ کبھی نہ کہے اور کبھی نہ سوچے ہوئے الفاظ بھی واپس لے لئے۔ ہم نے بھی ان کو معذور اور کم علم جان کر تہہ دل سے معاف کر دیا۔ اماں ذہین تو بہت تھیں لیکن ان میں تعلیم کی کمی تھی۔ انہوں نے پڑھائی شروع تو کی لیکن اسے پوری نہ کر سکیں۔ پھر اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم کے باقاعدہ مدرسے بھی نہیں تھے اور لڑکیوں کو تعلیم دینا یوں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر اماں ہماری طرح سے تعلیم یافتہ ہوتیں اور ان کی حالات حاضرہ پر باقاعدہ نظر ہوتی تو وہ ایسا فقرہ کبھی نہ کہتیں جو ان کے زوال کا باعث بنا اور جس نے ان کو ہماری زندگیوں سے بہت دور ہی کر دیا۔

اس واقعے کے دس بارہ سال بعد تک اماں زندہ رہیں، لیکن اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی آڑ میں۔ انہوں نے جیتے جی اپنے وجود سے اور اپنی ہویت سے پورے طور پر کنارہ کشی کر لی تھی۔ گھر میں ان کا ہونا اور نہ ہونا برابر سا تھا۔ کبھی کسی کو ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ ہوتی بھی تو وہ ہونے نہیں دیتی تھیں۔ کسی پر اماں کا بدنی، روحی، شخصی یا نفسی کسی بھی قسم کا بوجھ باقی نہیں رہا تھا۔ اور جس دن وہ گئی ہیں تو اس روز بھی کسی کو اطلاع دیئے بغیر رخصت ہو گئیں۔

ملازمہ نے صبح جا کر جب انہیں جگایا کہ آئیں آکر چائے پی لیں تو وہ اس کے آنے سے پہلے ہی جا چکی تھیں۔

اماں کوہ سب بھائیوں نے اشک بار آنکھوں سے میانی صاحب کی اس سائیڈ پر دفن کیا جدھر آگے علم الدین شہید کا مزار ہے۔ ان کی قبر سے تھوڑی دور پر بے پیری کا ایک پرانا درخت ہے۔ قریب ہی ایک طرف لوکوشیڈ کے مستری علی محمد کا مزار ہے اور اس کے ساتھ ہاجرہ بی بی کی قبر ہے جس کے لوح مزار پر اس کے تینوں بیٹوں نے اپنے نام بھی لکھوائے ہیں: والدہ شفیع، والدہ چراغ اور والدہ شمس۔ یہیں ہم نے اپنی بیماری اماں کو دفن کر کے ان پر پھولوں کی پانچ چادریں اوپر تلے چڑھائیں۔ شام کے وقت ہم خواتین خانہ کو ان کی قبر دکھانے لے گئے۔ میری دونوں آپائیں، دونوں خالائیں، باجی ضیا، باجی منیر اور میری اور سب سے چھوٹی بھابی منزہ کے قافلے میں اماں جیو، ماسی بھجیاں، جیونی بہن اور آنٹی صفری بھی شامل تھیں سب نے وہاں جا کر فاتحہ پڑھی اور اپنے اپنے انداز میں اماں کو بہت یاد کیا۔ بڑی آپا کو ان کی آخری آرام گاہ بہت ہی پسند آئی۔ ملازم خواتین نے بیری کی قربت کو نہایت پاکیزہ خیال کیا اور چھٹی آپا نے کہا چونکہ ہم شریعت کے مطابق اپنی ماں کی قبر کچی رکھیں گے اس لئے ساتھ کی قبروں کے کتبے ہمارے لئے پکی نشانیوں کا کام دیتے رہیں گے۔ میری چھوٹی خالہ رشیدہ اپنی بہن کو یاد کر کے بہت رورہی تھیں۔ انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔

کوئی ایک سال بعد جب ہم شب برات پر پھول چڑھانے اور فاتحہ کہنے گئے تو پھولوں کی ٹوکری، گلاب کی بوتل اور اگر بتیوں کے پیکٹ ہمارے ہاتھ میں ویسے کے ویسے رہ گئے۔ وہاں اماں کی قبر ہی موجود نہ تھی! ہم نے ادھر ادھر اسے لاکھ ڈھونڈا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بیری کے حوالے سے اور کتبوں والی قبروں کے فاصلے ناپ کر ہم نے اماں کی قبر کے آثار معلوم کرنے کی کوشش کی مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

پرانی قبروں کے بلاک جوں کا توں موجود تھا۔ جہاں نشیب تھا وہاں نشیب تھا۔ نشیب کے اندر دو تین جھاڑیاں تھیں وہ اپنی جگہ موجود تھیں۔ ایک پرانی قبر کا تعویذ بیٹھ گیا تھا وہ اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے پیری اسی طرح جھکی ہوئی تھی اور اس کے دو ڈالے اور سوکھ گئے تھے۔ لیکن جہاں اماں کی قبر ہونی چاہئے تھی، مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔۔۔۔۔ بس خالی زمین تھی اتنی زمین کہ اس میں آسانی سے ایک قبر کھودی جاسکے۔ لیکن وہ قبر جو ہم یہاں چھوڑ گئے تھے وہ کہاں گئی!

فاروق نے کہا ”چچا جان یہ وہ جگہ ہی نہیں۔ دادی اماں کی قبر اس سے ذرا فاصلے پر تھی۔ رضانے کہا ”میں نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں لحد میں اتارا تھا تو اپنا تو لیہ اس پیری پر ٹانگ دیا تھا۔ ان کو یہاں ہونا چاہئے، عین اس جگہ۔ لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں۔“

منزہ ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی ”یہی تو ہے ان کی قبر۔ آپ کو یاد نہیں ہم نے شام کے وقت اس پر اگر بتیاں گاڑی تھیں تو ایک ایک بتی ان کی پڑوسی قبروں پر بھی گاڑ دی تھیں۔ یہ وہی قبریں ہیں صاف ان کی پڑوسی قبریں اور یہ ہے ساتھ اماں جی کی قبر!“

اقبال بھائی نے کہا ”اماں جی کی قبر پیری کی سیدھ میں دائیں ہاتھ تھی اور یہ قبریں بائیں ہاتھ ہیں۔ ان کا تو جغرافیہ ہی دوسرا ہے۔“

کافی دیر تک ہم اماں کی قبر تلاش کرتے رہے اور افسوس کرتے رہے کہ اگر ہم نے ایک معمولی سا کتبہ لگایا ہوتا تو یہ الجھن نہ ہوتی۔ اگر بتیاں اور عرق گلاب اسی طرح واپس لے کر اور پھولوں کی پیتیاں پانچ چھ دوسری قبروں پر ڈال کر ہم ناکام و نامراد واپس گھر آگئے۔

اگلے دن ہم نے بھائی شفیع اور ان کی معرفت منگوائے ہوئے پرانے گورکنوں کو ساتھ لے کر ایک سروے ٹیم تیار کی اور اس میں وہ مولوی صاحب بھی شامل کئے جنہوں نے مٹی دینے کے بعد وہاں قرآن خوانی کی تھی۔ سب کو اماں کے دفنانے کا وقت یاد تھا۔۔۔۔۔ دن مہینہ اور موسم یاد تھا۔۔۔۔۔ ان قبروں کا نقشہ یاد تھا جن کے ساتھ اماں کو دفنایا گیا تھا مگر اس وقت سارے کے سارے اماں کی قبر تلاش کرنے سے قاصر تھے۔ مولوی صاحب نے کہا ”میری عمر باسٹھ سال ہے اور میں سینکڑوں میتیں دفن چکا ہوں لیکن ایسا واقعہ میری زندگی میں پہلے کبھی نہیں آیا۔ یہ تو حد ہی ہوگئی۔“

اماں کی قبر کے بارے میں سب کا اپنا اپنا خیال اور اپنا اپنا گمان ہے لیکن یقین سے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے یا صحیح سوچ رہا ہے۔ لیکن میں جو کسی حد تک ان کے مزاج سے واقف اور ان کی نفسیات کا آشنا ہوں مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی قبر اٹھا کر کہیں اور لے گئی ہیں۔ اصل میں میری ماں کے زمانے کی عورت محبت کے میدان میں سب سے آگے ہوتی تھی اور جب انعام تقسیم ہونے کا وقت آتا تھا تو غائب غلہ ہو جاتی تھی۔ وہ خود نمائی اور خود ستائی کے فن سے نا آشنا تھی۔ اس کو کمٹ سجا کے پہنچیاں پہن کے اور سرمہ کا جل لگا کے مہمان خصوصی بننے کا ڈھنگ نہیں تھا۔ تعریف و توصیف کے موقعوں پر وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی اور ایسے اوہلے میں چھپ جاتی تھی کہ مدتوں اس کے کوئی آثار نہیں ملتے تھے۔ وہ اپنی ہر کارکردگی کے پیچھے اپنی لاموجودگی کا امپریشن برقرار رکھتی تھی اور غائب سے غائب تر ہوتی رہتی تھی۔ تخلیق کے چوکھٹے کے اندر کسی کارنر میں اپنا نام اور تاریخ نہیں لکھتی تھی۔ بس اس کا روپ پری کا سا تھا۔ باغ لگا کر پھول کھلا کر تخت بچھا کر راہ سجا کر خود غائب ہو جاتی تھی کہ کسی کو شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرنی پڑے۔ کسی کو تکلیف نہ ہوا، الجھن نہ ہوا، انتظار نہ کرنا

پڑے۔۔۔۔۔ اماں کو معلوم تھا کہ دن تہوار پر عید شبرات پر بچے کسی نہ کسی مجبوری کے تحت میری قبر پر ضرور آئیں گے اور پورے اترنے کی کوشش کریں گے۔ وہ مصروف لوگ ہیں۔ ان کی کئی بکھیڑے اور بے شمار مشغولے ہیں۔ آئیں گے تو تکلیف ہوگی۔ زحمت کریں گے۔ وقت نکالیں گے۔ انتظار کھینچیں گے۔ مشکل ہوگی۔ کیوں نہ ان کو آزاد کر دیا جائے۔ چنانچہ اماں نے ہم کو پہلے کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔

دنیا کے عظیم مصنفوں نے اور میرے ہم عصر ساتھیوں نے اپنی ماؤں پر ایسے پر لطف خیال انگیز اور گراں بہا مضمون لکھے ہیں کہ وہ کلاسیکی ادب کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ میری بھی بڑی دیر کی خواہش تھی کہ میں اپنی اماں کی زندگی کے بارے میں کچھ کہوں، کچھ لکھوں، کچھ بتاؤں۔ مگر میری والدہ میں میرے حساب سے ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس کی بدولت ان پر کوئی مضمون لکھا جاسکے یا ان کے سوانح حیات کا زبانی ذکر کیا جاسکے۔ وہ ایک عام سی سیدھی سادھی، گھر چوکھٹ کی بی بی تھیں جو زندگی کی پگڈنڈی پر سیدھے سبھاؤ چلتی چلتی ادھر سے ادھر پہنچ گئیں اور چلتے چلتے ساتھ ساتھ اپنے نقوش پا بھی مٹاتی گئیں۔ ایسے شخص پر کوئی کیا لکھے جو اپنے جانے کی بعد ذرا سا خلا بھی نہ چھوڑ سکے!

Virtual Home
for Real People

خود بدولت

دونوں بہنیں اور دونوں بھائی چپ چاپ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا کہ دوسرا کیا سوچ رہا ہے اور دوسرا وہی کچھ سوچ رہا تھا جو باقی تینوں نے ابھی سوچ کے چھوڑا تھا۔ رشیدہ نے کہا ”مجھے کل ہر صورت واپس جانا ہوگا کیونکہ کرنل صاحب کے موٹے کا آپریشن ہے اور اگر میں ان کے پاس نہ ہوں تو وہ گھبرا جاتے ہیں اور جوش سے اور خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔“ دونوں بھائیوں نے یک زبان ہو کر کہا ”ضرور آپا! ضرور۔۔۔۔۔ آپ کو ہر حال میں جانا چاہیے اور کرنل صاحب کی تسلی کرنی چاہیے۔“

محمود گدو بیراج سے آیا تھا اور ابھی اس کی ڈھیر ساری چھٹی باقی تھی، لیکن اس کی ڈھیر ساری چھٹی کا گھر والوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں تھا کہ محمود بہت ہی کم گواور کم امیر قسم کا انجینئر تھا۔ مسعود اسلامیہ کالج پشاور میں اکناکس کا اسٹنٹ پروفیسر تھا۔ اس کی چھٹی تو کم تھی لیکن وہ تازہ بیج کر اور چھٹی بھی لے سکتا تھا اور فون کر کے اپنے بیوی بچوں کو بھی یہاں بلا سکتا تھا۔

میجر فرخندہ سی ایم ایچ میں گائنی کی ڈاکٹر تھیں۔ اپنے اباجی کی عاشق اپنے اباجی کی برتری کا چلتا پھرتا اشتہار اور اپنے اباجی کا قیمتی ووٹ! جب سے اباجی کے ذہن اور بدن کا رشتہ کمزور ہوا تھا، وہ بھی چھٹی لے کر اباجی بختیار خاں کے پاس آکر ان کی تیمارداری میں مصروف ہو گئی تھیں۔ جب کبھی میجر فرخندہ پر طویل مایوسی کا دورہ پڑتا تو اباجی بختیار خاں ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا کر اس کی کمر پر تھپکی دے کر اونچی آواز میں کہتے ”چن اپ میجر۔ چن اپ۔۔۔۔۔ ایسی صورت ہم کو پسند نہیں ہے۔“ اور میجر غمناک ہو کر چن اپ کر لیتی۔

اباجی بختیار خاں نے اپنی زندگی خود بنائی تھی اور بغیر نقشہ پاس کروائے بنائی تھی۔ اس میں کچھ تجاوزات بھی آگئی تھیں جن میں کچھ تو سرکاری تھیں اور کچھ دوسرے لوگوں کی ملکیت گھیر گئی تھیں۔ خاں صاحب نے کسی کی پرواہ کئے بغیر اپنے زور عمل سے اپنی زندگی کو بنایا تھا اور خوب بنایا تھا۔ وہ ایک معمولی آدمی سے ری رولنگ مل کے مالک بن گئے تھے اور ان کے کارخانے میں چوبیس گھنٹے کی شفٹ میں باسٹھ آدمی کام کرتے تھے۔ ایک نائب تحصیل دار کا اتنے بڑے مرتبے پر پہنچنا ان کے ذہن اور بدن کی اعلیٰ درجہ کی سکرونا زیشن سے عمل میں آیا تھا اور اس عمل میں بہت سے بے عمل لوگ ان کی پلاننگ کی بھٹی میں بھسم ہو گئے تھے۔ بختیار خاں پلاننگ کے بادشاہ تھے اور اگر وہ صنعت کاری کے میدان میں نہ اترے ہوتے تو واقعی کسی ملک کے بادشاہ ہوتے۔ اگر بادشاہ کا الفاظ ممنوع الاختیار ہوتا تو بختیار خاں حکمران ضرور

ہوتے۔ ان کی ایک حکومت ہوتی۔ ایک محل ہوتا۔ نورتن ہوتے۔ سفارت خانوں کا ایک شہر ہوتا۔ ذاتی ہوائی جہاز، ہیلی کوپٹر اور ذاتی ہیلی پیڈ ہوتے اور دوسری راجدھانیوں اور راجاؤں سے ان کے بہترین تعلقات ہوتے، یعنی وہ کچھ بھی کہلاتے، ان کی ایک رعایا ضرور ہوتی اور وہ اپنی رعایا کو کسی بھی نام سے پکارتے، رعایا ان کی حکمرانی کی تصدیق کرتی۔ وہ ایک باعمل، باہمت اور باکردار آدمی تھے۔ ان کی ساری زندگی محنت و مشقت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی اور اس کے انگ پر بد معاشی، جنسی بے راہروی یا بد مستی کا کوئی چھینٹا تک نہ تھا۔

بختیار خاں نے نیم وا آنکھوں سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو دیکھا۔ پھر پتلیاں گھما کر گلو کوڑ کی بوتل پر نظر ڈالی اور اندر ٹیوب میں گرتے ہوئے قطروں کا نظارہ کرنے کے بعد ذرا سا مسکرا کر کہا ”مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں۔ میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ۔۔۔۔۔۔“ میجر فرخندہ نے سنتھو سکوپ لگا کر ان کی ہارٹ بیٹ چیک کی اور پھر اپنی کرسی پر اسی طرح جا کر بیٹھ گئی۔

بختیار خاں نے کہا ”مولا صاحب تشریف نہیں لائے؟ مولانا ظفر علی خاں صاحب!“

مسعود نے کہا ”نہیں اباجی، آج تو تشریف نہیں لائے۔“

”کمال ہے!“ بختیار خاں نے آنکھیں بند کر کے کہا ”مجھ سے خود انہوں نے فون پر فرمایا تھا کہ تمہاری مزاج پرسی کو آؤں گا اور

تمہارے ساتھ چائے پیوں گا۔ تو اب چائے کا وقت تو ہو گیا ہے۔ کیوں رشیدہ؟“

رشیدہ نے کہا ”جی اباجی! چائے کا وقت ہو گیا ہے۔“

”تو پھر!“ بختیار نے ذہن پر بوجھ دیتے ہوئے کہ ”یا انگریز نے انہیں پھر گرفتار کر لیا ہو گا یا ایک آدھ دن ریست کرنے کی غرض

سے کرم آباد تشریف لے گئے ہوں۔“ مسعود بولا۔

”لیکن آپ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے خاموشی سے لیٹے رہیں اباجی۔“ ڈاکٹر فرخندہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”آپ کو

ریست کرنا چاہیے۔“

”ریست“ نے ہنس کر کہا ”ریست! ناں مری سوئی دھی۔ ریست تو میں نے ساری زندگی نہیں کیا۔ ریست کو تو میں انسان کا سب

سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔۔ گناہ کبیرہ۔۔۔۔۔۔ اور سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں لیکن بے عملی اور بے کاری اور بے کارکردگی کا گناہ

کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔ جس نے سڑگل، کوشش، جدوجہد، کشمکش کو چھوڑ دیا وہ انسان نہیں، پتھر ہے۔۔۔۔۔۔ مٹی کا تو دانہ نہیں، ریت کا

ڈھیر ہے۔۔۔۔۔۔ پرسوں میری مہاتما بدھ سے بڑی بحث ہوئی۔ جین مندر کے سامنے پٹری پر جا رہے تھے۔ میں نے موٹر روک کر پکڑ لیا

اور ہاتھ تھام کر بڑے ادب سے کہا ”سر آپ نے بڑی زیادتی کی انسانیت کے ساتھ جو اس کو نرم دلی اور ترک خواہش کا درس دے

دیا۔“ شرمندہ سے ہو کر اپنا ہاتھ چھڑانے لگے اور مسکرا کر بولے ”کیا کریں بختیار خاں، ہم کو اسی بات کا حکم تھا۔“ میں نے کہا ”سر آپ نے

ایسا حکم کیوں مان لیا۔ آپ کو بحث کرنی چاہیے تھی، آرگيومنٹ دینی چاہیے تھی کہ کوشش اور جدوجہد کے بغیر انسان کس طرح زندہ رہے گا،

کس طرح آگے بڑھے گا، کس طرح نشوونما پائے گا۔“ کہنے لگے ”جس طرح دریا آگے بڑھتا ہے، پنچھی زندہ رہتا ہے، برگد نشوونما پاتا

ہے۔“ میں نے کہا ”سرا ایک تو آپ کو اس برگد کو پیڑ نے تباہ کر دیا جس کے نیچے جا کر آپ بے یار و مددگار بیٹھ گئے تھے اور سوکھ کر کاٹا ہو گئے تھے۔ اگر آپ نے ہمت کی ہوتی اور کوشش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ہوتا تو کپل دستو جیسی آپ کی کئی راجدھانیاں ہوتیں اور اس وقت دنیا کی تاریخ میں آپ کا نام زندہ ہوتا، لیکن آپ نے رہبانیت کی تعلیم دے کر اور ترک خواہش کا سبق سکھا کر لوگوں کو بھی بے عمل کیا اور خود بھی تنہائی اور گمنامی کی زندگی بسر کر کے اس جہاں سے چلے گئے۔ کوئی آپ کو جانتا ہی نہیں۔“

ڈاکٹر فرخندہ نے کہا ”اباجی! آپ سونے کی کوشش کریں۔ میں کھڑکیوں کے پردے کھینچے دیتی ہوں۔“

”پرانی سی بات ہے بیٹا!“ بختیار خاں نے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”جو سوتے ہیں وہ کھوتے ہیں جو جاگتے ہیں وہ پاتے ہیں۔ میں سونا نہیں چاہتا، جاگنا چاہتا ہوں۔ مجھے مرنے سے نفرت ہے اور مدہوشی سے بیر ہے۔ میں زندہ ہوں اور زندہ ہی رہوں گا انشاء اللہ۔۔۔۔۔ میں امر ہوں کیونکہ میں کوشش ہوں، محنت ہوں، جدوجہد ہوں۔“ پھر انہوں نے چونک کر پوچھا ”راجہ صاحب کا فون تو نہیں آیا تھا؟“

”کون سے راجہ صاحب اباجی؟“ پروفیسر مسعود نے پوچھا۔

”اپنے راجہ غنفر علی خاں صاحب۔۔۔۔۔ مجھ سے والٹن ائر پورٹ پر ملے تھے، لیکن وہ بھی جلدی میں تھے اور میں بھی تیزی میں تھا۔ ہاتھ ہلا کر فرمانے لگے۔۔۔۔۔ میں آپ کو فون کروں گا خاں صاحب۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہے، انہوں نے فون نہیں کیا۔ ویسے تم لوگ بھی اپنی اپنی غرض کے بندے ہو۔ شاید تم نے فون ریسو ہی نہ کیا ہو۔۔۔۔۔ ویسے میں نے مہاتما بدھ کو آج لا جواب کر دیا۔ شرمندہ سے اور کھسیانے سے کھڑے تھے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا۔ میں نے ان کا کندھا ہلا کر کہا سر! کوشش اور سعی مسلسل کے بغیر معاشرے میں زندگی کے آثار باقی نہیں رہتے۔ مقابلے کی فضا میں ہی قومیں آگے بڑھتی ہیں اور مقابلہ کر کے ہی انسانیت حیات ارضی میں آفتاب جہاں تاب بن کر دمکتا ہے۔ انہوں نے مسکرا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑی ملائمت سے کہا۔۔۔۔۔ خاں صاحب! انسان مقابلے کی دنیا میں انسان کے خلاف ہی نبرد آزما ہوتا ہے۔ دیوار، پتھر، کھجے، جنگل اور درخت سے مقابلہ نہیں کرتا۔ تیس چالیس انسانوں کو جب ایک کامیاب انسان پسپا کر کے پیچھے دھکیل کے اور زمین پر گرا کر آگے بڑھتا ہے تو پھر زمین پر گرے ہوئے ان تیس چالیس ذلتوں کے ماروں کا ہم کیا کریں۔ ان کا گھر کدھر سے بھریں۔ ان کی سہائتا کیسے کریں۔ ان کو زندہ کس طرح سے کریں۔ وہ بھی تو انسان ہیں، وہ بھی تو اس معاشرے کا حصہ ہیں، ان کو بھی تو زندہ رہنے کا حق ہے۔۔۔۔۔ میں نے کہا سر! میں تو آپ کو بڑا دوداں اور بدھی واں سمجھتا تھا لیکن آپ نے کیا کچی بات کر دی۔ آپ تو ہٹلر اور ہلا کو زیادہ صاحب عمل تھے۔ انہوں نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور آپ کی رہبانیت کے تصور کی جڑیں اکھاڑ کر رکھ دیں۔ ملکوں کی نئی سرحدیں قائم کیں اور شہروں کے اندر دیواریں کھنچوا دیں۔ آپ برگد کے درخت تلے آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے۔ کیا مل گیا اس سے دنیا کو اور آنے والی نسلوں کو۔ مہاتما بدھ میری باتیں سن کر چپ ہو گئے اور کندھا تھپتھا کر بولے۔۔۔۔۔ آپ کے لئے آپ کا دھرم اور ہمارے لئے ہمارا اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے، پھر ملاقات ہوگی تو اور باتیں ہوں گی۔ اس وقت مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر ارشد نہیں آئے آج؟“

”آئے تھے اباجی۔“ رشیدہ نے کہا ”صبح آپ کو ٹیکہ دے کر گئے تھے اور شام کو پھر آئیں گے شاید۔“

”مہا تہم بدھ جاتے جاتے کہنے لگے۔۔۔۔۔ خاں صاحب! مقابلہ بازی گھوڑوں پر تو سب جیتی ہے انسانوں پر نہیں۔“

یہ کہہ کر بختیار خاں طنزیہ ہنسی ہنسے اور گلو کوڑکی ڈرپ دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر بختیار خاں نے آنکھیں کھول کر سب کو باری باری دیکھا اور دھیمی آواز میں کہنے لگے ”پچھلے ہفتے وہ بڈھا فرانسیسی مجھے جی پی او کی سیٹریوں پر مل گیا۔ اس کی چوخانہ گول ٹوپي نے اس کا بالیاں کان بالکل چھپا رکھا تھا اور وہ اپنی پائپ میں پھونکیں مارتا ہوا سیٹرھیاں اتر رہا تھا۔ میں نے اس کا راستہ روک کر کہا، او آندرے ژید یہ تم نے کیا بکو اس کی کہ بڑے انسانوں کے عظیم کارناموں میں عقل کے مقابلے میں قسمت زیادہ کارفرما رہی ہے۔ اس نے اپنے کندھے سکڑ کر کہا۔۔۔۔۔۔ پار دوں موسیو مجھے اردو نہیں آتی۔ سوری۔۔۔ اور کنی کاٹ کرتیزی سے دوسری طرف نکل گیا۔ اچھا آج صبح بے پرکاش زرائن تو نہیں آئے تھے؟“

”نہیں باباجی۔“ میجر فرخندہ نے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

کم گو محمود نے بڑی آہستگی سے کہا ”میں بہت تھک گیا ہوں، ذرا کمر سیدھی کر کے واپس آتا ہوں۔“

’اوئے محمود!‘ بختیار خاں نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا ”تیرے جیسے لوگ جو ریشمی نائٹ سوٹ پہن کر سوتے ہیں، وہ صبح مشکل ہی سے اٹھ سکتے ہیں۔ اور جو صبح سویرے مشکل سے اٹھتے ہیں، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ جادف ہو جا۔“

محمود جو اپنی کرسی دے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا، دوسرے کمرے میں دفع ہو گیا اور بختیار خاں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رشیدہ نے میجر فرخندہ سے کہا ”مجھے اپنا سامان پیک کرنا ہے اس لئے تھوڑی دیر کے لئے میں اجازت چاہوں گی۔“

بختیار خاں نے آنکھیں کھولے بغیر انگلی اٹھا کر کہا ”خبردار۔۔۔۔۔ کوئی ضرورت نہیں سامان پیک کرنے کی۔ آرام سے بیٹھو۔“

رشیدہ جو اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی، چپ چاپ پھر بیٹھ گئی۔

مسعود نے کہا ”آپ جوس لیں گے ابا جی۔۔۔۔۔ اپیل جوس؟“

”نو، تھینک یو۔ مہربانی!“ بختیار خاں نے ہولے سے کہا ”میں کوئی بیمار ہوں جو اپیل جوس پیتا پھروں۔۔۔۔۔ شکریہ!“

میں نے فرخندہ اپنی جگہ سے اٹھی اور گربہ پائی کے ساتھ جا کر ڈرپ سٹینڈ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک تو اس نے گلو کوڑ کی الٹی لٹکی ہوئی بوتل کو دیکھا، پھر قطروں کی ٹپکاٹ کو ذرا سا اور تیز کر دیا۔ بختیار خاں نے ایک جھر جھری لے کر ریس کے گھوڑے کی طرح ناک کے نتھنے پھیلائے اور پھر کہنے لگے ”آج دوپہر میں نے ریڈیو سٹیشن فون کیا تھا لیکن مجھے وہ خبیث ملا نہیں۔ سٹیشن ڈائریکٹر کہنے لگا کہ وہ ہر روز یہاں نہیں آتے، ہفتے میں ایک بار آتے ہیں۔ میں نے جھڑک کر کہا اوئے تم سٹیشن ڈائریکٹر ہو کر اس کا پروگرام بند نہیں کر سکتے تو وہ گھگھیا کر کہنے لگا ہماری تو بہت کوشش ہے سر لیکن ہمارے Listeners اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ میں نے کہا لعنت ہو تم پر اور تمہارے

پھر تھوڑی دیر رک کر بختیار خاں بولے ”بڑا اندھیر ہے ڈاکٹر فرخندہ۔۔۔۔۔۔ یہ بد بخت ہمارے نوجوانوں کو ترقی کرنے سے

روک رہا ہے، کمپی ٹیشن سے نکال رہا ہے، دولت کے حصول سے منع کر رہا ہے، نوجوان کا اخلاق تباہ کر رہا ہے اور ہر ہفتے ریڈیو سے بکواس کر کے چلا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں میرٹ پر آنے والوں کو زندہ رہنے کا حق دو۔ انہوں نے محنت کی ہے، مشقت جھیلی ہے۔ بے میرٹ لوگوں کو اس معاشرے سے نکال دو، اس ملک سے دفع کر دو۔ وہ ہمارے ملک کا بوجھ اور ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔ کامیاب لوگ ہمارے وطن کی زینت اور معاشرے کا حسن ہیں۔ کامیابی ایسا خمیرہ مروارید ہے پروفیسر مسعود جس سے معاشرے کے ڈوبتے ہوئے دل کو تقویت ملتی ہے۔“

”اباجی! آپ سو جائیں۔“

”سو نہ سکیں تو تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جائیں۔“

[illegible]

رشیدہ نے دبی زبان میں کہا ”اباجی! خاںساں آپ کے رویے کی شکایت کر رہا تھا۔“

”کرے شکایت‘ شوق سے کرے۔“ اباجی! نے نفرت سے ناک سکوڑ کر کہا ”مجھے کیا پروہ ہے اس کی۔ میں اس کا نوکر ہوں؟ غلام ہوں؟ ایسپلائی ہوں؟ کوئی دیتا ہوں اس سے؟ کرے شکایت کھل کرے۔ اس کی شکایت سے ڈر کر میں حق اور سچ کا کہنا نہیں چھوڑوں گا۔

ٹروٹھ کے اعلان سے منہ نہیں موڑوں گ۔۔۔۔۔ اب تم لوگ خود ہی فیصلہ کرو کہ جب میں کامیاب ہوا اس زندگی میں اور ایک نام پیدا کیا، شہرت حاصل کی، دولت کمائی، کا خانے لگائے تو کیا میں نے تمہاری ماں کو چھوڑ دیا؟ کوئی نئی شادی کی؟ بد معاشی، کوئی گھمنڈ، کوئی طاقت کا ناجائز استعمال کیا؟ بتاؤ کیا؟۔۔۔۔۔ حالانکہ میں سب کچھ کر سکتا تھا، سب کچھ کروا سکتا تھا۔ اپنی ہر بات منوا سکتا تھا لیکن میں نے نہیں کیا کچھ، نہیں منوایا کچھ، نہیں تقاضا کیا کوئی۔۔۔۔۔ میں کوئی لمبے سفروں پر نہیں گیا ماسوائے اپنے ماہانہ بزنس ٹورز پر۔ میں نے کوئی گولیاں کھانا شروع نہیں کیں ماسوائے اپنی روزمرہ وٹامن کے، آئرن ڈوز کے، سودنگ پاؤڈر کے، نیند کی گولی کے اور اجابت صحیحہ کے لئے منرل آئل کے چمچے کے۔“ پھر انہوں نے سر تکلے سے ذرا اوپر اٹھا کر کہا ”اوائے میں کبھی بیمار ہوا اپنی زندگی میں؟ آج تک اس وقت تک، کوئی ڈہنی، کوئی جسمانی عارضہ۔۔۔۔۔ کوئی فزیکل ڈیلیٹی۔۔۔۔۔ کسی قسم کی۔۔۔۔۔ بولتے کیوں نہیں، جواب کیوں نہیں دیتے؟ سانپ کیوں سونگھ گیا۔ بکواس کیوں نہیں کرتے۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ میری بات کا جواب دو۔۔۔۔۔ بات کا جواب دو۔“

بختیار صاحب اس قدر اونچی آواز میں بولنے کے بعد بے ہوش ہو گئے اور ان کے سر ہانے مونیٹر کی بیپ تیز ہو گئی۔ ڈاکٹر فرخندہ نے جلدی سے ایک ٹینک ڈرپ کی نالی کو دیا اور پھر سارے اٹھ کر اباجی بختیار خاں کے کمرے سے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

ڈرائنگ میں دو بہنیں اور مسعود بھائی ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں خانساں یحییٰ کی پیالی اور تحریری استغفیٰ لے کر آ گیا۔ یحییٰ کی پیالی اس نے آپارشیدہ کو دی اور استغفیٰ پروفیسر مسعود کے سامنے تپائی پر پھیلا دیا۔ میجر فرخندہ نے کاغذ پر نگاہیں ڈالے بغیر چن اپ کر کے سردار سے کہا ”دیکھو سردار تم اباجی کی طبیعت کو تو شروع سے ہی جانتے ہو اور ہم سے بہتر جانتے ہو پھر یہ تم عرصیاں لکھ لکھ کر کیوں لاتے ہو؟“

سردار نے تقریباً روتے ہوئے کہا ”اب میرا یہاں رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے آپاجی! صاحب ہر وقت مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں اور میری ماں بہن پنتے رہتے ہیں میں بھی آخر عزت دار آدمی ہوں۔ بال بچوں والا ہوں۔ میں کب تک یہ سب کچھ برداشت کرتا رہوں۔ آپ مجھے آزاد کر دیں صاحب جی اور میری دعا لیں۔“

پروفیسر مسعود نے جھوٹ موٹ جھڑک کر کہا ”اوائے بکو اس نہ کرا حسان الہی! جب ہم سارے یہ سب برداشت کر رہے ہیں تو تو کیوں نہیں کر سکتا؟ آخر ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ پلے بڑھے ہیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو سمجھتے ہیں ایک دوسرے کے بھیدی ہیں۔ پھر یہ استغفیٰ کس لئے؟“

مسعود نے اس کا استغفیٰ پھاڑ دیا اس کے پرزے اس خانساں ہی کے ہاتھ میں دے دیئے۔

میجر فرخندہ نے کہا ”اس مہینے سے تم کو پچاس روپے ماہوار زیادہ ملا کریں گے کیونکہ تم ایک بیمار آدمی کی دیکھ بھال کر رہے ہو اور تمہاری ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔“

خانساں خوشی سے پھولا نہیں سمایا اور مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

آپارشیدہ واپس کراچی چلی گئی تھیں کیونکہ کرنل صاحب کے موتے کا آپریشن ضروری تھا۔ انجینئر محمود تھے تو سہی لیکن نہ ہونے کے برابر۔ اباجی بختیار خاں کی تیمارداری کا سارا بوجھ میجر فرخندہ اور پروفیسر مسعود پر تھا۔ حاضری تینوں ہی دیتے تھے لیکن محمود صاحب کی نہ تو کوئی رائے تھی اور نہ ہی کوئی تجویز پیش کرتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اباجی کے بارے میں فکر مند نہیں تھے وہ کافی پریشان تھے لیکن ان کے پاس اظہار کی کمی تھی۔

آج اباجی جسمانی طور پر پہلے سے بہتر نظر آتے تھے لیکن ان کی سوچ اسی مقام پر اٹکی ہوئی تھی۔ آواز ذرا دھیمی ہو گئی تھی لیکن جوش خروش ویسا ہی تھا۔ انہوں نے نکلنے سے اپنا سراٹھانے کی کوشش کی اور ساتھ مسکرانے کو بھی زور لگایا مگر دونوں ہی کام نہ ہو سکے۔ اپنے بچوں کو سامنے بیٹھا دیکھ کر کہنے لگے ”مجھے افسوس ہے کہ کل شام میں تمہیں لی فنگ چونہ لے جا سکا۔ دفتر سے میں نے تم کو بہتیرے فون کئے مگر تم میں سے کوئی بھی گھر پر موجود نہ تھا اس لئے میں اکیلا ہی چینی ریستوراں چلا گیا۔ یہ رشیدہ کدھر ہے؟“

”آپا کراچی چلی گئی ہیں اباجی۔“ میجر فرخندہ نے کہا ”عادل بھائی کا آپریشن ہے۔“

”عادل کا آپریشن!“ بختیار خاں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا ”اس کو کس آپریشن کی ضرورت آ پڑی؟“

”موتنے کا آپریشن ہے اباجی!“ مسعود نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”اب وہ لیزر سے یہ آپریشن کرتے ہیں۔ زیادہ دقت نہیں

ہوتی۔“

”اچھا“ بختیار خاں آنکھیں بند کر کے بولے ”انسان اگر اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہ کرے تو اس کو کسی دقت نہیں ہوتی۔ مجھے بھی چائیز مینودیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ میں مینودیکھے بغیر نمبروں کے حساب سے آرڈر دیتا ہوں اور مجھے تقریباً سارے آئیٹم زبانی یاد ہیں لیکن کل رات میں نے بیرے کو بھی آڈر نہیں دیا تھا کہ مجھے کونے میں ایک ہیولا سا نظر آیا جو ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا ضرور لیکن کچھ سمجھا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد بیرے نے آکر مجھے کہا وہ صاحب آپ کو بلارہے ہیں۔ میں آہستگی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور ان صاحب کی طرف چل دیا اور میری حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہی فرخندہ جب میں نے ایک مدت کے بعد سکندر کو دیکھا۔ وہ ویسا ہی ہشاش بشاش اور نو برنو تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو مہمان تھے جو مجھے دیکھ کر اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں نے اپنے ہاتھ میری طرف پھیلا دیئے۔۔۔۔۔ تم تو سکندر کو اچھی طرح سے جانتے ہو مسعود؟“

”جی اباجی، کیوں نہیں۔“ مسعود نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا ”لیکن اس وقت میرے ذہن میں ان کی شکل کچھ ٹھک سے نہیں

آ رہی۔“

”حد ہو گئی مسعود۔۔۔۔۔“ بختیار خاں نے چڑ کر کہا ”بھئی سکندر اعظم! مقدونیہ کے شہنشاہ فلپس کا بیٹا فاتح اعظم!“

فرخندہ نے کہا ”اباجی آپ باتیں نہ کریں ڈاکٹر صاحب منع کر گئے ہیں۔“

اباجی نے فرخندہ کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا ”اس کے ساتھ چوڑے رخ کی ٹوپی لگائے نیولین بونا پارٹ تھا اور ساتھ ننگے سر ماؤزے تنگ تھا جس نے بند گلے کی موٹی بشرت اور اسی کپڑے کی پتلون پہن رکھی تھی۔ میں نے ہاتھ اونچا کر کے کہا، عمل و حرکت اور فعل و اقدام کے پاسبانو میرا سلام قبول کرو اور میرے مقدر کے ستارے پر نگاہ ڈالو کہ میں کرۂ ارض کے عظیم ترین رہنماؤں کی محفل میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے میرا سلام قبول کیا لیکن منہ سے کوئی جواب نہ دیا۔“

”فرخندہ نے کہا ”اباجی! آپ نے اپنا گرین کیپ سول لے لیا؟“

اباجی نے کہا ”جب میرا مینو لے کر آیا تو میں نے کہا آج آپ تینوں میرے مہمان ہیں اور میں نہایت ادب کے ساتھ شرف میزبانی کے حصول کی درخواست کرتا ہوں۔ سکندر نے اور ماؤزے نے اثبات میں سر ہلایا لیکن بونا پارٹ کہنے لگا کہ معذرت چاہتا ہوں خان صاحب، آج میری طبیعت ذرا بوجھل ہے اس لئے میں نے کھانا نہیں کھاؤں گا البتہ آپ کے ساتھ بیٹھوں گا ضرور۔۔۔۔۔ میں نے کہا، آپ صرلاٹ قسم کا سوپ لے لیجئے۔ چکن بروتھ یا تھائی سوپ۔۔۔۔۔ نیولین نے کہائیں محفلوں اور ضیافتوں میں کبھی بھی کھانا نہیں کھاتا کیونکہ میں اپنا دایاں ہاتھ ہمیشہ اپنی واسکٹ کے اندر رکھتا ہوں۔ یہ دیکھئے اس نے اپنا ہیٹ ہلا کر کہا، میں اپنی ہرواسکٹ کے درمیانی دو

بٹنوں کا فاصلہ زیادہ رکھواتا ہوں تاکہ میرا ہاتھ آسانی سے اندر داخل ہو سکے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کا محضر تناول کریں، میں آپ کو کمپنی دوں گا۔۔۔۔۔ جب ماؤ پیرے کو آرڈر لکھوا چکے تو میں نے سکندر اعظم سے کہا، یہ علاقہ تو آپ کا دیکھا بھالا ہے اور آپ اسے فتح کر چکے ہیں اس لئے آپ کو تو کوئی دقت نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ اس نے مسکرا کر کہا، آپ کا یہ علاقہ تو میں نے فتح نہیں کیا تھا البتہ اس کے سارے بالائی حصے میرے زیر نگیں تھے۔ میں نے سیلوکس کو ایک بلیو پرنٹ بنا کر دیا تھا کہ اگلی مرتبہ جب میں آؤں گا تو یہ سارا علاقہ فتح کر کے اپنی قلمرد میں داخل کروں گا لیکن واپسی پر ساہیوال کے کچھ جاٹگیوں سے ہماری مڈ بھٹڑ ہو گئی۔ ان لوگوں کے پاس باقاعدہ تو کوئی ہتھیار تھے نہیں، ڈانگوں کے ساتھ سن کی رسیوں سے چھریاں باندھ کر بلیمیں سی بنا کر آ گئے تھے۔ اس وقت گو میری سیاہ تھک چکی تھی، پھر بھی ہم ان جاٹگیوں سے سینہ سپر ہو کر لڑے اور کشتوں کے پستے لگا دیئے۔۔۔۔۔ میں نے کہا، سکندر صاحب اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی کم فوج کے ساتھ آدھی دنیا کو فتح کر لینا صرف آپ کے جوش عمل کی وجہ سے ہوا اور نہ یہاں تو کالے پہاڑ ایسے ہاتھیوں کی لاتعداد فوجیں تھیں۔۔۔۔۔ سکندر نے کہا، بس جی کیا عرض کریں خاں صاحب، یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔ ایک جاٹگی کی برجھی میرے کندھے میں لگی اور تین انگل اندر اتر گئی۔ میں نے گھوڑا چڑھا کر اس جاٹگی کا تو خاتمہ کر دیا البتہ اس زنگ آلود برجھی سے مجھے سپٹک ہو گیا تیز بخار نے میرا دماغ شل کر دیا۔ پھر میں آپ کے علاقے پر دوسرا حملہ کرنے کی دل ہی میں لے گیا۔۔۔۔۔ نیپولین نے کہا، یہ سب قسمت کے کھیل ہیں اور جو کچھ ہونی کرتی ہے وہ ہو کے رہتا ہے۔ میں نے سارے یورپ کے چھکے چھڑا دیئے۔ مصر کے ابوالہوال میرے دبدبے کے آگے اپنی ٹوٹی ناک رگڑنے لگے۔ لیکن ہوا وہی، جو تقدیر میں لکھا تھا۔ اپنی ساری تیاری، کوشش، ہمت اور پلاننگ کے باوصف میں روس میں پھنس کے رہ گیا۔ وہاں سے واپسی بڑی ذلت کی واپسی تھی۔ پھر واٹرلو کے مقام پر دو ٹکے کے نیلسن نے میری ہیرے جیسی فوج کی آن بان مٹی میں ملا دیا۔۔۔۔۔ ماؤ نے کہا، کسی ملک پر فوج کشی کرنا اور قلعوں اور محلوں کے محاصرے کر کے جنگجو محافظوں سے ہتھیار ڈلوانا، اپنی دھرتی سگ طیارے اڑا کر دشمن پر بمباری کرنا اور اپنے گھر کے صحن سے راکٹ لانچ کرنا بڑا ہی آسان کام ہے لیکن ذلتوں اور پستیوں میں ڈوبی ہوئی قوم میں انقلاب لانا مشکل ہی نہیں، ناممکن بات ہے۔ میں نے گراں خواب چینپوں کو ان کی صدیوں کی نیند سے بیدار کر کے ایک زندہ قوم میں تبدیل کر دیا۔ ان کو لانگ مارچ کی سوئی کے ناکے سے گزار کر ایک سپر پاور بنا دیا لیکن شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کامریڈ۔ میں نے چلا کر کہا اور کھانا کھاتے ہوئے لوگ مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔۔۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، مختیار خاں۔ ماؤ نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ لوگ انقلاب کا ذکر بڑے شوق سے کرتے ہیں لیکن جب وہ آجائے تو اسے ناپسند کرتے۔۔۔۔۔ سکندر اعظم نے ڈرم سٹک کی بوٹی منہ سے نکال کر کہا کہ کیسی باتیں کرتے ہو یا، تمہاری قوم تو تمہیں پوجتی ہے۔ اگر وہ تمہیں ایک دیوتا نہیں سمجھتی تو ایک پیغمبر ضرور خیال کرتی ہے۔۔۔۔۔ نیپولین نے کہا، ہم بادشاہ لوگ اور فاتح لوگ تو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن انقلابی لیڈر تو لوگوں کے دلوں میں محبت اور مودت کے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں۔ وہ تو امر ہو جانے ہیں نیپولین! ماؤ زے تنگ صاحب کی تو چین میں پرستش ہوتی ہے۔ لوگ ان کے جذبہ حب الوطنی اور خلوص و ایثار کو اب تک یاد کرتے ہیں اور جو جو قربانیاں انہوں نے چین کو آزاد کرانے میں دی ہیں اور جس ہمت اور جواں مردی کے ساتھ انہوں نے امریکہ کی مکروہ سیاست اور ثقافت کو اپنی سر زمین سے دور رکھا ہے، یہ انہی کا حصہ

ہے۔۔۔۔۔ سکندر اعظم نے کانٹاروک کر پوچھا، کیا ٹرم چلائی تھی ماؤ تم نے امریکہ کے بارے میں؟۔۔۔۔۔ میں انہیں پیپر ٹائیگر کہتا تھا، ماؤ نے کہا۔ اور یہ اس وجہ سے کہتا تھا کہ میرے لوگوں کے دل سے امریکہ کی بڑائی، اس کی امارت اور اس کی جارحانہ صلاحیت کا خوف دور ہو جائے اور وہ کم از کم پوری ایک صدی تک امریکہ کو چین کی سرزمین سے دور رکھ کر اپنی مرضی کے مطابق ملک چلا سکیں۔۔۔۔۔ اور اسی طرح سے ہو رہا ہے، میں نے کہا۔ جب کوئی عمل نیک نیتی سے اور خلوص سے اور لگن سے کیا جاتا ہے تو اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے جو اس وقت چین میں روز روشن کی طرح نظر آ رہا ہے۔ ہم پاکستانیوں کو تو چین کی دوستی اور چین کے عمل اور چین کی راست روی پر فخر ہے۔۔۔۔۔ لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے خاں صاحب، نیولین نے واسکٹ سے ہاتھ نکالے بغیر کہا، چین میں جو کچھ ماؤ نے کیا اور چین کو جس طرح ماؤ لے کر چلا اور چین جس انداز سے لال کتاب کی حدت میں تپ کر فولاد بنا، وہ اپنی اس منزل سے واپس بھی لوٹ سکتا ہے جس طرح روس سے میری مرجعت ہوئی تھی۔۔۔۔۔ یہ تو خیر نہیں ہو سکتا، ماؤ نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند کر کے جواب دیا۔ یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ ساٹھ ستر سال گزرنے کے بعد لوگ بور ہو کر اپنے عمل پر نظر ثانی شروع کر دیں اور میری تعلیمات میں بدعتیں تلاش کر کے الگ سے ایک ٹولہ بنالیں، لیکن ابھی اس میں بہت دیر لگے گی۔۔۔۔۔ آپ نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ اب اس کی چولیں کبھی بھی ڈھیلی نہ ہو سکیں گی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ اب ان کی تعلیمات کا اثر ایشیاء سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیل رہا ہے۔ کیوں ٹھیک کہا نہ میں نے؟“

”جی ابا جی!“ مسعود نے ہولے سے کہا اور اپنی گھڑی میں اگلی خوراک کا وقت دیکھنے لگا۔

ابا جی تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کئے لیٹے رہے، اچانک ایک بار پھر ان کا ٹل کھل گیا۔ کہنے لگے ”یہ بونا پارٹ بھی عجیب مسخر آ آدمی ہے۔ آدھ پون گھنٹہ ہماری باتیں سننے کے بعد بولا، بھائی صاحب میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان کے بنائے ہوئے اصول اور ضابطے پلان اور منصوبے، فلسفے اور بندشیں انسان کے دکھوں کا علاج نہیں کر سکتے۔ انسانوں کے لئے تو کچھ اور ہے، بن کر آتا چاہیے۔ کوئی زانچہ، کوئی صحیفہ، کوئی پلان! انسانی تجویزیں تو بڑھے نیل کی طرح ہی گوڈا ٹیک جاتی ہے۔۔۔۔۔ مجھے نیولین کی یہ بات سن کر رونا آ گیا اور میرا دل درد کی شدت سے پھٹنے لگا۔ میں نے چیخ کر کہا، فاتح پروشیا! یہ تم کیا رجعت پسندوں کی سی باتیں کرنے لگے ہو۔ انسانوں کے مسائل انسان ہی حل کر سکتے ہیں اور انسانوں کے دکھ درد کا علاج انسان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی آسمانی قوت یا آفاقی طاقت زمین کے انسانوں کی مدد نہیں کر سکتی۔ انسان صرف اپنی محنت سے، اپنے زور عمل سے، سرگرمی اور جانفشانی سے، مشقت اور دوڑ دھوپ سے اپنی راہوں پر چراغاں کر سکتا ہے اور اپنی زندگی میں آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ میری بھی یہی سوچ تھی، ماؤ نے کہا، لیکن اب مجھے انسانی کوشش اور انسانی تجویز بالکل بے معنی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی تجویز، کوشش، محنت اور جدوجہد کا نتیجہ اکثر کئی کاٹ جاتے ہیں اور مجھے اس فیکٹر کی تلاش ہے جو نتیجے کی کئی کٹا دیتا ہے۔۔۔۔۔ میں نے ماؤ کا یہ فقرہ سن کر چھری کا ٹاٹا ہاتھ سے رکھ دیا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ سکندر اعظم نے پریشان ہو کر پوچھا۔۔۔۔۔ کیا بات ہے، بختیار خاں، تم رو کیوں رہے ہو؟ کیا کہا ان لوگوں نے تم سے؟۔۔۔۔۔ میں نے سکندر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بھوکے بھیڑیے کی طرح ماؤ اور بوٹا پارٹ پر لپکا کہ کوشش، محنت، مشقت اور جدوجہد چھوڑ کر انسان ہاتھ پر کر لے، جامد ہو جائے، پتھر بن جائے اور ترقی نہ کرے، آگے نہ بڑھے، روشنی نہ پھیلائے۔ بوٹا پارٹ نے کہا، جب میں

نے مصرّح کیا تو مجھے وہاں کے لوگوں سے پتہ چلا کہ انسانوں کے لئے اوپر سے دو کام ہی تجویز ہوتے ہیں: امر کے مطابق کرتا جائے اور منہا ہی کو چھوڑتا جائے۔ اور ترقی نہ کرے، آگے نہ بڑھے، کوشش نہ کرے؟۔۔۔۔۔ نپولین نے کہا، ترقی تو پیچھے سے خود بخود چلی آرہی ہے اپنی عادت اور سنت کے مطابق، زوردار ہوا کی طرح۔ ہمیں تو صرف ادا امر اور نواہی کی ڈور کو تھام کے رکھنے کا حکم ہے، پتنگ تو خود بخود اور چڑھتی جائے گی ہوا کے زور پر۔ ہم تینوں سے یہ غلطی ہوئی کہ ڈور کا تو کوئی دھیان نہیں کیا اور پتنگ کو اوپر اٹھانے اور پھدک پھدک کر اوپر چڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔ سکندر اعظم نے کہا، یہ کیا چیز ہوتی ہے جس کا تم نے ابھی نام لیا اور جس کی ڈور تھام کر رکھنے کا حکم ہے؟۔۔۔۔۔ بوٹا پارٹ نے کہا، یہ Dos & Don'ts کا ایک مینیوئل ہے جو مصروالوں کے پاس تھا۔۔۔۔۔ پھر تم نے لیا کیوں نہ ان سے یہ مینیوئل؟ سکندر نے پوچھا۔۔۔۔۔ وہ عجیب سے لوگ تھے، نپولین نے کہا اپنی ہی بد مستیوں اور خرمستیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کو پتہ نہ چلتا تھا کہ مینیوئل کہاں ہے اور کس کے پاس ہے۔۔۔۔۔ ان کو ٹکٹکی پر کسنا تھا، ان کاغذی شیروں کو ماؤ نے غصے سے کہا۔۔۔۔۔ میں نے ان کو مشکیں باندھ کر کمپ حاضر کر دیا تھا لیکن وہ سارے الول جُول سے لوگ تھے۔ سارے سارا گروہ بھلکڑ سے لوگوں پر مشتمل تھا۔ کوئی کہتا تھا میرے دادا کے پاس تھا یہ مینیوئل۔ میں نے دیکھا ضرور ہے لیکن پھر پتہ نہیں کہاں گیا۔ ایک عورت کہتی تھی میری نانی کے سرال والے اسے پڑھا کرتے تھے لیکن وہ سارے مرکپ گئے۔ اب پتہ نہیں کس کے پاس ہوگا۔۔۔۔۔ اسے تلاش کرنا بوٹا پارٹ، اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو کبھی خالی ہوتا واپس نہ آتا۔۔۔۔۔ یہ تمہارے زمانے کی چیز نہیں سکندر، تم سے بعد کی ہے۔ نپولین نے کہا، اس میں انسان کی زندگی کا مکمل زائچہ موجود ہے اور ترقی کے لئے اور آنے والے زمانوں کے لئے کھلا راستہ دے دیا گیا ہے۔۔۔۔۔ میں نے استادِ ماں سے ایک ایسا ہی مینیوئل بنانے کی درخواست کی تھی، سکندر نے کہا اور انہوں نے بنایا بھی! لیکن وہ چل نہیں سکا۔۔۔۔۔ یہ ارسطو کے بس کاروگ نہیں تھا سکندر اور نہ ہی یہ کسی اور انسان کے بس کی بات ہے۔ اصل میں یہ ایک اور ہی چیز ہے۔۔۔۔۔ میں نے چیخ کر کہا تم مسلمان تو نہیں ہو گئے بوٹا پارٹ، ایک فنڈ اسپیشلسٹ قسم کے مسلمان؟۔۔۔۔۔ نپولین نے ہنس کر کہا، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے مسلمان ہونے کی اور مجھے کیا خوشی مل سکتی ہے اس گروہ میں داخل ہونے سے! پہلے ہی اس دنیا میں کروڑوں مسلمان موجود ہیں، انہوں نے کیا کر لیا؟۔۔۔۔۔ سکندر نے کہا، اگر یہ مینیوئل میرے زمانے میں ہوتا اور مجھے مل جاتا تو میں ساری دنیا کو فتح کرنے کے بجائے سارے کرۂ ارض کو سوکھا کر دیا۔ پھر اس نے ذرا سا سوچکر کہا، مجھے میرے حضرت دیوجانس کلبی نے ایک مرتبہ فرمایا بھی تھا۔۔۔۔۔ لیکن میں نے اسے مزید بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ غضب خدا کا! ایسے باہمت، باعمل اور نبردو پیکار کے سبل، عمل و حرکت کے دیوانے، طرفدارانِ عمل اور موضوع کیا چھیڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ میرے مہمان تھے اور بہت ہی معزز مہمان تھے ڈاکٹر فرخندہ، لیکن پتہ نہیں ان کو ہو کیا گیا تھا۔ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کو آرہے تھے۔ ویسے ایسے ہو سکتا ہے پروفسر؟

"جی ضرور ہو سکتا ہے۔" پروفیسر مسعود نے کہا "ہو کیوں نہیں سکتا۔ زندگی میں سبھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

"لغت ایسی زندگی پر!" بختیار خان نے چڑ کر کہا "جو موج آگے بڑھنے کے لئے بنی ہے، وہ پیچھے کیسے جاسکتی ہے۔"

"اباجی!" پروفیسر مسعود نے ذرا تگڑے ہو کر کہا "زندگی کوئی جامد چیز تھوڑی ہے کہ حکم کے تحت ایک ہی مقام پر پڑی رہے۔ یہ تو

ایک رواں دواں کائنات ہے۔ آگے بھی جاتی ہے، پیچھے بھی آتی ہے۔ دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف گھوم جاتی ہے۔ نہ آگے کوئی حد ہے نہ پیچھے، زندگی جو ہوئی اباجی۔"

اباجی، بختیار خاں نے اپنے جاہل بیٹے کو جھڑکی دینے کے لئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر ان کے پپو نے اٹھ نہ سکے۔ انہوں نے نفرت اور ناراضگی کی چند تیوریاں اپنے ماتھے پر ڈالیں اور چھوٹے بڑے سانس لینے لگے۔

خانساں سوپ کی ٹوٹی دار پیالی لے کر اندر آیا تو میجر فرخندہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے پیالی تپائی پر رکھنے کے لئے کہا۔ وہ الوؤں کی طرح دیدے گھا کر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور احمق پن سے اپنی چاچھیں پھیلاتا اور سیکڑتا پیالی ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ مسعود نے سر کے اشارے سے فرخندہ کو سمجھایا کہ ٹھیک ہے، اسے جانے دو۔

رات تک تو اباجی ٹھیک رہے اور اپنا جوس اور سوپ لے کر تھوڑی دیر کے لئے سو بھی گئے لیکن دوائیں لینے کے بعد ان کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ میجر فرخندہ نے ان کو ڈرپ لگانے کی کوشش کی تو انہوں نے اشارے سے منع کر دیا۔ پھر جب وہ ان کا پی پی چیک کرنے لگی تو سر کے اشارے سے روک کر اپنے بستر سے اٹھادیا۔ فرخندہ نے ان کا پوٹا کھول کر آنکھ کا معائنہ کرنا چاہا تو انہوں نے کافی مضبوطی کے ساتھ اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ٹینڈنٹ نرس کہنے لگی "ڈاکٹر صاحب ابھی رہنے دیں، تھوڑی دی بعد آ کر چیک کر لیجئے گا۔"

بختیار خاں نے بھرپور آواز میں پوچھا "اور کون ہے تمہارے ساتھ فرخندہ؟" تو نرس نے کہا "میں ہوسر، فرزانہ۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے مربیانہ انداز میں پوچھا "اپنی ڈیوٹی پر آگئی ہو؟"

"جی سر"

میجر فرخندہ نے فرزانہ کو دروازے کے پاس بلا کر کہا "دیکھو! میں اپنے کمرے میں ہوں۔ اگر اباجی کو ذرا سی بھی بے چینی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔" فرزانہ نے مدہم آواز میں کہا "مجھے معلوم ہے۔"

میجر فرخندہ چلی گئی تو فرزانہ نے کرسی پر بیٹھ کر اپنے ناول سے خلال کی نشانی نکالی اور مریض پر ایک نظر ڈال کر پڑھنے لگی۔ اس وقت ناول میں بلی کتوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔

صبح سویرے، فجر کے اذان کے ساتھ اباجی، بختیار خاں کی حالت غیر ہو گئی اور ان کی سانس رک رک کر چلنے لگی۔ چند لمحے تو فرزانہ نے ان کی نبض دیکھ کر اور ان کا پی پی چیک کر کے گزار دیئے لیکن جب ان کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں تو گھبرا کر ڈاکٹر فرخندہ کو جگانے چلی گئی۔ ڈاکٹر فرخندہ ہڑا کر اٹھی تو اس نے فرزانہ کی شکل دیکھ کر اسے محمود بھائی اور مسعود بھائی کو بھی اٹھانے کے لئے کہا۔ اباجی کے کمرے میں پہنچ کر فرخندہ نے مریض کی حالت دیکھی تو لپک کر گیلری میں پڑے فون پر ڈاکٹر قدیر کو اطلاع دی۔ اور جب وہ فون کر کے واپس مریں کے کمرے میں گئی تو محمود بھائی اور مسعود بھائی دونوں ہی وہاں موجود تھے اور اباجی کے بستر کے پاس کھڑے تھے۔ محمود نے ہاتھ کے اشارے سے فون کی بابت پوچھا تو فرخندہ نے سر ہلا کر کہا "کر دیا ہے اور ڈاکٹر صاحب پہنچ رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک تینوں اسی طرح اپنے باپ کے گرد کھڑے رہے اور فرزانہ چارٹ میں کچھ بھرتی رہی۔ پھر اچانک مریض کا سانس نا رل ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھیں نیم دا کر کے اور پتلیاں گھما کر تینوں کو باری سے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرتے ہوئے پوچھا "ڈاکٹر قدیر کو فون کیا؟"

"جی اباجی" ڈاکٹر فرخندہ نے جواب دیا۔

"پہنچ رہا ہے؟"

"جی ابھی آرہے ہیں۔"

"جاگا ہوا تھا؟"

"جی، نماز پڑھ کر سیر پر جانے والے تھے۔"

"اب تو سیدھا یہاں آئے گا ناں؟"

"جی اب تو سیدھے ہمارے طرف ہی آرہے ہیں۔"

"اچھا یہ بتی بچھا دو اور کھڑکیوں سے پردے ہٹا دو۔ باہر سے بڑی اچھی روشنی آرہی ہے۔"

"جی بہت اچھا۔"

میجر فرخندہ کھڑکیوں سے پردے ہٹانے لگی تو فرزانہ نے اپنی سیٹ سے اچھل کر فرخندہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ٹھریں ڈاکٹر صاحب یہ میں کر دیتی ہوں، آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔" ڈاکٹر فرخندہ اپنے دونوں ہاتھوں میں سر تھا کر آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کی گھنٹی بجی اور نرس فرزانہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر قدیر تشریف لے آئے تھے اور فرزانہ ان کا بیگ اٹھا کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے مریض کا چارٹ دیکھا، پھر ڈاکٹر فرخندہ سے پوچھا "خان صاحب نے رات کیسے گزاری؟"

"بے چینی میں، بڑی بے چینی میں۔" بختیار خاں نے مجسم کراہ بن کر کہا "یہ رات بہت ہی لمبی ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب، بڑی مشکل

سے صبح کی ہے۔"

"ویسے تو آپ ٹھیک ہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا

"ویسے ٹھیک ہوتا تو آپ کو کیوں فون کرواتا۔" بختیار خاں نے جھڑک کر کہا "مجھے آپ کے درشنوں کا شوق نہیں ہے۔"

ڈاکٹر کی آمد کا سن کر مسعود اور محمود بھی اندر آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر کم خوابی کے اثرات نمایاں تھے اور وہ کچھ بے زار

سے نظر آرہے تھے۔ ڈاکٹر قدیر نے محمود کی طرف رخ کر کے کہا "انہیں ہسپتال شفٹ کرنا پڑے گا محمود صاحب اور نیوروفزیشن اور نیورو

سرجن کو کنسلٹ کرنا ہوگا۔ میں انہیں فون کر دیتا ہوں۔" محمود نے اثبات میں سر ہلایا تو اباجی بختیار خاں نے چڑ کر کہا "مجھے کوئی دماغی عا

رضہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب جو آپ مجھے نیوروفزیشن کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا سی ہارٹ کنڈیشن ہے جو بلڈ پریشر کی زیادتی سے پیدا

ہو گئی ہے۔ میں گھر پر ہی ٹھیک ہوں۔ آپ میری دوائیں تبدیل کر دیجئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے خاں صاحب" ڈاکٹر قدیر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "میں دوائیں تبدیل کر دیتا ہوں لیکن ایک دوسری اوپینین لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔"

بختیار خاں نے ڈاکٹر صاحب کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور آنکھیں بند کئے اسی طرح لیٹے رہے۔ سب نے خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا اور مزید خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مرتبہ پھر الٹ پلٹ کے چارٹ دیکھنے میں مصروف ہو گئے اور فرزانہ جھک کر کمبل کے کنارے گدے تلے دبائے میں مصروف ہو گئی۔

اباجی بختیار خاں نے آنکھیں کھولے بغیر آہستہ سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب چلے گئے؟"

"جی نہیں۔" ڈاکٹر قدیر نے کہا "میں موجود ہوں۔"

"کل شام عصر اور مغرب کے درمیان ڈاکٹر صاحب" بختیار خاں نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا "برائڈر تھر روڈ پر قارون صاحب سے ملاقات ہوئی۔"

"قارون سے؟" ڈاکٹر قدیر نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ڈاکٹر صاحب، قارون سے _____ میں نے پہلے تو انہیں کبھی نہیں دیکھا لیکن کل اچانک ان کی زیارت ہو گئی۔ وہ سرخ و سیاہ رنگ کی اوپن بھیروں میں زریفت کا قیمتی گاؤن پہنے کھڑے تھے اور سینکڑوں معززین علاقہ ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ یہ اوپن بھیروں کمپنی نے خاص طور پر ان کے لئے بنا کر بھیجی تھی اور اس کے دونوں طرف ریشم اور کنوایں کی جھولیں لٹک رہی تھیں۔ لوگ اہلاً و سہلاً مرحبا کہتے ہوئے ان کی گاڑی کے ساتھ ہونکتے جا رہے تھے اور گاڑی کے پیچھے تیس چالیس چاق و چوبند باوردی ملازموں کا ایک دستہ ان کی کنجیوں کی بھاری بھر کم چین اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر ان کو سلام کیا لیکن انہوں نے میری طرف دیکھا نہیں۔ معززین کے گروہ جو ان کی گاڑی کے ارد گرد تیز تیز چل رہے تھے، ایک دوسرے سے کہتے جا رہے تھے کہ کیا ہی خوب ہوتا اگر یہ دولت، یہ ساز و سامان، یہ کروفر، یہ مال و زر ہم کو بھی ملتا اور ہم بھی قارون کی طرح عیش کرتے _____ تیز رفتار گروہ میں سے ایک نے نعرہ لگایا "صاحب نصیب!" اور ہم سب نے مل کر جواب میں نعرہ لگایا "خوش نصیب، خوش نصیب"۔ نو جوان نے نعرہ مارا "بھاگ بھاگ اور طالع مند"۔ ہم نے جواب میں نعرہ مارا "قسمت والا دولت مند"۔ نو جوان نے کہا "ذی ثروت سردار ہے"۔ ہم نے کہا "دھن والا زردار ہے، دھنی ہے ما بیدار ہے"۔ قارون ہاتھ ہلا ہلا کر اور مسکرا مسکرا کر ہمارے نعروں کا جواب دیتے جا رہے تھے اور ہمیں بے چین ہو کر ساتھ ساتھ بھاگنے سے روک رہے تھے کہ چلو ضرور مگر آہستہ چلو۔ ہمارا یہ قافلہ برائڈر تھر روڈ سے شاہ عالمی کی طرف جا رہا تھا اور لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس جلوس میں شریک ہو رہے تھے۔ ہر شخص مسرور و شاداں تھا اور ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اتنے بڑے رتبے والے مال دار اور زردار امیر الامراء کے جلوس میں بھاگنا اتنی بڑی سعادت تھی جو صرف ان لوگوں کو نصیب ہوئی جنہوں نے آپ کی زیارت کی _____ آپ سن رہے ہیں ناں میری بات ڈاکٹر صاحب؟"

"جی جی، سن رہا ہوں۔" ڈاکٹر قدیر نے کہا "بڑے غور سے سن رہا ہوں۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب کراؤن بس اڈے سے ذرا آگے بابا غلام محمد ٹنڈا الو ہے کچرے کا ٹھیلہ دھکیلتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ لوگوں نے لپک کر اس کا ٹھیلہ ایک طرف کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت بھاری تھا اور آپ کی سواری قریب پہنچ گئی تھی۔ بابے ٹنڈے نے روزمرہ کا معمول سمجھ کر اپنا ٹھیلہ ہجوم میں سے گزارنا چاہا تو آپ کی بحیروں اس کے آدھ ٹن وزنی ٹھیلے سے رک کر کھڑی ہو گئی۔ جب بابے گاموں نے جھو متے ہوئے لوگوں کا گیت سنا: دھنی ہے مایہ دار ہے، سلام ہو سلام ہو، ہم پر بھی انعام ہو _____ تو بابے غلام محمد نے میلے سلوک سے اپنا واحد بازو اوپر اٹھا کر اور ہاتھ کی اوٹ سے آنکھوں کی دھوپ روک کر اونچی آواز میں ہم سے کہا، اوے تمہارا ناس جائے! تم اس دولت پر کیا لپچاتے ہو، اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب اس دنیاوی کروفر سے ہزار درجہ بہتر ہے اور یہ نعمت ان لوگوں کو ملتی ہے جو دنیا کی حرص و طمع سے صبر کرتے ہیں۔ قارون صاحب نے تو اس بات کا برا ماننا ہی تھا، ہم سب کو بھی اس احق کی جسارت پر بڑا غصہ آیا۔ سنہرے مستقبل کی طرف بڑھنے والے نوجوانوں نے تالیاں بجا بجا کر گانا شروع کر دیا:

فقرا ہے، نادار ہے

مور کھ اور نادان ہے

بابا گاموں ڈھانڈا ہے

عقل کے نام پہ آندا ہے

جب شور ذرا تھا اور قارون صاحب نے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا اشارہ کیا تو بابا گاموں مجسم تحیر ٹکر ٹکر قارون صاحب کو دیکھے جا رہا تھا اور اپنے ٹھیلے سمیت وہیں جما کھڑا تھا۔ قارون صاحب نے کڑک کر کہا _____ او مفلس، کنگلے، بھوکے، شودے، دھاڑی دار! تجھے پتہ نہیں میں کون ہوں؟ تو گاموں نے اپنا واحد بازو وہاں میں لہرا کر احمقوں کی طرح جواب دیا _____ مجھے اچھی چرح سے معلوم ہے قارون کو تو کون ہے، لیکن اپنے آپ اور اپنی ذات پر اتنا گھمنڈ نہ کر کیونکہ خدا گھمنڈ کرنے والے متکبر آدمیوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر خدا نے اپنی مہربانی سے اور اپنے کرم سے تم کو اتنا دے رکھا ہے تو اس میں کچھ اپنی قوم کے لوگوں کو بھی دے اور اس دنیا میں آخرت کی جستجو بھی کر اور اس دنیا سے اپنا حصہ آخرت میں لے جانا نہ بھول۔ پھر بابے گاموں نے اونچی آواز میں کہا، میری بات کان کھول کر سن لے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی بندوں کے ساتھ احسان کر اور اس دنیا میں اپنی دولت کے زور پر فساد نہ پھیلا۔ میرا سو ہنا اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا _____ پھر ڈاکٹر صاحب، قارون صاحب نے بحیروں میں کھڑے کھڑے اپنے لاؤڈ سپیکر کا بٹن آن کیا اور مائیک پر فرمایا، اے لوگو! غور سے سن لو اور اچھی طرح سے جان لو کہ مجھ کو یہ سب کچھ میری ذاتی عقل اور ہنرمندی سے ملا ہے اور یہ سارا مال میں نے اپنی دانش کے زور پر جمع کیا ہے اور کوشش، جدوجہد، سعی مسلسل کا جو علم مجھے حاصل ہے اور جس کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ سازگار کر کے میں اپنے آپ کو سنوارتا، اپنی ذات کو ابھارتا اور اپنے مال کا انبار تارہتا ہوں، یہ سب کچھ اس علم سے اور اس حکمت سے حاصل ہوا ہے۔ میں اپنی محنت، کوشش، تگ و دو، تجویز اور تن دہی سے حاصل کیا ہوا مال کیوں کسی کو دوں اور اپنے علم، اپنی ہنر

مندی اور اپنی عقل پر کیوں نہ ناز کروں؟ _____ ڈاکٹر صاحب میں تو حیران رہ گیا۔ آپ سن رہے ہیں ناں؟"

"جی جی، میں سن رہا ہوں۔"

"آپ غور سے سن رہے ہیں ناں جو انہوں نے فرمایا؟"

"جی میں نے ایک ایک بات غور سے سنی ہے اور ہر فقرے پر غور کیا ہے۔"

"کیا شان تھی ان کی ڈاکٹر صاحب!" "ابا جی، بختیار خاں نے کہا" اور کیا رعب اور جلال تھا ان کے چہرے پر، اور کیا روشنی تھی ان کے ماتھے پر خود سازی اور خود مختاری کی کہ میں تو ششدر رہ گیا۔ ان کے انداز گفتار اور عظمت کردار نے مجھے ان کا گرویدہ کر لیا۔ وہ انسان نہیں نظر آ رہے تھے ڈاکٹر صاحب بلکہ عزم و ہمت، خود شناسی، علم و حکمت اور فہم فہمید کے دیوتا نظر آتے تھے _____ میں اس عمر اور اس بیماری کے باوجود ان کی عجیروں کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔ نہ میری سانس پھولی نہ ہارٹ بیٹ میں اضافہ ہوا، نہ بلڈ پریشر بڑھا اور نہ ہی میں نے تھکاوٹ محسوس کی۔ وہ ایک عجیب سماں تھا، عجیب منظر تھا اور عجیب وقت تھا ڈاکٹر صاحب! دنیا کی ایک مقتدر، مقدس، محترم اور ذی عزت و عالی خیال ہستی مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھی اور میں ساون کی برکھا میں نہاتے بچے کی طرح شاداں و فرحاں ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا _____ پتہ نہیں اب ان کی زیارت نصیب ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر یہ موقع ہا تھا آتا ہے کہ نہیں اور پھر مرے بھاگ جاتے ہیں یا نہیں کیونکہ اب تو میں زندہ ہی اس پر ہوں کہ ایک مرتبہ پھر ان کی زیارت ہو جائے اور میں اور بھی قریب سے ان کو دیکھ لوں، ان سے مل لوں، ان سے بات کر لوں۔"

یہ کہہ کر ابا جی بختیار خاں خاموش ہو گئے اور ان کے ہونٹوں پر پیڑی سی جم گئی۔ ڈاکٹر قدیر نے گھڑی دیکھی اور اہل خانہ سے کچھ کہے بغیر مریض کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

پورج کی طرف چلتے ہوئے جب پروفیسر مسعود نے ڈاکٹر قدیر سے پوچھا کہ ابا جی کو کس وقت ہسپتال شفٹ کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کا کندھا تپتہ تپتہ کر کہا "میرا خیال ہے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کل تک انتظار کر کے پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔"

Virtual Home
for Real People

آڑھت منڈی

شرفو کافی دیر سے کما د کے کھیت میں کھڑا تھا اور جب رتبی گاؤں والوں کی نظر بچا کر اس کے پاس پہنچی تو اس نے آتے سار کہا "کہہ 'کیا کہنا چاہتا ہے؟' تو شرفو تھپلا آگے کر کے بولا "کہنا کو ہنا کیا ہے، ریتے لئے یہ چند سو غاتیں کراچی سے لایا ہوں۔ انہیں سنبھال لے۔"

رتبی نے تھپلا کھول کر دیکھا۔ اس میں کچھ ولا بتی کلپ تھے، سر پر لگانے والا پلاسٹک کا ایک بینڈ تھا، دو روڈ گولڈ کے کنگن تھے، سیکو کی نمبروں والی چھوٹی سی ایک زنا نہ گھڑی تھی اور ساتھ سلفوین کے چکنے کا غذا کا ایک پیکٹ تھا۔

"اس میں کیا ہے؟" رتبی نے پیکٹ کو دونوں طرف سے دیکھ کر پوچھا۔

"اس میں پہننے کی ایک چیز ہے۔" شرفو مسکرا کر بولا "نیچے پہننے کی چیز، قمیض کے اندر۔"

"قمیض کے اندر؟" رتبی نے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

"کالے ریشم کی ہے۔" شرفو بولا "گوری بی بیاں پہنتی ہیں تو قمیض کے اندر بڑی دکھ مارتی ہے۔ تو پہلے گی تو پہلے سے زیادہ جوان نظر آئے گی۔"

"اونہہ!" رتبی نے بے پروائی سے کہا "یہ کون سی نئی شے ہے جو اتنی دور سے اٹھالایا ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی پہنتی ہوں۔"

"بھلا دکھا تو۔" شرفو شرارت اور شرارت اس کے چہرے پر منجمد ہو گئی۔ رتبی کہنے لگی "دکھا تو دوں پر وہ کالے رنگ کی نہیں ہے۔"

عام کپڑے کی ہے سادہ۔"

"تو پھر اسے اتار کے یہ پہن لے، میں باہر نگاہ رکھتا ہوں۔"

رتبی ذرا سی سوچ کے بعد بولی "آج نہیں، کل پہنوں گی۔" نہا کے، گلابی سوٹ کے ساتھ۔"

پھر وہ دونوں بڑی دیر تک کما د کے کھیت میں کھڑے رہے اور جب یاسین چوکیدار کے کتے کی بھونک ادھر بڑھنے لگی تو وہ دبے

پاؤں کھیت سے باہر نکل گئے۔ ایک مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی اور!

دو سال پہلے شرفو نوکری کی تلاش میں گاؤں سے نکل گیا تھا اور کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کہاں گیا ہے۔ حضرت رکن عالم کے عرس پر ایک

بڈھے زائر نے جلیبوں والے لڑکے کو بتایا تھا کہ تیری طرح کا ایک جوان مانو نواب شاہ میں نان بابائی کا بھاڑ جھونکتا ہے اور وہ تمہارے ادھر ہی کارہنہ والا ہے۔ اس لڑکے نے خط بنواتے وقت کیکر والے نانئی سے اس کا ذکر کیا لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ پتو کی کا ایک ڈرائیور جب نانئی سے شیو کروار ہاتھ تو نانئی نے ڈرائیور کو بتایا کہ تمہارے ادھر کا کوئی لڑکا نواب شاہ میں تنور والے کا بھٹ جھونکتا ہے تو ڈرائیور نے کوئی توجہ نہ دی۔ ڈرائیور جب ٹرک لے کر پتو کی کے اڈے پر آیا تو اس نے منشی سے کہا کہ ہمارے ادھر کا کوئی نو جوان نواب شاہ میں ایندھن ڈھوتا ہے تو منشی نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ موضع جھیاں کا نمبر دار ج لاہور کی بس پکڑنے اڈے پر آیا تو منشی نے کہا کہ "تمہارے گاؤں کا کوئی لڑکا نواب شاہ میں سنتے ہیں" تو نمبر دار نے کہا:

"ہمارے جھیاں کا تو بس ایک ہی منڈا بن بتائے گیا ہے، پر وہ اتنی دور کدھر گیا ہوگا!"

شرفو چار مہینے تک تو نواب شاہ میں نان بابائی کا بھاڑ جھونکتا رہا، پھر گرمی کی تاب نہ لا کر کراچی چلا گیا۔ کراچی میں پہلا دن اس نے سٹیشن پر گزارا، پھر کام کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ شام کو اس نے ڈرگ روڈ کے پاس ایک عمارت بننے دیکھی تو اوپر چڑھتی ٹرائی کا نظارہ کرنے لگا جو سیمنٹ ریت کا ماوا لے کر دوسری منزل پر جاتی تھی اور خالی ہو کر واپس آ جاتی تھی۔ اس عمارت کا چھوٹا ٹھیکے دار ایک پنجابی تھا جس نے ایک چھوٹے سے انٹرویو کے بعد شرفو کا شناختی کارڈ دیکھ کر اس کو دھاڑ پر لگا لیا۔ شرفو کو کراچی کی بڑی بڑی اینٹیں، جسے بلاک کہتے تھے اور کراچی کی پہلی پہلی موٹی ریت دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس کا سفر خر سے اونچا ہو گیا کہ وہ بڑی چیزوں والے بڑے شہر میں آ گیا ہے اور ان کی وجہ سے خود بھی بڑا ہو گیا ہے۔

پورے دو مہینے اس عمارت میں کام کرنے کے بعد شرفو ایک معمولی مزدور سے چھوٹا منشی بن گیا کہ اس نے مڈل پاس کرنے کے ساتھ ورنیکلر فائنل کا امتحان بھی دیا تھا اور وظیفہ حاصل کرنے میں صرف پچیس نمبروں کی کسر رہ گئی تھی۔ جو صاحب اس بلڈنگ کو دیکھنے کے لئے کبھی کبھی آتے تھے، ان کے ڈرائیور کے ساتھ شرفو کا گہرا رانہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ بھی پنجابی تھا اور پنجاب سے آنے والے غریب لوگوں کی مدد کا دم بھرتا تھا۔ سلطان سرگودھے کا رہنے والا تھا اور پچھلے پندرہ سال سے کراچی میں مقیم تھا۔ پہلے پہل اس نے سرگودھے کے اڈے پر پان سگریٹ کی دوکان کھولی لیکن ایک سال پر پیکٹس کے باوجود اس کو پان لگانا نہ آیا اور اس کی بکری گرنے لگی۔ پھر اس نے اسی کھوکھے پر سیخ کباب لگانے شروع کر دیئے لیکن مسالے پر پوری گرفت نہ ہونے کی وجہ سے وہ کبابوں کا سٹینڈرڈ برقرار نہ رکھ سکا اور اس نے یہ کام چھوڑ دیا۔ پھر اس نے چوٹی کے وکیل عبدالستار بیرسٹر کی چوانی اختیار کر لی جن کا دگھنیوں والا رئیس تانگہ شہر کی آبرو تھا۔ ایک روز جب منشی سے اس کی ہتھ پائی ہو گئی تو وکیل صاحب نے اس کو نوکری سے نکال دیا۔ اس عرصے میں سلطان نے تھوڑی بہت ڈرائیوری سیکھ لی تھی۔ وہ خوشاب وین کا کلیز بن گیا اور جس دن ڈرائیور چھٹی پر ہوتا، وہ ڈرائیور کی حیثیت سے ایک پھیرا خود لگا آتا۔ مالک نے اس کی کارکردگی سے خوش ہو کر اسے ایک الگ وین پر لگا دیا، لیکن اڈے میں ایک روز سب کے سامنے چھوٹے تھانے دار سے تھپڑ کھانے کے بعد وہ نوکری بھی چھوڑ دی اور وہ شہر بھی چھوڑ دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک وہ کراچی ہی میں تھا اور پرائیویٹ ڈرائیور کے طور پر اسی خاندان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

ایک روز سلطان نے شرفو کو اپنی کار کے پاس بلا کر پوچھا کہ وہ پرائیویٹ نوکری کرنے پر رضامند ہے تو شرفو نے آگاہی چھ سوچے بغیر ہامی بھری۔ اگلے دن وقت مقررہ پر سلطان اس کو ڈیفنس لے گیا اور صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ حامد علی صاحب نے اپنے کاغذات سے نگاہ اٹھائے بغیر شرفو سے پوچھا "پہلے بھی کہیں نوکری کی ہے؟" اس نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کہا "پہلے کبھی کوئی چانس ہی نہیں ملا سر۔"

چانس کے لفظ پر حامد صاحب نے نظریں اٹھا کر شرفو کو غور سے دیکھا اور کہا "شناختی کارڈ ہے تمہارے پاس؟" شرفو نے اپنا کارڈ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

"یہ جھیاں کہا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"پتوکی کے پاس ہے جناب۔" اس نے اور مودب ہو کر کہا۔

"پتوکی کہاں ہے؟"

"لاہور اور اوکاڑے کے درمیان ہے سر، لاہور سے پچاس میل دور۔"

"تمہارے ماں باپ، بہن بھائی ہیں؟"

"صرف ایک بہن ہے سر، وہ شادی شدہ ہے اور ڈھولن وال میں رہتی ہے۔"

"کتنی مرتبہ چھٹی پر جایا کرو گے؟"

"میرا کوئی ہے ہی نہیں سر۔ میں نے چھٹی پر جا کر کیا کرنا ہے!"

"کتنے پیسے لو گے؟"

"جو آپ دے دیں گے۔"

"ڈاک کا کام کر لو گے؟"

"میں مڈل پاس ہو کر سر، انگریزی پڑھ لیتا ہوں۔ ورٹیکل فائل میں پچیس نمبروں سے میرا وظیفہ رہ گیا تھا۔"

"پندرہ سو روپے ماہوار ملیں گے اور گھر کی دیکھ بھال تمہارے ذمہ ہوگی۔"

"مجھے منظور ہے سر۔"

جب شرفو حامد صاحب کے بنگلے میں اپنا کوارٹر دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کوارٹر کے ساتھ ایک غسل خانہ بھی تھا جس میں لمبی زنجیری والا فلش بھی تھا اور نلکے کے اوپر چھوٹا سا آئینہ بھی تھا۔ اس نے آئینے میں غور سے اپنا چہرہ دیکھا۔ دو مرتبہ مسکرایا اور ایک مرتبہ مسکراتے ہوئے چہرے کو گھر کی دے کر ڈر دیا۔ اب وہ خدا کے فضل سے اور سلچان کی مہربانی سے معزز لوگوں کی فہرست میں داخل ہو گیا تھا۔

اس بنگلے میں کل تین افراد رہائش پذیر تھے۔ ایک حامد صاحب، ایک ان کا نو جوان بیٹا عمیر اور ایک عمیر سے بڑی بہت ہی خو

بصورت بیٹی آسیہ باجی۔ چند دنوں کے بعد شرفو کو معلوم ہوا کہ حامد صاحب کا ایک اور بیٹا بھی ہے جو سب سے بڑا ہے اور ان سے الگ کلفٹن میں رہتا ہے۔ بڑا بیٹا اسمبلی کا ممبر ہے اور اس کی تصویریں اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ اس کو جب بھی فرصت ملتی ہے، اپنے ابا اور بہن بھائی سے ملنے ضرور آتا ہے اور بڑی بڑی لمبی خبریں دے کر جاتا ہے۔

کچھ روز تو شرفو اوپر کام کرتا رہا لیکن ایک روز جب اس نے اخباروں کی Cuttings اور حامد صاحب کی ڈاک متعلقہ فائلوں میں لگائی تو حامد صاحب نے اسے مکمل طور پر اپنے ساتھ نہتی کر لیا۔ حامد صاحب کا ایک سیٹو تھا ابراہار، دیکھنے میں تو لڑکا آتا تھا لیکن اندر سے بالکل لڑکی تھا۔ اس کے ہاتھ، اس کی انگلیاں، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کا انداز بالکل زنانہ تھا۔ پھر ایک مولوی صاحب تھے جو کتابت کا کام کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی، آنکھوں پر سنہری چشمہ، آنکھوں کے اندر سرمہ ارد گرد شرارت، کھلے کھلے مضبوط نتھنے جو دوسانوں میں ہی سارے کمرے کی ہوا اندر کھینچ لیتے تھے، کرخت ہاتھ، موٹی موٹی انگلیاں اور لکڑ ہارے کا سا ڈیل۔ ان کو ایسے ایسے لطیفے آتے تھے جن کو سن کر ابراہار جھینپ جاتا تھا اور شرفو اپنے کوارٹر میں جا کر کاپی پر لکھ کر تکیے کے نیچے رکھ آتا تھا۔

حامد صاحب سارا دن لکھتے لکھتے اور پڑھتے پڑھتے رہتے۔ انگریزی کے مضمون وہ زبانی بول کر لکھاتے تھے۔ اوپر اردو کے ہا تھ سے لکھ کر کتابت کے لئے دیتے تھے۔ ان کے سٹوڈیو میں ہر وقت ولایتی گانوں کی دھنیں بجتی رہتی تھیں۔ وہ ہمیشہ قالین پر اوڑھی لیٹ کر انگریزی رسالوں کی تصویریں دیکھا کرتیں اور جب پینٹ کرتیں تو اپنے مستطیل سٹول پر ایک ٹانگ کی آلتی مار کر دوسری ٹانگ دور باہر کھینچ کے ایک رنگین پیڑھی پر رکھ کر اپنا پاؤں ہلاتی رہتیں۔ کبھی کبھی جب ان کا پاؤں سو جاتا تو وہ شرفو کو بلا کر کہتیں "دیکھنا یا ریہ پیر پھر سو گیا ہے، اسے جگاؤ۔" شرفو پہلے تو اس کی ہلکی سی مالش کرتا، پھر زور کا ٹھولا مار کر کہتا "جاگا کہ نہیں جی؟" تو باجی پاؤں کے حساب سے نہیں، اپنی مرضی کے معاملے سے جواب دیتیں کہ "نہیں۔ تھوڑی سی مالش کرو، ابھی جاگ جائے گا۔" اس جاگنے اور جگانے کے وقفے میں ان کے درمیان کچھ محرمانہ قسم کی گفتگو بھی ہوتی جو زیادہ تر سببی کے گرد گھوما کرتی۔

آسیہ باجی کو سببی قسم کی عورتوں میں بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے آزادی مستورات اور حقوق نسواں کی قسم کی ایک انجمن بھی بنا رکھی تھی جس کی چھوٹی میٹنگیں تو گھر پر ہوتیں لیکن بڑے سیمینار بڑے ہوٹلوں میں ہوتے۔ چھوٹی میٹنگوں میں زیادہ تر میمیں آتی تھیں اور ان کے پاس بڑے بڑے چارٹ ہوتے تھے۔ ان پر بھکارنوں کی، اینٹیں اٹھائے اوڈینوں کی اور گندی نالی کے پاس کپڑے دھوتی عورتوں کی تصویریں ہوا کرتیں۔ ایک تصویر میں ایک عورت پانی کے دو گھڑے اوپر نیچے رکھے ایک ٹیلے سے اتر رہی تھی۔ اس کے پاؤں ننگے تھے اور چہرہ سالو سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس تصویر کے نیچے انگریزی میں ایک موٹا سا فقرہ لکھا تھا جس کے آگے بڑا سا سوالیہ نشان تھا۔

یوں تو ساری میمیں ہی بڑے کھلے کھلے اور موکھے دار لباس پہنتی تھیں لیکن فردینا کراچی کی گرمی سے اتنی بے زار تھی کہ وہ نیکر، کھلے سینڈل اور پیازی چھلکے کے بلاؤز کے سوا اور کچھ بھی نہ پہن سکتی تھی۔ ایک روز جب وہ اپنی تین سالہ بچی کے ساتھ آسیہ باجی کے گھر آئی تو اس نے اٹھنی بھر گول بندیوں والا ایک کچھا اور اسی ڈیزائن کی ایک باڈی پہنی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بچی کی انگلی پکڑے پھونکیں مارتی اور ہونکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے بانیں ہاتھ سے چہرے کو ہوا کرتی ہوئی بولی "میں سوئمنگ پول جا رہی ہوں اور آٹھ میل لمبا چکر کاٹ

کرتیرے پاس اس لئے پہنچتی ہوں کہ تمہیں وہ تصویر دکھا سکوں جس کا میں نے فون پر ذکر کیا تھا۔ "تصویر میں ایک پرانے بیل جیسا ہڈیوں مرد اپنی تغاری بیلچہ پاس رکھے زمین پر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا اور اس کی بیوی سیمنٹ کے خالی تھیلے کو دوہرا، چوہرا، اٹھرا کر کے اسے پنکھا جھل رہی تھی۔

جب شرفو فردینا کے لئے کافی لے کر آیا تو فردینا سامنے تپائی پردوں اور ایڑیاں رکھے آرام کرسی میں لیٹی ہوئی تھی اور آسیہ باجی تصویر سامنے کھول کر اس پر کچی پنسل سے عنوانات لکھ رہی تھیں۔ شرفو نے دیکھا کہ فردینا کا پیٹ عبد و مراٹی کے ڈھول کی طرح تنا ہوا تھا اور اس کی کمر اور پیٹ کے درمیان صرف کھڑے چپے کا فاصلہ تھا۔ اس کی ناف گیان دھیان میں ڈوبے ہوئے سادھو کی آنکھ کی طرح مست تھی جو بھگوان کے ساتھ شست لگا کر بیٹھا ہو۔ شرفو کا دل چاہا کہ ایک چچی کافی اس میں ڈال کر دیکھے کہ پوری سماتی ہے یا باہر چو جاتی ہے لیکن اس کی بیٹی بار بار اس کا ہاتھ جھلا جھلا کر کہہ رہی تھی کہ اٹھو می، سوئمنگ پول چلو اور وہ بار بار جھٹک کر کہہ رہی تھی کہ ٹھرو مجھے کافی پیئے دو۔ پھر فردینا نے انگریزی می ایک جملہ کہا جس کا تعلق لپچائے ہوئے شرفو سے تھا۔ شرفو سمجھے بغیر جھینپ کر باہر نکل گیا۔

عمیر بھائی شاعر تھے اور انگریزی میں نظمیں لکھتے تھے۔ پہلے وہ اپنی نظم آسیہ باجی کو سنانے آتے اور اس پر دیر تک بحث ہوتی۔ پھر وہ حامد صاحب کے کمرے میں جا کر وہی نظم سناتے اور اس پر اور دیر تک بحث ہوتی۔ ابران کی نظمیں ٹائپ کر کے ان کی فوٹو کاپیاں بناتا تھا۔ ایک نظم اپنی فائل میں رکھتا اور دوسری عمیر بھائی کو واپس کر دیتا۔ جب کبھی وہ عمیر صاحب کی نئی نظم کا ترجمہ شرفو کو اور کاتب کو سنانا تو اس کی نسوانی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے اور وہ رندھی ہوئی آواز میں کہتا "بڑی سچی اور حقیقی بات بیان کی ہے عمیر صاحب نے۔ ہماری غریبی کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ سن کر پتھروں کے دل بھی پانی ہو جائیں لیکن حکومت کو کوئی پرواہ نہیں، سب اپنے حلوے مانڈے میں مگن ہیں۔"

حامد صاحب کی بیشتر خط و کتابت یونیسکو کے ساتھ تھی اور ان کے بہت سارے فنڈز وہیں سے آتے تھے۔ ایک روز جب انہوں نے بھورے رنگ کی ایک فائل کے بارے میں سمجھاتے ہوئے شرفو سے کہا کہ داہنے ہاتھ کو الماری کے تیسرے خانے میں موٹی نیلی فائل کے ساتھ پلاسٹک کے زرد کارنر والی فائل اٹھالاؤ تو شرفو نے پورے اعتماد کے ساتھ انگلی اٹھا کر کہا "حقوق انسانی والی والی فائل، بیسک ہیو من رائٹس والی؟" تو حامد صاحب نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر خوش ہو کر کہا "آج سے تمہاری تنخواہ میں پچاس روپے مہینہ اضافہ۔" شاباش! "اور شرفو چھال نکلیں مارتا لہریا گیت گاتا فائل لینے چلا گیا۔

حامد صاحب کے یہاں یوں تو اور لوگ بھی آتے تھے، لیکن ان میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔ اپنے لوگ بھی غریبوں کے مسائل کا ذکر کرتے تھے اور غیر ملکی بھی غریبوں ہی کے مسائل حل کرنے کی ترکیبیں بتاتے تھے۔ ان کے گھر پر مشاعروں کی محفلیں بھی جمتی تھیں اور پوٹری ریڈنگ کے سیشن بھی ہوتے تھے۔ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو ایک ادبی مجلس کا اہتمام ہوتا جس میں دور دراز کے مرد اور عورتیں اکٹھے ہو کر اپنے ملک کے محکوم و مجبور اور خوار و پریشان طبقے کی آواز بن کر گونجتے اور دولت مندوں اور سرمایہ داروں کے سوائے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑتے۔ ایک دبلے پتلے رومی ٹوپی والے بزرگ ملیر سے چل کر آتے تھے اور ان مجلسوں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے تھے۔ یہ کسی طبقے پر

لعن طعن کرنے کے بجائے حکومت وقت کے خلاف نظمیں لکھ کر لاتے تھے اور اپنے دبلے وجود کے ساتھ بڑی گرج دار آواز میں للکار تے تھے۔ مجلس کے کاتے پر جب سب لوگ برف کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں چاندی کے چمٹوں میں پکڑ کر اپنے اپنے گلاسوں میں ڈالتے تو یہ رومی ٹو پی والے ساتھ کے کمرے میں شام کی نماز ادا کرنے چلے جاتے۔ بڑی دیر تک اونچی آواز میں منت و مناجات کرنے کے بعد واپس آتے تو ان کی خالی کرسی کے سامنے چوکور تپائی پر ایک بڑا گلاس لبالب بھرا رکھا ہوتا۔ وہ ہمیشہ آواز دے کر کہتے "بہت زیادہ ڈال دی آپ نے حامد صاحب" اور حامد صاحب ہر مرتبہ دھیمی آواز میں ایک ہی جواب دیتے کہ "جھاگ ہی جھاگ ہے میر صاحب، ابھی بیٹھ جائے گی تو گلاس آدھے سے بھی کم رہ جائے گا۔"

شرفو برف کی ٹکڑیاں مشین سے نکال نکال کر لاتا تھا اور خالی بوتلیں واپس لے جا کر احتیاط سے بند کر دیتا تھا۔ ایسے اچھے دن شرفو کی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ ایک طرح سے وہ حامد صاحب کا راز دار تھا اور ان کی ضرورت کی چیزیں وہی خرید کر لاتا تھا۔ ابراہن اور خانساں دونوں اس کے خلاف ہو گئے تھے، لیکن کھل کر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ کاتب صاحب باتوں باتوں میں حامد صاحب کی ٹوہ لیا کرتے تھے لیکن شرفو پڑھا لکھا نوجوان تھا اس لیے ان کی تہہ دار باتیں خوب سمجھتا اور ہر بار خالی دے جاتا تھا۔ آسیہ باجی کی سیفی کے خصوصی بلیڈ بھی وہی انٹرکان کی پیشل شاپ سے لے کر آتا اور عمیر صاحب بھی اس کو چٹ لکھ کر دیتے تو چھوٹی لفافی کے تین پیکٹ ایک ساتھ لانا اسی کا کام تھا۔ گو عمیر صاحب ہر مرتبہ نئی قسم کا نام لکھ کر دیتے تھے لیکن اس کو سب سے زیادہ وہ لفافی اچھی لگتی تھی جس پر ہونو لولو کی ہلا ہلا ڈانسر کی تصویر ہوتی۔

ایک روز جب فوٹو گرافر اپنے کیمرے اور لائٹس سوز کی وین میں رکھ کر آ گیا تو بارش شروع ہو گئی اور باہر جانے کا شیدول تلپٹ ہو گیا۔ حامد صاحب کا Despath تیار تھا اور اسے ہر حال میں صبح کی پوسٹ سے نکل جانا تھا، لیکن تصویریں تیار نہ تھیں۔ حامد صاحب کی بے قراری غصے میں تبدیل ہو گئی اور انہوں نے اونچے اونچے بولنا شروع کر دیا تو آسیہ باجی اپنے سٹوڈیو سے نکل کر بولیں "اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ڈیڈی، آپ باہر کام گھر پر بھی تو کر سکتے ہیں۔ ہمارا شرفو موجود ہے۔"

"شرفو! حامد نے حیرانی سے پوچھا" وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"وہ سبھی کچھ کر سکتا ہے۔" آسیہ نے اعتماد سے کہا اور شرفو کو اس کے کوارٹر سے بلا لائی۔

شرفو کی پرانی قمیض پھاڑ کی اس کے گلے میں لٹکا دی گئی۔ سر کے بال اوپر اٹھا کر پھوٹی پھوٹی کر کے ان پر ہیر سپرے مارا گیا۔ چہرے پر بوٹ پالش کے نشان ڈالے گئے۔ ایک ہاتھ پر پٹی اور ماتھے پر بوٹ کا تسمیہ باندھا گیا۔ پھر چن چن کر گھر کے ساتے پھٹے پرانے بوٹ اور جوتے اس کے آگے ڈالے گئے۔ وہ برستی بارش میں ٹوٹی ہوئی باڑ کے پاس بیٹھ کر بوٹ پالش کرنے لگا اور فوٹو گرافر نے تین اینگلو سے اس کی تصویریں بنائیں۔ جب آسیہ نے فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے باپ کی طرف دیکھا تو ان کو بدستور ناخوش پایا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں چوری چھپے ہیر و ن فروخت کرنے والوں کا بھی ذکر کیا تھا اور ایسے خفیہ فروش کی تصویر کے بغیر ان کا مضمون نامکمل تھا۔ فوٹو گرافر نے آسیہ باجی کو مخاطب کر کے کہا "میری سوزو کی میں میک اپ کٹ ہے۔ آپ ذرا ٹھہریں، میں لے کر آتا ہوں۔"

فوٹو گرافر کی میک اپ کٹ میں تین قسم کی داڑھیاں تھیں: بڑی، چھدری اور نان پروفیشنل۔ حامد صاحب نے چڑ کر کہا "یہ تو بچوں کے لگانے والی ہیں جو بانسریاں بیچنے والا لاٹھی پر باندھ کر لفٹسٹن سٹریٹ میں بیچا کرتا تھا۔ ان سے کام نہیں چلے گا۔"

فوٹو گرافر نے کہا "میں اس اینگل سے تصویر بناؤں گا حامد صاحب کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اصلی ہے یا نقلی؟"

آسیہ باجی نے تینوں داڑھیوں کو غور سے دیکھا اور ان میں سے ایک کو پسند کیا۔ فوٹو گرافر نے کہا "یہ ٹھیک نہیں باجی، یہ تو مولویوں کی داڑھی ہے۔ اس کے بجائے یہ لگائیں، ڈاکو داڑھی۔"

لیکن آسیہ نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا "یہی لگائیں، یہی مناسب ہے۔ ہمیں ان کے خلاف بھی تو دیدھ کرنا ہے۔" اپنی بیٹی کی اس بات پر حامد صاحب خوش ہو کر بولے "بالکل ٹھیک ہے، یہ لمبی داڑھی ہی چلے گی۔"

جب شرفو کو داڑھی لگا کر اور چہرے پر پیلا پینٹ چڑھا کر اسے کوارٹر کی پلستر اتری دیوار کے کونے پر کھڑا کیا گیا تو وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ حامد صاحب نے کہا "میاں اشرف الدین تم کو چوری چھپے منشیات فروخت کرنے والے کا پارٹ ادا کرنا ہے اور اپنے چہرے کو ایسے چوکنہ رکھنا ہے جیسے چھاپہ مار پارٹی کی آہٹ پر مجرم ہوتے ہیں۔" تو شرفو کی باچھیں گھل گئیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر فوٹو گرافر کی طرف دیکھا اور کہا "اتاریں فوٹو۔"

فوٹو گرافر نے کیمرہ فوکس کیا تو شرفو نے دونوں آنکھوں میں ایسا بھینگ ڈالا اور اپنی ناک کا بانسہ ایسے مروڑ کر اس کی شکل دیکھتے دیکھتے ڈاکٹر جیکل سے مسٹر بائیڈ میں تبدیل ہو گئی۔ داڑھی میں پانی کے قطروں نے گھونسل بنا کر اسے چھدرہ ہونے سے بچا لیا اور شرفو کی مڑی ہوئی گردن نے اسے نان پروفیشنل سے پروفیشنل داڑھی بنا دیا۔ ایک، دو، تین فلیش چلے اور حامد صاحب نے آگے بڑھ کر شرفو کو اپنی بائیں طرف منہ کر کے لے لیا۔

آسیہ نے اپنی جینز سے چمٹے بارش کے قطروں کو جھاڑ کر کہا "آپ ایسے ہی نہ پریشان ہو جایا کریں ڈیڈی۔ جب ہم ہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔" پھر وہ اندر چلی گئی اور فوٹو گرافر جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

پورے دو سال اور تین مہینے بعد جب گمشدہ شرفو واپس چھیاں آیا تو گاؤں میں جشن کا سماں ہو گیا۔ بوڑھے، مرد، عورتیں، جوان سال ساتھی اور چھوٹے بچوں نے اس سے لگ کر آنے والی ہواؤں سے بھی باتیں شروع کر دیں۔ وہ ایک بڑے سے تھیلے میں روپے روپے، ڈیڑھ ڈیڑھ روپے اور کچھ دو دو روپے والے کوئی سو سو سو تھپے لے کر آیا تھا۔ جس گھر میں بھی سلام کرنے جاتا، ایک تحفہ نکال کر دے دیتا اور اگلے گھر خبر پہنچ جاتی کہ شرفو ادھر بھی آنے والا ہی ہے۔ منتظر گھر کا سارا کام چھوڑ کر چپ چاپ، دم سادھے اس کے انتظار میں دروازے کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے اور وہ سعودی عرب کے بادشاہ کی طرح تمنے تقسیم کرتا گھر گھر گھومتا جاتا۔ سارے گاؤں والے شرفو سے بس دو ہی سوال کرتے تھے کہ کس کام پر لگے ہو اور کتنی چھٹی آئے ہو؟ چھٹی کے بارے میں تو وہ بتا دیتا کہ صرف پندرہ دن کی چھٹی ملی ہے، لیکن کم کی بابت خاموش رہتا۔

کمد کے کھیت میں کھڑے کھڑے ربی نے کوئی سو مرتبہ اس سے پوچھا کہ اس کو کہاں نوکری ملی ہے اور وہ کیا کام کرتا ہے تو شرفو ہر

مرتبہ کبھی ہنس کر، کبھی مسکرا کر اور کبھی چونڈی کاٹ کر اس کی بات ٹال دیتا۔ تھوڑی دیر بعد ریتی کو پھر دیا داتا تو وہ دھمکا مار کر پوچھتی "مرجا نیاں! بتا تو سہی تیری نوکری کس کام کی ہے؟" تو شرفو ہنس کر جواب دیتا "اوائے بتایا تو ہے کہ کاروبار کی نوکری ہے، سرکاری نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ریتی کہتی "سرکار تو کراچی میں ہے ہی نہیں، سارا کاروبار ای کاروبار ہے۔ پر تیرا کاروبار کس قسم کا ہے؟" اس پر یاسین چوکیدار کا کتا بھونکنے لگتا اور اس کی آواز قریب آنے لگتی۔ جب اس کی آواز اور یاسین چوکیدار کا کتا بھونکنے لگتا اور اس کی آواز قریب آنے لگتی۔ جب اس کی آواز اور یاسین کی لکار بہت ہی قریب آگئی تو دونوں کما دے کھیت سے نکل گئے۔ ایک مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی اور!

رات کو جب سارے لوگ نمبردار کے کوٹھے میں جمع ہوئے تو انہوں نے شرفو اور نمبردار کو تو چار پائی پر بٹھالیا اور باقی سب ان کے ارد گرد زمین پر بیٹھ گئے۔ نمبردار نے کہا "شرف دین یہ تو پرہ چل گیا ہے کہ تو پندرہ دن کی چھٹی پر آیا ہے اور ہمارے حساب سے یہ بہت تھوڑی ہے۔ پر تو نے یہ نہیں بتایا کہ تو کام کیا کرتا ہے؟"

"کراچی میں کرتا ہوں چاچا!" شرفو نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"او بھائی کراچی میں تو کرتا ہے اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے گاؤں کا پہلا آدمی کراچی تک پہنچ گیا پر سو ہنیا پتر اتونے یہ نہیں بتایا کہ وہاں کیا کام کرتا ہے۔"

"بس یہی چاچا! کاروبار، تجارت۔" شرفو نے منہ لپا کر کے جواب دیا۔

"کاروبار کی بھی تو ہزار قسمیں ہیں شرفو! حسنے تیلی نے کہا "تو کون سا کام کرتا ہے؟"

"میں تو کوئی کام نہیں کرتا، میرا صاحب کرتا ہے اور میں اسی کا ملازم ہوں۔"

"وہ تو ہمیں تیرے ٹھاٹ باٹ سے ہی پتہ چل گیا ہے بھائی کہ کوئی اچھی نوکری مل گئی ہے، پر یہ نوکری ہے کس شے کی؟"

"میرے صاحب کا بڑا لمبا کاروبار ہے۔ اپنے ملک میں بھی چلتا ہے اور باہر ولایت میں بھی۔" شرفو نے فخر سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے کا کا۔" نمبردار نے کہا "بڑا کاروبار ساری دنیا میں ہی چلتا ہے اور اسی وجہ سے بڑا ہوتا ہے کہ پوری دنیا میں چلتا

ہے لیکن وہ کاروبار ہے کیا؟"

ذرا سا توقف دے کر شرفو نے کہا "ہم غربی بیچتے ہیں۔"

"غربی!" سب نے یک زبان ہو کر کہا اور ہر شخص الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک کوٹھے میں خاموشی چھائی رہی اور کسی کو سوال

کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

اپنے مال پسو جیسے لوگوں کو اس طرح بھونچکے بیٹھے دیکھ کر شرفو نے کہا "اس وقت یہ دنیا کا سب سے بڑا کاروبار ہے چاچا اور اس کے

زور پر بڑی بڑی بادشاہیاں چل رہی ہیں۔"

"بادشاہیاں! غربی کے زور پر چل رہی ہیں؟" نمبردار نے حیران ہو کر پوچھا تو حسنے تیلی نے کھلے ہاتھ کی ڈگڈگی کے انداز میں ہلا

کر کہا "بڑے شہر جا کر پیچ ڈھیلا کروالیا ہے میرے یار نے۔ اوئے کبھی بادشاہی غریبی کے سہارے بھی چلی ہے اس دنیا میں۔" شرفو نے کہا "اب چل رہی ہے اور آئندہ بھی کئی سوسال تک اسی کے سہارے چلتی رہے گی۔"

حسنا تیلی کوئی بات کئے بغیر محفل سے اٹھ کر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نمبردار نے پھر کہا "اوئے کوئی عقل کی بات کر یار۔ کبھی موم بتی ہوا کے زور پر چلی ہے، لہو تلوار کی کاٹ سے رکا ہے، مینا بگھیاڑ کی پالنا سے پلا ہے۔"

"بڑے شہر کے بڑے لوگوں میں بڑی عقل ہے چاچا۔ وہ تو مٹی کو سونا کہہ کر بیچ لیتے ہیں، غریبی تو پھر بڑی قیمتی چیز ہے۔" غریبی قیمتی چیز ہے! "تین چار آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

"میرا صاحب غریبی بیچتا ہے اور بہت مہنگے بھاؤ بیچتا ہے۔ یہاں بھی بکتی ہے اور ولایت میں بھی۔ ادھر بھی اس کے آرڈر بک ہوتے ہیں اور دس اور بھی یہ مال جاتا ہے۔"

نمبردار حسنے تیلی کی طرح اٹھ کر گیا نہیں پر خاموش ہو گیا۔

شرفو نے کہا "چاچا لاری کس کے زور پر چلتی ہے؟"

"پٹرول کے زور پر۔" یاسین چوکیدار بولا۔

"اسی طرح حکومت غریبی کے پٹرول سے چلتی ہے۔" شرفو نے کہا "اور موگھا کس کے زور پر چلتا ہے؟"

"پانی کے زور پر۔" نور اکھنکار کر بولا۔

"اسی طرح بادشاہی غریبی کے بیان کی شہ چلتی ہے۔ غریبی کو پھوک نہ بھرو تو حکمرانی کا پہیہ ٹائٹ ہی نہیں ہوتا۔"

"اوئے تو ہوش میں تو ہے کا کا۔" نمبردار نے فکر مند ہو کر کہا "غریبی بک سکتی تو ہم سے زیادہ مال دار اور کون ہوگا اس دنیا میں۔"

"اپنے گاؤں سے تو چاہے ٹالیاں بھر بھر کر لے جاؤ غریبی دن رات، یہ جنس ختم ہی نہیں ہو سکتی۔" نور نے کہا۔

"ہم سے کروا سودا گریبی کا۔" نمبردار نے کہا "ہم ساری عمر کی سپلائی دے سکتے ہیں، بے حساب۔"

شرفو نے ہنس کر کہا "چاچا جس طرح تم اپنی جنس ڈائریکٹ منڈی میں نہیں بیچ سکتے اسی طرح تم اپنی غریبی بھی دنیا کی مارکیٹ میں

نہیں بیچ سکتے۔ اس کے لئے آڑھتی کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے، ہم آڑھت دینے کے لئے تیار ہیں۔" نمبردار نے کہا۔

"لیکن اس جنس کا آڑھتیا مال لے کر تم کو کچھ نہیں دے گا۔ ساری آمدن آڑھت میں ہی کاٹ لے گا۔" شرفو نے کہا "منظور ہے یہ

سودا؟"

"تو پھر ہمیں کیا فائدہ ہوا؟ نمبردار نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس کاروبار میں تو پھر اسی طرح سے ہوتا ہے چاچا!"

چاچے نے آرہتے کو ایک گندی گالی دی اور اس کا بڑھا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ پھر اس نے آنکھیں میچ کر پوچھا "کتنا کو منافع ہو جاتا ہے اس کاروبار میں؟"

"منافع!" شرفو نے ہنس کر کہا "منافع چاچا! اس کاروبار میں!! اس میں منافع بھی ہوتا ہے اور ساتھ تخت اور تاج بھی ملتا ہے۔ بگل، نقارہ، سجدہ سلامی بھی ملتی ہے اور پوچا پاٹ بھی ہوتی ہے۔"

"پوچا پاٹ کس کی؟" نمبردار نے غصے سے پوچھا۔

"آڑھتے کی چاچا، اور کس کی!"

"تو تیرے صاحب کو بھی ملی کوئی گدی کہ خالی منافع ہی کما رہا ہے؟" دو لو کہہ رہی مرتبہ بولا۔

"اس کے بڑے بیٹے کو گدی ملی ہے اور میرا صاحب اور اس کے دو بچے منافع کما رہے ہیں۔"

"اور یہ سب غریبی بیچ بیچ کر ہوا ہے؟" نمبردار غصے سے غرایا۔

شرفو ہنسنے لگا اور اس نے چاچا نمبردار کے اس مکر رسوال کو قابل اعتناء نہ سمجھ کر ہنستے ہوئے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیا۔

نمبردار غصے میں تملایا، گالیاں بکتا اپنے ہی کوٹھے سے نکل کر باہر چلا گیا اور باقی سارے لوگ سی طرح بیٹھے رہ گئے۔

یہ بات سارے گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ شرفو جس کارخانے میں کام کرتا ہے وہاں غریبی کا کاروبار ہوتا ہے اور غریبی بیچ کر شرفو کے مالک نے کراچی شہر کے اندر سمندر کے کنارے کوئی ڈیڑھ مربع زمین خرید لی ہے۔ اس زمین پر بلڈنگیں بنا کر وہ امیر لوگوں کو بیچتے ہیں اور نفع کماتے ہیں۔ اس کا بڑا بیٹا غریبی کے ذکر اذکار سے ہی اسمبلی کا ممبر بن گیا ہے اور اس نے کلفٹن پر ہرے پتھر کا بہت خوبصورت بنگلہ بنایا ہے جس میں انیس نوکر ہر قسم کی خدمت پر ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

دوپہر کے وقت جب یہ خبر ریتی کو پہنچی تو اسے یقین ہو گیا کہ گاؤں والوں نے شرفو کو بدنام کرنے کے لئے یہ خیراڑائی ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ شرفو جو گاؤں کے بچے بچے کے لئے تحفے لے کر آیا تھا جس نے گھر گھر جا کر سب کو سلام کیا چھوٹوں کو گود میں اٹھا کر پیار کیا، بڑوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر ان سے دعائیں لیں وہی شرفو اب سب کی نگاہوں کا کھٹکنا رخا بن گیا ہے اور لوگوں نے اس کے بارے میں گند پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ ریتی اپنے گھر سے نکلی۔ دوپٹہ کس کر سر اور چہرے کے گرد لپیٹا اور شرفو کی تلاش میں گاؤں کی گلیوں میں گھومنے لگی۔ شرفو دینے سبزی فروش کے چوترے پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا اور دیئے کو رنگ دار تصویریں دکھا رہا تھا جس میں کہیں کہیں وہ بھی نظر آتا تھا۔ ریتی نے قریب آ کر دینے سے کہا "کل والا ایک کھیر بالکل کڑوا رہا تھا، میں اس کے بدلے میں دوسرا لینے آئی ہوں۔"

ریتی نے کھیرالیا، انگلیوں کے پٹاخے نکال کر شرفو کو سگنل دیا اور چپ چاپ وہاں سے چل دی۔

جب وہ ایک دوسرے سے الگ مڑھویوں کے پاس پہنچے جہاں حلال خوروں کا ہڈیاں صاف کرنے کا مردار خانہ کا رخا تھا تو ریتی چری کے کھیت میں داخل ہو کر پہلے تو بیٹھی اور پھر بیٹھی بیٹھی چل کر اس کھولے میں پہنچ گئی جس میں چگاڑی رہتی تھیں۔ شرفو نے گندی زمین

پر چوکڑی مار کر ریتی کو اپنی جھولی میں بٹھالیا اور اس کے چہرے سے دوپٹہ ڈھیلا کر کے بولا ”کیا بات ہے؟ تو بہت گھبرائی سی ہے۔“
 ریتی نے درد بھرے لہجے میں کہا ”گاؤں والوں نے تیرے برخلاف باتیں کرنی شروع کر دی ہیں کہ تو جس کا خانے میں کام کرتا ہے وہاں غریبی نیچتے ہیں اور غریبی کا کاروبار کرتے ہیں۔“
 ”پھر؟“ شرفو نے مسکرا کر کہا۔

”پھر کیا؟“ ریتی نے پہلو بدل کر کہا ”یہ کوئی عقل کی بات ہے۔ بھلا کوئی غریبی بھی بیچ سکتا ہے اور کوئی مور کھا ایسا بھی ہو سکتا ہے جو غریبی خرید کر گھر لے جائے۔“
 شرفو نے ہنس کر کہا ”یہ بات نہ ریتے گاؤں والے سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی تیرے بھیجے میں آ سکتی ہے لیکن غریبی سچ مچ بکتی ہے اور بڑے مہنگے بھاؤ بکتی ہے۔ میرے صاحب کا یہی کاروبار ہے۔“
 ریتی تڑپ کر شرفو سے الگ ہو گئی اور اس کے سامنے ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ گاؤں والے ٹھیک کہتے ہیں۔ شرفو کا دماغ چل گیا ہے۔

تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ پھر شرفو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ”دیکھ ریتی! ایک تو وہ سوداگر ہیں جو منڈی میں کھیت کھلیان کی جنس بیچ کر روپیہ کماتے ہیں اور دھن دولت جوڑ کر رکھتے ہیں۔ اس کو تو تم جانتی ہو۔ یہ سیٹھ مشہور نہیں ہوتے اور اپنی منڈی تک ان کا نام ہوتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ کچھ سیٹھ ایسے بھی ہیں جو سارے ملک میں مشہور ہیں بلکہ ملک سے باہر بھی مشہور ہیں۔ ان کے نام ہر روز اخباروں میں چھپتے ہیں اور ع ولایت کے ریڈیو بولے جاتے ہیں۔ یہ چھوٹے سیٹھوں کی طرح گندم، مکئی، باجرے، کپاس کا کاروبار نہیں کرتے بلکہ یہ صرف غریبی کا کاروبار کرتے ہیں اور لوگوں کے دکھ فروخت کرتے ہیں۔“
 ”لوگوں کے دکھ فروخت کرتے ہیں؟“ ریتی نے دکھ پر زور دے کر کہا۔

شرفو نے کہا ”جب تک یہ لوگوں کے دکھ اور لوگوں کی غریبی نہ نیچیں، ان کا کاروبار آگے نہیں بڑھتا اور ان کی نیک نامی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے ان کی نیک نامی بڑھتی ہے، ویسے ویسے ان کے کاروبار میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بڑی زبردست تجارت ہے اور ساری دنیا میں اس کا مانگ ہے۔“

”ساری دنیا میں؟“ ریتی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہندوستان تو اس سے اربوں روپے زرمبادلہ کے طور پر کماتا ہے۔ وہاں ایسی ایسی فلمیں بنتی ہیں جن میں لوگوں کے رنگارنگ دکھوں کی اور ان کی غریبی کی شدہ کہانیاں ہوتی ہیں۔ ولایت کے سوداگران فلموں کو بڑے مہنگے بھاؤ خریدتے ہیں اور پھر آگے اس سے بھی مہنگے بھاؤ پر فروخت کرتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں تیرے سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“
 ”تو تیرا صاحب بھی یہی کام کرتا ہے!“ ریتی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں۔“ شرفو نے سنجیدگی سے کہا ”کرتا تو ہے پر اس کا کاروبار اتنا بڑا نہیں ہے۔ نیچتے ہم بھی غریبی ہی ہیں، لیکن لاکھ سو لاکھ

روپے مہینہ سے زیادہ نہیں کھاتے۔"

"لاکھ سوا لاکھ!" رتبی نے یہ ہندسہ سنا تو تھا لیکن اس کے صحیح پھیلاؤ سے ناواقف تھی۔ کچھ دیر وہ ٹکٹکی باندھے شرفو کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اسے یقین ہونے لگا کہ شرفو کا دماغ ہلا نہیں ہے، اپنی جگہ پر قائم ہے لیکن وہ بدل گیا ہے۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ برا اب بھی نہیں ہے لیکن بدل گیا ہے۔ پھر اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا "اشرف! تمہاری منڈی میں لوگ اپنی اپنی غربی خود بیچنے آتے ہیں یا آڑھے کے گماتے گاؤں گاؤں جا کر جنس خرید کے لاتے ہیں۔"

شرفو نے ہنس کر کہا "یہ بات بڑی باریک ہے رتبی اور تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کو دفع ہی کر۔"

"دفع کیسے کر دوں۔" رتبی تنک کر بولی "میری ماسی کریمو کی غربی کی تو اگر آدھی بوری بھی بک جائے تو سارے گاؤں کو بھاگ

لگ جائیں۔۔۔ ہینڈ پمپ لگ جائے، مسجد پکی ہو جائے، ان کے کوٹھے کی چھت پڑ جائے۔"

"او میرے سوہنے کڑیے!" شرفو نے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کی طرح لہک کر کہا "ہم یہ جنس بوریوں میں بھر کر نہیں بیچتے نہ ہی ان

جنس کے مالک اسے منڈی میں فروخت کرنے کے لئے لاتے ہیں۔ یہ سارا کاروبار سٹے کا ہے۔ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ سٹے کیا ہوتا ہے اور اس میں لینا دینا کس حساب سے چلتا ہے۔ بس تم اتنا جان لو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ ٹھیک ہے اور میں تم سے جھوٹ نہیں بولتا۔"

رتبی نے چڑ کر کہا "مجھے سو بار سمجھ نہ آئے، ہزار بار نہ آئے پر تو مجھے بتا کے جا۔ نہیں تو میں شور مچا دوں گی۔"

شرفو نے ہنس کر کہا "سٹے کے کاروبار میں جنس نہیں بکتی، جنس کا نام بکتا ہے۔۔۔ کپاس نہیں ہوتی، کپاس کا نم بکتا ہے کہ اس بھاؤ پر

اتنی گانٹھیں لیتے ہو؟ لیتا ہوں۔ کل کی تیس ہزار گانٹھیں اسی بھاؤ پر بیچتے ہو؟ نہیں بیچتا۔ برسوں جو بھاؤ کھلے گا، اس پر لاکھ گانٹھ لوگ؟ دو لاکھ گانٹھ کا سودا کرو، لے لوں گا۔ تو میری پیاری رتبی اسی طرح غربی بھی سٹے کا کاروبار ہے۔ اس میں جنس تو ہوتی ہے، لیکن کوئی اٹھاتا نہیں۔ سیٹھ

صرف اس کا نام اٹھاتا ہے اور صرف نام کا کاروبار کرتا ہے۔ سٹے کا کاروبار فون پر ہوتا ہے۔ غربی کا کاروبار ریڈیو مائیکروفون، ٹی وی

کیمرے اور اونچی سیٹج پر ہوتا ہے۔ یہ جنس صرف ذکر اذکار اور بول پنک کے زور پر فروخت ہوئی ہے۔ جس کا ذکر اذکار خوبصورت اور بول

پنک سوہنا ہوگا، وہی زیادہ قیمت پائے گا۔ غربی بیچے گا اور بادشاہ بن جائے گا۔"

رتبی کا سارا دماغ چھاؤ ماؤں ہو گیا اور اس کے اندر جنس جوانی کی ساری حدت ٹھنڈی پڑ گئی۔ وہ شیشم کے سوکھے ہوئے ٹھنڈے کی

طرح شرفو کے سامنے بیٹھی تھی اور اس کا سارا سر سوکھ چکا تھا۔ وہ جواب بھی اس نے شور مچانے کی دھمکی دی تھی تو وہ بھی سہم کر اس کی کوکھ سے

چمٹ گئی تھی۔ اب اس کے پاس کہنے، سننے اور بولنے کی کوئی بات نہ رہی تھی۔ شرفو بھی ٹھیک کہتا تھا اور گاؤں والے بھی سچے تھے اور دونوں

سچوں کے درمیان ٹکراؤ کا اندیشہ بڑھ رہا تھا۔ رتبی کے چھوتے سے سر میں بے وقوفی کے گھونسلے سے ایک احمق خیال نے سر نکالا کہ جھوٹ

اور سچ کا تو کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوتا لیکن جب دو سچ آپس میں ٹکراتے ہیں تو بڑا دیدھ ہوتا ہے اور بڑا جانی نقصان ہو جاتا ہے۔ اس نے بے

چارگی سے شرفو کی طرف دیکھا اور ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل گئی۔

اگلے دن کوئی دس سوا دس بجے شرفو سو کر اٹھا۔ جلدی سے اپنے گھڑی دیکھی۔ چھلانگ مار کر بستر سے ابھرا اور جلدی جلدی پمپ

پہن کر کما د کے کھیت کی طرف بھاگا جہاں ریتی نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جس وقت وہ وہاں پہنچا، اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دو شہری نوجوان بیٹل ڈریس قسم کا لباس پہنے شکار کی تلاش میں وہاں گھوم رہے تھے۔ شرفو نے کما د کے اندر، ارد گرد، آس پاس سب جگہ نظر دوڑائی لیکن اسے ریتی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اسے یقین تھا کہ ریتی آکر اور لمبا انتظار کر کے واپس چلی گئی ہے اور اب اس کے دوبارہ آنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس نے گاؤں واپس جانے کا ارادہ باندھا تو دور نیا نیوں میں اسے گاؤں کے لوگوں کا ایک غول نظر آیا جس کی قیادت چاچا نمبر دار کر رہا تھا۔ شرفو کو نیا نیوں سے اوپر کناے پر کھڑا دیکھ کر ان کے قدم تیز ہو گئے اور وہ جلدی جلدی اس کی طرف بڑھنے لگے۔ شرفو نے ہوا میں بازو لہرا کر ان کا سوا گت کیا تو ہسنے تیلی نے لکار کر کہا "اب اگر اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو اسی جگہ کھڑے رہنا۔" شرفو کا لہراتا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا تو غول میں سے آواز آئی "اوئے ہماری غریبی کی جنس بیچنے والے کتے، اپنا بچاؤ کر سکتا ہے تو کر لے۔ اپنی سنبھال کر سکتا ہے تو کر لے۔ آخری موقع ہے، پھر تیری لوتھ ہی تیرے صاحب کے پاس کراچی جائے گی۔"

اب شرفو کو کچھ سمجھ آئی کہ ان للکاروں جیکاروں کا مخاطب وہی ہے۔ وہ اونچی آواز میں گلا پھاڑ کر پکارا "چاچا!" اور چاچے نے اتنی ہی اونچی آواز میں اسی طرح پکار کر کہا "بہن کے یارا، اپنی ماں کے دلالا! ابھی پتہ لگ جاتا ہے چاچا تیرے ساتھ کیا کرتا ہے۔" پھر بلمیں ہلکولے، تلواریں اور برچھیاں ہوا میں بلند ہوئی اور غول تیزی سے اس کی طرف بھاگا۔ وہ عجیب عجیب طرح کے نعرے مار رہے تھے اور بھاگتے ہوئے گھوڑوں کی طرح دھول اڑا رہے تھے۔ شرفو خوف زدہ ہرنی کی طرح ان کے نرغے کے آگے بھاگنے لگا اور زور زور سے "بچاؤ بچاؤ" کے نعرے مارنے لگا۔ اس کی بلبلاہٹ سے بھرے کرب ناک نعرے سن کر دونوں شکاری مڑے اور انہوں نے بلوائیں کو نیا نیوں سے اوپر چڑھتے دیکھا۔ اس خوف ناک چارج کو دیکھ کر ایک شکاری نے ہوا میں فائر کیا تو کچھ نیزے ہوا میں لہراتے ہوئے ان کے قریب آکر گرے۔ دونوں شکاری اپنی جیب کی طرف بھاگے۔ جیب کے اندر شرفو گھس آیا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دونوں شکاری چھلانگیں مار کر اپنی سیٹوں پر جا بیٹھے۔ جیب سٹارٹ کی اور ہوا میں فائر کرتے ہوئے ہل چلے کھیت میں جیب دوڑانے لگے۔ بلوائی اپنی چادریں اور تہہ کھول کر ان کی طرف بھاگے، لیکن ان کے اور جیب کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا اور بہت پیچھے رہ گئے۔ بے چارہ شرفو پندرہ دن کی چھٹی پر آیا تھا، لیکن دو ہی دن اپنے گاؤں میں گزار کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واپس کراچی چلا گیا۔

Virtual Home
for Real People

بٹیر باز

بابولطیف جس روز نوکری سے رہا ہو کر اپنے گھر آیا تو اس نے شام کی ہانڈی خود پکائی اور گرم مسالے میں کچھ مسالے ایسے بھی ڈالے جو صرف عطاری کی دوکان سے حاصل کئے جاسکتے تھے۔ آپاشیداں نے جب اپنے شوہر کے ساتھ مل کر اس کا بنایا ہوا جعفر تاول فرمایا تو اس کو وہ شام یاد آگئی جب وہ کوٹھے پر کھڑی اپنے دونوں ہاتھوں سے بالوں کا جوڑا کھول رہی تھی۔ کسی ٹوٹ مرنے نیچے سے اتنے زور کارو ڈا پھینکا کہ اس کے منہ میں پکڑی ہوئی ساری پینیں پروانوں کی طرح اڑ گئیں اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آج بابولطیف کی ہانڈی کھا کر بھی اس کے دونوں ہونٹ سو ج گئے تھے اور ان میں چلوں چلوں ہونے لگی تھی۔

بابولطیف نے کہا "منجی کسنے کا فن اللہ بخشے میرے نانا جی نے سکھایا تھا۔ ایسی کمال کی منجی کستے تھے کہ درمیان میں بان کی ایک موٹی سی لہر ابھر آتی تھی۔ ہم دسویں جماعت میں اس لہر پر اپنی ران چڑھا کر سوتے تھے۔ بہت ہی اچھی نیند آتی تھی۔"

ریٹائر ہو چکنے کے فوراً بعد، ساری رات گزار کے، بابولطیف نے اپنے کوارٹر کے لان میں تین ڈنڈ نکالے اور چوتھے پر گوڈا ٹیک گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس کی بیوی باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی تھی اور سونے کی چوڑیاں ہٹا کر اپنی بانہہ کھج رہی تھی۔ بابولطیف نے لان سے پکار کر کہا "یہ انگریزی کے ڈنڈ نکالنے کا طریقہ ہے۔ تین مرتبہ وہ سیدھے ڈنڈ نکالتے ہیں اور چوتھے میں گوڈا لگا کر اٹھتے ہیں، ہمارے قصبے کے پادری صاحب اسی طرح ورزش کیا کرتے تھے۔ یہ جسم سڈول رکھنے کا سب سے اعلیٰ طریقہ ہے۔" جتنی دیر میں آپاشیداں نے اپنی دونوں باہیں کھجا کر لال سرخ کر لیں، اتنی دیر میں بابولطیف اپنی ورزش ختم کر کے آ گئے۔

اپنی ریٹائرمنٹ کے ایک ہفتہ بعد بابولطیف نے مسجد میں جا کر نماز پڑھنی شروع کر دی اور پرانے نمازیوں کو یہ سمجھانے لگا کہ نماز دراصل ایک ڈسپلن ہے اور ڈسپلن سے ہی سارا کاروبار چلتا ہے۔ جس دفتر میں ڈسپلن نہ ہو، اس میں رشوت اور سفارش عام ہو جاتی ہے اور لوگوں کے کام بند ہو جاتے ہیں۔ نوکری کے زمانے میں آدمین باقاعدگی سے نماز تو نہیں پڑھ سکتا البتہ اگر وہ ڈسپلن پر قائم رہے تو ایک طرح سے اس کی نماز ادا ہوتی رہتی ہے۔

جب بابولطیف کی ریٹائرمنٹ کو پورا ایک مہینہ گزر گیا اور پہلی کوا سے تنخوااں نہ ملی تو وہ گھبرا کر اپنے گھر کے کمروں میں گھومنے لگا۔ پہلے اس نے کلاک اتار کر اس کو اچھی طرح سے صاف کیا، پھر ہلتی ہوئی میز کے پائے تلے باہر سے لا کر ایک ٹھیکرے رکھی، شیشے کے سارے

گلاس دھو کر انہیں سفید تو لئے سے خشک کیا، ایک اگر بتی سلگا کر بڑے کمرے میں رکھی اور باہر سے اپنی نیم پلیٹ اتار کر اندر لے آئے۔ قیمہ پینے کی مشین کئی سال سے جم کر یک جان ہو گئی تھی، بابولطیف نے اس کے بڑے سوراخ میں سرسوں کا تیل ڈال کر اسے رواں کرنے کی کوشش کی تو اس کے دونوں گھٹنے چھل گئے۔ مشین ایک طرف رکھ کر اس نے دونوں گھٹنوں پر برنول لگایا اور پنکھا تیز کر کے اپنی دھوتی میں ہوا بھرنے لگا۔

دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو اس نے بنک جا کر پوچھا تو ابھی اس کی پنشن کی رقم کھاتے میں جمع نہیں ہوئی تھی۔ بابولطیف نے ایک گالی بنک کو، دواے جی آفس کو اور تین گالیاں بابو خیر دین کو دیں۔ پھر اس نے اپنے حساب سے پانچ سو کی رقم نکلوائی اور سیدھا یوٹیلیٹی سٹور چلا گیا۔

شام کو اخبار پڑھتے ہوئے اس نے رشیداں سے کہا کہ اگر ہمارے بھی بچے ہوتے تو اس وقت جوان ہو چکے ہوتے۔ ایک آدھ کی شادی ہو چکی ہوتی، دو تین ابھی کالج میں پڑھ رہے ہوتے، کسی کو نوکری بھی مل گئی ہوتی۔ رشیداں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور پیڑھی پر بیٹھ کر اپنے ناخن کاٹتی اور ان پر ریتی مارتی رہی، پھر اس نے نیل پالش کی شیشی کھولی اور اپنے ناخن رنگنے لگی۔ رشیداں، بابولطیف سے کوئی پندرہ سال چھوٹی تھی اور بچہ نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک پوری جوان تھی۔ اس کے بال لمبے اور قد ذرا سا چھوٹا تھا لیکن میلا دکی محفلوں میں جب وہ کھڑی ہو کر سلام پڑھتی تو دراز قد بیگمات اس سے چھوٹی نظر آنے لگتیں۔ اس کی آواز کھلی اور دہانہ تنگ، کندھے بھرے بھرے اور جسم کی خوشبو خوشگوار تھی۔ اس نے نیل پالش کا برش روک کر بڑی دیر کے بعد پوچھا "ابھی تم کیا کہہ رہے تھے لطیف؟"

"کچھ نہیں" لطیف نے اخبار ایک طرف کر کے اس کی طرف دیکھا

"ابھی تم ہمارے بچوں کی بابت کچھ کہہ رہے تھے؟"

"اچھا وہ! وہ تو ایسے ہی میرا خیال تھا۔"

"ایسے خیال دل میں نہ لایا کرو، یہ اللہ کی حکمت ہے۔"

"اللہ کی حکمت تو ہے لیکن ایسے خیال خود بخود دماغ میں آ جاتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ اولاد ہوتی تو شاید ہمیں پریشان کرتی، دکھ دیتی، بدنام کرتی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن اولاد کا ایک سہارا بھی ہوتا ہے۔"

"سہارا بھی ہوتا ہے اور دل بھارا بھی ہوتا ہے۔ ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں، اللہ نے ہمیں اور سب کچھ جو دے رکھا ہے۔"

تھوڑی دیر بابولطیف خاموش رہا، پھر کہنے لگا:

"دراصل میرے مادے میں جرثومے نہیں ہیں۔"

"یہ تو تم پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکے ہو۔"

"میں نے پچھلے سال پھر ٹسٹ کروایا تھا تو ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ویسے تو تمہاری صحت بالکل ٹھیک ہے لیکن تمہارے مادے میں جر

ٹوٹے نہیں ہیں، اس لئے تمہارے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی۔"

"ٹھنڈی بھی تو لگ جاتی ہے۔" رشیداں نے سیانوں کی طرح جواب دیا۔

"ٹھنڈک لگ جاتی ہے!"

"جرٹوے بالکل ننگے ہوں تو ان کو؛ لٹھنڈی بھی تو لگ سکتی ہے اور ٹھنڈ سے فٹ نمونیہ ہو جاتا ہے۔" رشیداں کا خیال تھا کہ جو ٹوٹہ اس جراثیم کو کہتے ہیں جس نے جرسی پہنی ہوئی ہو اور جس کے کالر ہر وقت اوپر کو اٹھے رہتے ہوں۔ "گر میوں میں تو خیر ٹھیک ہے لیکن سر دیوں میں ہو کس طرح سے زندہ رہ سکتے ہیں۔"

لطیف نے کہا "یہ بات نہیں رشیداں، دراصل مجھے نویں جماعت میں دھانس پڑنے لگی تھی، اس سے سارے جرٹوے مر گئے۔ اور پھر کلاس میں ہی نہیں تھا کہ نیل سنگھ کو بھی دھانس پڑنے لگی تھی اور وہ بھی کمزور ہو گیا تھا۔"

"لیکن تم تو خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، صحت تو اچھی ہے خدا کے فضل سے لیکن اندر ٹھیک نہیں۔"

"یہ ساری باتیں حکیموں ڈاکٹروں کی بنائی ہوتی ہیں لطیف، حق صداقت صرف اللہ کو معلوم ہے۔"

لطیف پھر اخبار پڑھنے لگا اور اخبار پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا کہ ریٹائر ہونے کے بعد بڑے لوگ باغبانی کا شغل اختیار کیا

کرتے ہیں، کیوں نہ میں بھی اپنے کوارٹر کے گراسی پلاٹ میں کھیتی باڑی شروع کر دوں اور سبزیاں اگانے لگوں۔

اس نے اپنی یہ تجویز رشیداں کے سامنے پیش کی تو اس نے مسکرا کر کہا "دفعہ کریں۔ آٹھ آنے کی سبزی سے تو ہم دونوں کے دونوں

وقت نکل جاتے ہیں، ہم نے کیا کرنی ہے کھیتی باڑی۔"

لطیف نے کہا "مجھ سے یہ اخبار پڑھا نہیں جاتا، بہت ہی مشکل کام ہے۔"

"تو نہ پڑھا کریں۔"

"لیکن ریٹائر ہونے کے بعد اخبار پڑھنا بہت ہی ضروری ہے۔ سارے شرفا اسی طرح کرتے ہیں۔"

"تو ہم نے کسی کی ریس کرنی ہے بھلا۔"

"دراصل مجھے اخبار پڑھنے کا محاورہ نہیں رشیداں، خبر گم ہو جاتی ہے۔ آخری صفحے پر تو پھر بھی بقیہ مل جاتا ہے لیکن پانچویں اور سا

تویں صفحے پر کچھ نہیں ملتا۔ پھر میری عینک کا نمبر بھی تبدیل ہو گیا ہے، ساری سطریں ایک دوسری پر چڑھ جاتی ہیں۔"

"میں تو کہتی ہوں اب آپ عینک لگایا ہی نہ کریں۔ دور کی نظر تو مجھ سے بھی اچھی ہے ماشاء اللہ، کیا ضرورت ہے عینک کی۔"

ریٹائرمنٹ کے پورے پانچ مہینے گزرنے کے بعد بابلطیف پر یہ عقدہ کھلا کہ اس نے اپنی ساری زندگی نوکری میں برباد کر دی اور

سوائے فانیلوں پر غور کرنے اور ان پر اعلیٰ درجے کی ڈرافٹنگ کرنے کے اور کوئی کام ہی نہیں سیکھا جو اس کو بعد میں کام آ سکتا اور اس کی زند

گی آسان بنا سکتا۔ سیاست سے اس کو دلچسپی نہیں تھی، مسائل کے بارے میں اس کا علم بہت ہی محدود تھا، افسروں پر نکتہ چینی کرنے کے لئے

اس کے پاس کوئی مواد نہ تھا اور رشتہ داروں سے جھگڑنے کے لئے اس کی کوئی جائیداد نہ تھی۔ دوستوں یا روں سے ملنے کا البتہ وہ بہت شوقین تھا لیکن ان کی محفلوں میں وہ صرف یاروں کی باتیں سنتا تھا اور خوش ہوتا تھا، اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ اصل میں بابولطیف ابتدائی زمانے کا انسان تھا جس کا تعلق صرف زندگی سے بندھا تھا۔ زندگی جس طرح سے ہاتھ تھام کر اس کو وقت کے دشت و صحرا میں گزرا رہی تھی، وہ مزے سے گزرتا جاتا تھا۔ اس کی اپنی کوئی تجویز نہیں تھی، اپنا کوئی زانچہ نہیں تھا، کوئی رائے یا کوئی نظریہ نہیں تھا۔ جس طرح بابا آدم کی چوتھی پڑھی کے لوگ زن دگی بسر کرتے تھے، ایسا ہی انداز بابولطیف کا تھا۔ اس کی عقل اور اس کا علم صرف فائل لگ محدود تھا۔ فائل سے نظریں اٹھانے کے بعد وہ کائنات کے حوالے ہو جاتا اور جس طرح سورج، چاند، ستارے عقل کے بغیر زندگی گزار رہے تھے اور کافی لمبی عمریں پار رہے تھے اسی طرح وہ بھی عمر کی طے شدہ طوالت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

رشیداں کے ساتھ بابولطیف کا ساتھ بڑا پکا تھا۔ اصولی طور پر تو آپارشیداں کو ایک بے زار، مضحل اور فرسٹریٹڈ ہونا عورت چاہیے تھا لیکن وہ ایک ایسی محبت کرنی والی بیوی تھی جس میں مامتا کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ بابولطیف کے چہرے پر ذرا کی بے اطمینانی دیکھ کر سخت بے چین ہو جاتی تھی اور اس کے ارد گرد ایک نرس کی طرح گھومنے لگتی۔ بابولطیف کبھی سال میں ایک دو مرتبہ بے لطف ہوتا تھا، جب باس کو اس کی ڈرافٹنگ پسند نہ آتی یا صاحب زبانی فیصلہ دینے کے بعد صاف مکر جاتا کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے یہ تو میں نے کبھی کہا ہی نہیں تھا۔ لیکن بے لطفی کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہتی۔ رشیداں کی مادرانہ شفقت اسے اپنے آغوش میں لے کر اوپر اللہ لوری کی چادر ڈال دیتی۔ بابولطیف اتنے سال رشیداں کی چادر اور چادر اور چادر یواری میں پلاتا تھا اور اب ریٹائر ہو کر گھر آ گیا تھا جہاں روٹی ہانڈی کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا تھا۔

ایک شام مغرب کے بعد جب چند نمازیوں نے سیاست پر اور ملکی اور غیر ملکی حالات پر شدت سے بحث کی تو بابولطیف کو احساس ہوا کہ وہ وقت کے دھارے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے اور اب اس کے پاس سوائے لوگوں کے منہ دیکھنے کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ندامت کے اس احساس کے ساتھ اس کے اندر کا شخص چادر اور چادر یواری کی حدیں توڑ کر باہر نکلا اور بابولطیف اپنے تشخص کی تلاش میں سیدھا مارکیٹ پہنچ گیا۔

یوٹیلیٹی سٹور کا کاؤنٹر کلرک اپنی مشین پر جھکا چاقو کی نوک سے ایک چھوٹا سا پیچ کس رہا تھا۔ لطیف نے دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر رکھ کر پوچھا "آپ کے پاس کچھ اچھے اچھے نظریات ہوں گے؟"

کلرک نے سر اٹھائے بغیر کہا "ہمارے پاس صرف سرکاری نظریات ہیں اور کافی اچھی حالت میں ہیں۔ اگر آپ وہ لینا چاہیں تو کٹ پرائس پر سے سکتے ہیں۔"

لطیف نے قیمت پوچھی تو ذرا گھبرا سا گیا۔ ہکلا کو بولا "مجھے تو فی الحال تین چار چاہیے۔ ضرورت پڑی تو پھر لے لوں گا۔" کاؤنٹر کلرک نے کہا "ہمارے پاس صرف کٹنگ سائز پیننگ میں دستیاب ہیں۔ حکم ہو تو نکال لاؤں، پچھلے گودام سے نکالنے پڑیں گے۔"

لطیف نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "سماں ساز پیکنگ میں نہیں مل سکتے؟"

کلرک نے مسکرا کر کہا "سرکاری نظریات ہمیشہ کنگ ساز پیکنگ میں ہی ہوتے ہیں۔ بادشاہی پیکنگ میں ہی آئیں گے ناں۔" لطیف بھی اس کے ساتھ مل کر مسکرایا، لیکن اسے سمجھ نہ آ سکی کہ کلرک مسکرا کیوں رہا تھا۔ چلنے لگا تو کلرک نے ازارہ کہا:

"اگر آپ کو مضبوط، پائیدار اور ہنڈن سار نظریات کی ضرورت ہو تو انہیں جنک شاپ پر تلاش کریں۔" پھر اس نے لطیف کے سپاٹ پر تلاش کریں۔ "پھر اس نے لطیف کے سپاٹ چہرے کو غور سے دیکھ کر کہا "ایسی دکانوں پر تلاش کریں جو لائٹوں کے گھروں کا اور سفارت خانوں کی نیلامیوں کا سامان فروخت کرتی ہیں۔"

"لیکن وہاں تو سیکنڈ ہینڈ مال ہوگا۔" لطیف نے فکر مندی سے کہا۔

"کوئی ضروری نہیں کہ سیکنڈ مال ہی ہو۔" کلرک ناک کھجلا کر بولا "بڑی بڑی اعلیٰ درجے کی نئی ٹکڑ اور اور پینل پیکنگ کی چیزیں

بھی مل جاتی ہیں۔"

لطیف شکریہ ادا کر کے چلنے لگا تو کلرک نے پھر کہا "زیادہ قیمت نہ دیجئے گا، یہ بڑے سستے سودے ہیں۔ اچھے سے اچھے نظریات کی جوڑی سو سو اسو میں مل جائے گی۔"

"جوڑی!" لطیف نے حیرانی سے پوچھا تو کلرک نے کہا "ہم دوکاندار لوگ اسے جوڑی ہی کہتے ہیں گو یہ جوڑی ہوتی نہیں۔ جس طرح تالے کے ساتھ چابی، بوٹ کے ساتھ تسمے اور پین کے ساتھ اس کی ٹوپی ہوتی ہے اسی طرح نظریات ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک واپسی کی سلپ جیسی بھی ہوتی ہے، جیسے ہوائی جہاز میں ہنگامی حالات کے لئے ایک پھسلنے والی گیس موجود ہوتی ہے۔"

لطیف پھر باہر نکلنے لگا تو کلرک نے ہمدردی سے پوچھا "آپ نے پہلے کبھی نہیں لئے نظریات؟"

لطیف نے نفی میں سر ہلایا تو کلرک کو یقین نہ آیا۔ اس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا

"آپ کی عمر تو کافی ہوگی ماشاء اللہ، اب تک آپ نے کوئی اعتقاد ہی نہیں اپنایا؟"

"کیوں نہیں۔" لطیف نے زور دے کر کہا "اعتقاد تو میرا اپنے مذہب پر پکا ہے لیکن میں نے کبھی کوئی نظریہ استعمال نہیں کیا۔"

تو پھر آپ ایسے کریں کہ ابتدا میں ان پر کوئی رقم خرچ نہ کریں، کسی سفارت خانے سے مفت لے لیں۔"

"مفت!" لطیف کی باچھیں کھل گئیں۔

کلرک نے کہا "ابتدائی پریکٹس کے لئے مفت کام چلانا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ میں تو اب تک گھر بھر کے لئے وہیں سے نظریات لے آتا ہوں۔ میری بیٹی ایم بی بی ایس کے تیسرے سال میں ہے، وہ انہیں بڑی ترتیب سے اور بڑے سلیقے سے سنبھال کر رکھتی ہے۔"

لطیف نے کلرک کی بات سن تو لی لیکن اس پر عمل نہیں کیا۔ سیدھا ان دکانوں پر پہنچ گیا جہاں نیا اور پرانا غیر ملکی سامان ملتا تھا۔ پرانا مال باہر برآمدے میں رکھا تھا اور نیا مال اندر شیشے کی الماریوں میں سجا ہوا تھا۔ سارا مال نیلامی کا نہیں تھا، اس میں سے کافی چیزیں کو مسری سے چرائی ہوئی بھی تھیں۔ جس دوکان کے باہر پرانے فریج، کپڑے دھونے کی مشین، ساحل کی کرسیاں، بچوں کے چار اور قالینوں کے بو

سیدہ رول رکھے تھے اس کے اندر ایک خوبصورت سی عورت اور ایک جوان سالڑ کا تھا۔ ایک گاہک کپڑے استری کرنے کا فولڈنگ سٹینڈ بغل میں دبا کر باہر نکل رہا تھا اور اس کی بیوی کار کے اندر بیٹھی چاٹ کھا رہی تھی۔

لطیف نے اندر جا کر لڑکے سے پوچھا "آپ کے پاس کچھ نظریات ہوں گے؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" عورت نے اپنا بازو لہا کر کہا "ان دونوں الماریوں میں نظریات ہی نظریات ہیں لیکن آپ کو اصل میں کس چیز کی ضرورت ہے؟" لطیف سوچ میں پڑ گیا تو اس عورت نے مجھے ہوئے سیلز مین کی طرح کہا:

"آپ کو افکار چاہئیں، خیال چاہئیں یا صرف نظریات کی ضرورت ہے؟"

لطیف نے کہا "سچی بات یہ ہے میڈم کہ میں اس معاملے میں بالکل اناڑی ہوں اور اس فیلڈ میں میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ آپ جس طرح سے مجھے گائیڈ کریں گی، میں قبول کر لوں گا۔"

عورت نے اسی طرح سے بازو لہا کر کہا "ڈارلنگ افکار کی وہ گولڈن جوڑی نکالنا۔"

وہ لڑکا جو پہلے اس کا بیٹا نظر آتا تھا، اپنی ڈارلنگ کا حکم سن کر سٹول پر چڑھا اور شیشے کی الماری سے افکار کی ایک جوڑ نکال کر فرش پر کو ش کیا۔ عورت نے افکار کی جوڑی ریشمی رومال سے صاف کی اور لطیف کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولی "مشکل سے ایک مہینہ بھی استعمال نہیں ہوئی۔ وارنٹی سلف ساتھ لگی ہے اور پرائس ٹیگ بھی نہیں اتر۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے منگوائی تھی لیکن وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ کیسے مرا تھا ڈارلنگ؟"

"موٹر سائیکل کے حادثے میں۔" ڈارلنگ نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب دل برداشتہ ہو کر اس کا سارا سامان فروخت کر گئے۔ بڑا ہونہار نو جوان تھا۔"

"اور اس کی قیمت؟" لطیف نے ڈرتے پوچھا۔

"ایک سو روپے۔" عورت نے مسکرا کر کہا اور ڈارلنگ سے پوچھنے لگی "اس کا ڈبہ ہے ناں جانی؟"

"بالکل ہے۔" جانی نے کہا "یہ خریں لیں گے تو ڈبہ بھی نکال دوں گا۔"

"ایک سو روپے کچھ زیادہ ہیں میرے حساب سے۔" لطیف نے رک رک کر کہا۔

"زیادہ!" عورت زور سے ہنسی، پھر اس نے جھک کر تالی بجائی، ایک چھوٹا سا مجرا کی اور لپک کر بولی "بظاہر تو زیادہ ہی نظر آتے

ہیں لیکن اصل میں بہت کم ہیں۔ آپ ان کی آب و تاب دیکھیں، بڑی سیکس اپیل ہے ان میں۔"

سیکس اپیل کا لفظ سن کر لطیف کو فوراً اپنے جوٹو مے یاد آ گئے اور اس نے جھٹ سے سو روپے کا نوٹ نکال کر عورت کے بڑھے ہو

ئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

جب وہ چلنے لگا تو ڈارلنگ نے کہا "ہمارے پاس کچھ نظریات بھی آنے والے ہیں۔ ان کی بولی بدھ کے روز اٹھارہ تاریخ کو ہوگی

۔ ہمارا آدمی گیا ہوا ہے، اگر سودا ملے پا گیا تو بائی انیرواپس آئے گا۔"

"سودا کیوں نہیں طے پائے گا۔" عورت نے سنجیدگی سے کہا "میں نے مسٹر مورس کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ یہ مال ہمارا ہے، اور کوئی نہ لے جانے پائے۔"

"ان کی قیمت کی ہوگی؟" لطیف نے پوچھا تو ڈارلنگ نے کہا "اب یہ تو مال آجانے پر منحصر ہے۔ دیکھیں کیا قیمت لگی ہے، لیکن کچھ زیادہ نہیں ہوگی۔ بس یہی کوئی ستر ای روپے کا ایک نظریہ ہوگا۔"

"اور وہ سارے سیکنڈ ہینڈ ہوں گے؟" لطیف نے پوچھا۔

"ہوں گے تو سیکنڈ ہینڈ ہی" نوجوان نے جواب دیا "لیکن زیادہ استعمال شدہ نہیں ہوں گے۔ اصل میں نظریات ہمارے ہاں میو فیکچر نہیں ہوتے، سارے باہر ہی سے امپورٹ ہوتے ہیں۔ تو ہم خرید ہی نہیں سکتے اس لئے استعمال شدہ سے ہی کام چلانا پڑتا ہے۔"

لطیف کو اس نوجوان کی یہ بات کافی بری لگی۔ اس نے حوصلہ کر کے کہ "کیوں، ہمارے اپنے نظریات یہاں مینوفیکچر نہیں ہوتے؟ ہمارے اپنے لوگ انہیں کاسٹ نہیں کرتے، اپنے لوگ استعمال نہیں کرتے؟"

"کرتے ہوں گے" عورت نے بے پروائی سے کہا "لیکن مارکیٹ میں ان کی کوئی مانگ نہیں ہے۔ ہمارے اپنے نظریات تو ہاتھ مشینوں کی سویوں جیسے یا الٹی چارپائی پر سکھائی ہوئی بڑیوں جیسے ہوتے ہیں۔ ان کا استعمال تو اب اندرون شہر میں نہیں رہا، گاؤں میں کوئی استعمال کرتا ہو تو معلوم نہیں۔"

نوجوان نے کہا "سریہ ترقی کا اور ٹیکنالوجی کا دور ہے، اس میں دیسی نظریات نہیں چلتے، کچھ لوگوں نے سیالکوٹ، ڈسکے اور گوجرا نوالے کے استعمال کئے تھے لیکن ان کی موٹریں ہی بیٹھ گئیں۔ بڑا نقصان ہوا ان کا۔ کچھ تو سنبھل گئے لیکن باقی سارے دیوالی ہو گئے۔"

"لیکن اعتقاد تو دیسی ہی استعمال ہوتے ہیں۔" لطیف نے حوصلہ کر کے کہا۔

نوجوان نے کہا "ہمارے پاس کچھ دیسی اعتقاد پڑے ہیں۔ آپ چاہیں تو انہیں مفت لے جائیں، لیکن یہ آپ کے کام نہیں آئیں گے۔"

"وہ کیوں؟" لطیف نے پوچھا تو عورت نے کہا "گورنمنٹ ان کے استعمال سے منع کرتی ہے۔"

"منع تو خیر نہیں کری" نوجوان جلدی سے بولا "البتہ گورنمنٹ ان کے استعمال کی حمایت نہیں کرتی، ڈس کر تاج کرتی ہے۔"

لطیف تھوڑی دیر تک کچھ شرمندہ شرمندہ سا وہاں ایسے کھڑا رہا جیسے قصائی کی دکان پر پاؤ بھر گوشت لینے والا چور سا بنا کھڑا ہوتا ہے۔ پھر اس نے پرانے ریڈیو سیٹو، ٹوٹی دور بینوں، جلے ہوئے ٹوسٹروں اور ڈاکٹری کے استعمال شدہ اوزاروں میں سے پیتل کا ایک پلٹو سا اٹھا کر پوچھا "یہ کیا ہے؟"

"یہ ان بھوہے۔ ایک صاحب انڈیا سے لائے تھے لیکن اس کے کندھے ٹوٹ گئے، کندھے ہم نے اس کے اندر رکھے ہیں۔ قلعی کا ٹکڑا لگنے سے پکے مضبوط ہو جائیں گے۔ اگر آپ لینا چاہیں تو بارہ روپے دے دیں۔"

لطیف نے پیتل کا ان بھولایا تو اس کے اندر کندھے کھڑکنے لگے۔ اس نے دس روپے کا نوٹ نکالا کر کہا "میں اس سے زیادہ نہیں

دو گ۔"

عورت نے دس روپے اس کے ہاتھ سے لے کر کہا "اب جوان بھوانڈیا سے آرہے ہیں، وہ اس سے ہلکے ہیں۔ ان کی قیمت بھی زیادہ ہے اور دیر تک چلتے بھی نہیں لیکن ہمارے لوگ انہیں شوق سے استعمال کرتے ہیں۔"

لطیف جب دکان سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ وہ نو جوان بھی باہر آ گیا۔ اس نے لکڑی کی ایک پیٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس میں کچھ خیال، کچھ تصور، کچھ اصول اور کافی ساری اضافتیں، سلسلے اور حوالے پڑے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان میں سے اپنی مرضی کے اچھے اچھے چھانٹ سکتے ہیں۔ قیمت بھی نہ ہونے کے برابر ہے، چھ روپے کے بارہ!" لطیف اس پیٹی پر جھک کر سامان پھرو لئے لگا تو نو جوان نے کہا "ان کی ساخت پر نہ جائیں، اپنی اپنی جگہ پر سارے ہی مفید ہیں اور ہر جگہ فٹ ہو سکتے ہیں۔"

"لیکن کافی پرانے ہیں۔" لطیف نے جھکے جھکے کہا۔

"ناں جی ناں۔" نو جوان نے سر ہا کر کہا "یہ تو برسات کی وجہ سے زنگیا گئے ہیں۔ آپ ذرا سا برا سو ڈال کر رگڑیں گے تو گولڈن کلر کے ہو جائیں گے۔ ان کا میٹل بڑا زوردار ہے۔"

لطیف نے ڈیڑھ درجن چھوٹے بڑے، نوکدار، کنھگریلے اور تیز دھارا اضافے اور حوالے خرید لئے اور انہیں ایک بڑے شاپر میں ڈال کر دکان کے برآمدے سے باہر نکل گیا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے اور لوڈ شیڈنگ کا زمانہ تھا۔ لطیف کے تھیلے میں قیمتی سامان بھرا ہوا تھا اس لیے اس نے بس سے جانے کے بجائے ایک رکشالیا اور گھر کی طرف چل دیا۔

ٹھیک تین دن بعد عصر کی نماز سے پہلے بابو لطیف نے اپنا دھاری دار سواتی تھیلا کھولا اور اندر سے نقطہ نظر کی بیئر نکال کر صف پر چھوڑ دی۔ اس وقت کل پانچ نمازی مسجد میں جمع تھے اور اذان میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ مستقیم صاحب نے بیئر کو ایک نظر دیکھا اور چپ ہو گئے۔ ان کے حساب سے یہ کوئی خاص بیئر نہ تھی جس پر وہ توجہ دیتے۔ حاجی رمضان علی اور ڈاکٹر ارشد صاحب نے اس بیئر کی بہت تعریف کی اور صف پر انگلی بجا بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دراز گیسو فقیر منش طالب علم نے فوراً شوق سے بیئر اٹھا کر باری باری اپنی دونوں آنکھوں سے لگائی اور پھر اس کی چونچ ہولے سے اپنے ہونٹوں میں دبائی۔ بولا "میں کل ایک دن کے لئے انجینئرنگ یونیورسٹی لے جاؤں گا، ہمارے یہاں انتخاب ہو رہے ہیں۔" مستقیم صاحب نے تسبیح پر اپنی انگلیاں روک کر کہا

بھائی صاحب یہ بیئر لکڑی نہیں، ایک طرف سے جھولا مار رہی ہے۔"

بابو لطیف نے بیئر اٹھا کر واپس تھیلے میں ڈال لی اور اپنی گھڑی دیکھنے لگا۔

رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے رشیداں نے گہری نیند سے بیدار ہو کر دیکھا کہ لطیف اپنے بستر پر سیدھا بیٹھا ہے اور اس نے دو نوں پاؤں نیچے لٹکا رکھے ہیں۔ رشیداں کا کلیئہ دھک سے رہ گیا کہ اس نے سن رکھا تھا ریٹائرمنٹ کے بعد اکثر لوگ فوت ہونے سے پہلے اسی طرح چار پائی سے پاؤں لٹکا کر بیٹھتے ہیں اور پھر ان کا ہرٹ فیل ہو جاتا ہے۔ اس نے ہولے سے آواز دے کر پوچھا "کیا بات ہے لطیف؟" تو لطیف نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بجلی کی طرح اپنی چار پائی سے اٹھی اور لطیف کے قدموں میں بیٹھ کر منہ اوپر کر کے اس کی طرف

دیکھنے لگی لطیف کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مستقیم صاحب نے اس کی بیئر کو سب کے سامنے لنگڑی کہہ کر اس کا دل توڑ دیا۔ وہ بھیں بھیں رو نے لگا رشیداں اس کے ساتھ چمٹ گئی۔

پھر اس نے مسجد جانا چھوڑ دیا اور شام کے وقت اپنے نئے اور پرانے دوستوں کی دیا م شالا میں جانا شروع کر دیا۔ یہاں شہر کے دوسرے لوگ بھی آتے تھے اور اپنی اپنی نسبتوں اور اضافتوں کے بیئر لاتے تھے۔ دیر تک پالی جمتی اور نقطہ نظر کے صف شکن بیئر چونچیں اڑاتے لہو لہان ہو کر بے ہوش ہو جاتے۔ بیئر باز ہلدی چونا، ہرنی جاوتری کے مصالے چرھا کر انہیں پھر سے زندہ کرتے اور اگلے دن کا وقت مقرر کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ بابو لطیف کے تھیلے میں بھی بہت کچھ ہوتا لیکن وہ اسے باہر نکالتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ایک عجیب طرح کا خوف اسے چاروں طرف سے گھیرے رکھتا کیونکہ یہاں کے لوگ بڑے ظالم اور جابر تھے۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی، ہونٹ موٹے موٹے اور منہ بدبودار تھے۔ بدنوں سے ہیک آتی تھی اور ہر وقت اپنے ایک خاص حصہ جسم کو کھجایا کرتے تھے۔

وہ خوبصورت، کیسودراز اور نمازی لڑکا جو بابو لطیف سے ایک دن کے لئے اس کا سو روپے والا نظریہ لے کر اپنی یونیورسٹی چلا گیا تھا، بڑے ہسپتال کے سپیشل کیئر وارڈ میں پڑا تھا اور اس کے جسم پر گولیوں کے پانچ نشان تھے۔ اس کے گھر پر ہر وقت آیت کریمہ کا ورد ہوتا رہتا تھا اور اس کے والد ٹیکس پر بیٹھے ولایت کے ڈاکٹروں سے مشورے طلب کیا کرتے تھے۔ پتہ نہیں جلدی میں اس لڑکے نے بابو لطیف کا خوبصورت نظریہ کہاں پھینک دیا تھا اور اب وہ کن لوگ لوگوں کی تحویل میں تھا لیکن وہ تھا اپنی اصیل حالت میں۔ اس پر نہ تو گولیوں کے کوئی نشان تھے اور نہ ہی ہاتھ پائی میں اس کی ہیئت تبدیل ہوئی تھی۔ اس وقت بابو لطیف کو اس نظریے کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا اور کئی گز تک گھسٹنے کے باوجود اس پر خراش تک نہیں آنے دی تھی۔

جس شام بابو لطیف پہلی مرتبہ حلقے کی میٹنگ میں گیا تو اپنے ساتھ چھ روپے درجن والی ساری اضافتیں، نسبتیں اور افکار خاکی کاغذ کے ایک دبیز تھیلے میں ڈال کر لے گیا۔ مقالے کے خاتمے پر بڑی عمر کے ایک دبے پتلے شخص نے جیب سے پلاسٹک کا ایک خیال نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا اور سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ حاضرین نے اس گیٹ کو غور سے دیکھا تو سامنے بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے اپنی چربی لپی تھیلے سے تین کا ایک گرٹون کالا اور اس میں چابی بھر کر میز پر چھوڑ دیا۔ گرٹو تیزی سے پلاسٹک کے گیٹ پر جھپٹا اور اس میں چابی بھر کر میز پر چھوڑ دیا۔ گرٹو تیزی سے پلاسٹک کے گیٹ پر جھپٹا اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ ایک لڑکی نے پرس سے اپنی لپ سٹک نکال کر ہلکے ہلکے ہوٹوں سے چھوائی اور پھر اسے بند کئے بغیر تھیلی پر رکھ کر زور سے پھونک ماری۔ لب سٹک نے راکٹ کی طرح میز کے اوپر کوپ لیا اور ژو ژو کر کے چکر کاٹنے لگی۔ جب اس کی تیزی نے اسے حاضرین کی نظروں سے اوجھل کر دیا تو اس نے ڈائیو مار کر گتھم گتھا جوڑے پر پیڑیا ٹ میزائل جیسا ایک زوردار حمہ کیا۔ جھک سے ایک شعلہ اٹھا اور آن واحد میں میز پر چنگلی بھر خا کستر باقی رہ گئی۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر اس حملے کا سوا گت کیا لیکن کچھ لوگوں نے تالیاں نہیں بھی بنائیں بلکہ وہ جگ میں کب کا پراہوا پانی جواب بالکل گرم ہو گیا تھا، گلاسوں میں ڈال کر پینے لگے اور لڑکی کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اس دبے پتلے بڑی عمر کے آدمی نے اپنی جیب سے پلاسٹک کی ایک اور آرگیو منٹ نکالی اور اسے خا کستر پر رکھ کر سگریٹ پینے لگا۔ یہ آرگیو منٹ کافی پرانی تھی اور جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ اسے ایریل ڈائٹ لگا کر بڑی

محنت سے جوڑا گیا تھا اور اس کے ارد گرد سکاچ ٹیپ کی پٹی چپکی ہوئی تھی۔ بابولطیف نے حوصلہ کر کے اپنے تھیلے سے پیتل کا "ان بھو" نکالا اور اسے میز کے کنارے پر رکھ دی۔ عینک والے ایک صاحب نے سٹین لیس سٹیل کا ایک کندا ستراجس کا دستہ بانس کی کھچی سے بنا تھا، آگے کھسکا دیا۔ سانولے رنگ اور تھکے نقوش والی لڑکی نے اپنی چادر سے صندل کی لکڑی کا ایک برہنہ سپاہی نکال کر میدان میں کھڑا کر دیا۔ اس سپاہی کے سر پر لوہے کا ایک خود تھا اور چہرے پر کھلی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ لپ سٹک والی لڑکی نے ایک مرتبہ پھر لپ سٹک نکالی اور اپنے ہونٹوں سے چھو کر بند کر کے واپس تھیلے میں رکھ لی۔ بڑی دیر تک سارے اپنے اپنے سانس کے خانوں میں چالیں چلتے رہے اور قدم قدم آگے بڑھتے رہے لیکن شہ کوئی بھی نہ دے سکا۔ صاحب صدر نے سیٹی بجا کر کھیل ختم کرنے کا اعلان کیا اور کھلاڑیوں نے اپنے اپنے صیغے اٹھا کر حفاظت سے سنبھال لئے۔

اس روز جب بابولطیف چھوٹے پیلے ٹیکسی لے کر گھر پہنچا تو خوشی اس کا پاؤں زمین پر نہ پڑتا تھا۔ اس نے رشیداں کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھوڑا اور ناچتے ہوئے بتایا کہ اس کے پیتل کے ان بھو نے میدان میں اترتے ہی سارے افکار کی طبعیت صاف کر کے رکھ دی اور کوئی اس کے آگے بول نہیں سکا۔ "وزنی چیز پھر وزنی ہوتی ہے۔" لطیف نے لہرا کر کہا اور رشیداں کو چھٹی ڈال کر کھڑا ہوگا۔ رشیداں نے کہا "کوٹ ٹائی تو اتار دیجئے پہلے ہی بہت گرمی ہے۔ میں آپ کے لئے کھانا لگاتی ہوں۔"

"ضرور ضرور۔" لطیف نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا "جب کسی کا نظریہ قبولیت کے دارے میں آ جاتا ہے تو وہ بہت بھوکا ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی اس وقت اتنی بھوک لگی ہے کہ میں کھڑے کھڑے تم کو کھا سکتا ہوں۔ جلدی کرو اور کھانا لگاؤ۔ میرے ٹائی اتارتے تک کھانا لگ جانا چاہیے۔"

رشیداں اپنے ریٹائرڈ خاوند کی یہ بات سن کر مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

زندگی کے اتنے سال جو بابولطیف نے بڑی شرافت اور عاجزی کے ساتھ لطف میں گزارے تھے، اب وہ اس کے سینے کا بوس بن کر ہر وقت اسے شرمندہ کرتے رہتے تھے۔ اپنی زندگی کے ان مدقوق اور پڑمرده سالوں کی مکافات وہ اس طرح سے کر سکتا تھا کہ موچی دروازے میں ایک جلسہ کرے۔ سوفٹ لمبی، چالیں فٹ چوڑی اور دس فٹ اونچی سٹیج بنائے اور وہاں سے مجمع کو خطاب کرے۔ اپنے سارے نظریات، اعتقادات اور افکار کی نمائش کرے اور اپنے خیالات پر فلڈ لائٹس ڈال کر چکا چونڈ کر دے۔ لوگ ترنگ میں آ کر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیں، اس پر سلوگن لہرائیں اور اس کی مہما گائیں۔ اس مختصر سی دنیا میں صرف بابولطیف ہو اور اس کے نظریات ہوں، اس کے اصول ہوں اور اس کا نصب العین ہو۔ رات کے وقت بی بی سی اس پر تبصرہ کرے اور اپنے نامہ نگار کے حوالے سے مجمع کی تعداد بتائے۔

دن کے وقت وہ اپنے نظریات، خیالات، افکار اور حوالے پٹروں سے اور براسو سے چمکا تار ہٹا اور جن کو پچھلے روز مٹی کے تیل میں ڈبو یا تھا، ان پر ڈبل زیرو کا ریگ مال مار کر زنگ چھڑاتا رہتا۔ جن نظریوں کے کندے ٹوٹ گئے تھے، انہیں ویلڈ کرانے لے جاتا اور جن اضافتوں کی پٹیاں کثرت استعمال سے پھٹ گئی تھیں، ان پر رشیداں سے پکے دھاگے کے ساتھ رفو کرایا کرتا۔ پرانی ہکوں کی جگہ نئی ہکیں لگانے کے لئے اس نے ایک موچی سے ٹھیکہ کر رکھا تھا جو ایک روپے میں دو ہکیں لگا کر ان پر برش بھی مار دیتا تھا۔ شام کے وقت وہ مارکیٹ کا

پھیرا لگاتا اور کباڑیوں سے تصور، مزید نسبتیں اور فہمیدیں خرید لاتا۔ اب اس کے دل میں ایک ہی حسرت باقی رہ گئی تھی کہ کاش اس نے پانچ سال پہلے ریٹائرمنٹ لے لی ہوتی۔

شام کو جب پالی جمتی اور نظریات آپس میں گتھم گتھا ہوتے تو ان کے مالک پنچوں کے بل ہو کر انہیں للکارنے اور ششکار نے لگتے۔ اس ہماہمی اور بدابدی میں ایک دوسرے کو دھکیلنا پیلنا بھی پڑتا، کچھ رکاوٹیں بھی پیدا کی جاتیں، کچھ دھکے بھی پڑ جاتے، آپس میں بول بھارا بھی ہو جاتا لیکن لطیف صاحب ان چیزوں کے عادی ہو چکے تھے بلکہ ان کو اس کا چسکا لگ گیا تھا۔ اب کپڑے پھڑوالینا اور گھڑی کا کلائی سے کھل کر زمین پر جا کرنا، دیوار سے ٹکرا جانا یا دھکا کھا کر فریڈر گر جانا ایک عام سی بات تھی۔ سارے کھیلوں میں اسی طرح سے ہوتا ہے۔ تیز گیند کا کیچ لیتے ہوئے کھلاڑی زمین پر کئی لڑھکیاں کھا جاتا ہے۔ خراشیں آ جاتی ہیں۔ کپڑے پھٹ جاتے ہیں، خون نکل آتا ہے۔ ایسا تو کھیل میں ہوتا ہی ہے۔ جس روز بابو لطیف پٹ پٹا کر، کپڑے پھڑوا کر، خون تھوکتا گھر واپس آیا تو رشیداں رونے لگی۔ بابو لطیف نے ہنس کر کہا "بھئی ایسا تو کھیل میں ہو ہی جاتا ہے، یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں البتہ اپنے مہرے کو اپنی نظروں کے سامنے پٹو ادینا اور شکست کھا جانا اور دوسرے کی بات مان جانا موت کا مقام ہے۔"

موت کا لفظ سن کر رشیداں نے اپنے ریٹائرڈ خاوند کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

یہ سردیوں کی ایک طویل اور تاریک رات کا ذکر ہے جب رشیداں کو یوں لگا جیسے کوئی پانی میں ڈوب رہا ہے اور بلبلوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ لطیف کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ پا کر اپنی چار پائی سے کود کر بتی جلادی۔ لطیف اپنے پلنگ پر ٹنگیں لٹکائے بیٹھا تھا اور بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ رشیداں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا کر اس کا ماتھا چھوا تو وہ بالکل ٹھنڈا تھا۔ نبض چل رہی تھی لیکن ہر چار دھڑکنوں کے بعد ایک دھڑکن چھوڑ جاتی تھی۔ دل کی رفتار کافی تیز تھی لیکن سسکیوں کی رفتار اس سے بھی تیز تھی۔

"کیا ہوا، کیا ہوا لطیف؟" اس نے لطیف کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ اور زور سے رونے لگا۔

بڑی دیر تک رشیداں اسے ساتھ لگائے تھکتی رہی اور اسے بہاتی رہی لیکن جتنا وہ اسے تھکتی، اسی قدر شدت سے وہ کاپنے اور لرزے لگتا۔ پھر وہ بالکل ساکت ہو گئی اور اس نے لطیف سے اپنی ساری توجہ ہٹالی۔ کوئی بیس پچیس منٹ تک کمرے میں خاموشی کا عالم رہا۔ پھر لطیف نے اس کی طرف منہ پھیر کر کہا "آج بھری محفل میں میری بڑی بے عزتی ہوئی۔" رشیداں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔

لطیف کہنے لگا "آج جب میں نے کلاسیکل نظریہ نکال کر محفل کے سامنے پیش کیا تو حاضرین مجلس بغلیں جھانکنے لگے اور سب کو سانپ سوگھ گیا۔ قادر میر کے ساتھ ایک گٹھوں ساڑ کا آیا تھا۔ گندی شکل، گندے دانت، آنکھوں پر ٹوٹی ہوئی عینک، ہاتھ میں کڑا۔ میراے نظریے کو دیکھ کر کہنے لگا، یہ آپ نے کہاں سے لیا تھا صاحب؟ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا، تم کو اس سے کیا۔ ہمت ہے تو اس کا مقابلہ کر کے دکھاؤ۔ وہ ہنسنے لگا اور بڑی دیر تک ہنستا رہا۔ کچھ لوگ اس کی بدتمیزی پر دل تنگ بھی ہوئے لیکن بہت سارے اس کی ہنسی میں شریک بھی ہو گئے، حالانکہ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں ہنس رہا ہے۔ میں نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے

لگا۔ یہ آپ نے رکنے کباڑیے سے لیا ہوگا، رکن الدین اولڈ شاپ سے۔۔۔ سب مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر اس نے اپنا کڑا اوپر اٹھاتے ہوئے کہا، یہ میرا نقطہ نظر تھا اور میں نے ہی اسے پانچ روپے کے عوض رکنے کباڑیے کے پاس گروی رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے چھڑالوں گا لیکن میں نے نہیں چھڑایا۔ اس میں اب کوئی جان باقی نہیں رہی تھی، نہ ہی یہ آگے چلنے کے قابل تھا۔ آپ نے کتنے میں خریدا؟"

لطیف کی آنکھوں پر آنسو تیرنے لگے اور اس نے بیھ مار کر کہا "وہ ٹھیک کہتا تھا۔ میں نے اسے رکنے کباڑیے کی دکان ہی سے اسی روپے میں خریدا تھا اور اس کو سب کی نظروں سے چھپا کر عینک کے ایک خالی کیس میں محفوظ کیا ہوا تھا۔ جب لوگ مسکرانے لگے تو اس نے اونچی آواز میں کہا، اس کے ساتھ اعداد و شمار کی تین جھالریں بھی تھیں وہ کیا ہوئیں۔۔۔ وہ ٹھیک کہتا تھا، اس کے ساتھ اعداد و شمار کی تین جھالریں بھی تھیں اور انفرمیشن کے ساتھ چھلے بھی تھے۔ میں نے ان جھالروں کو الگ الگ کر کے مختلف اصولوں اور نصب العینوں کے ساتھ ٹانگ لیا تھا۔ پھر اس بد بخت نے قادر میر کے کان میں کہنا اس کا محض ایک بہانہ تھا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ ساری محفل نے سنی اور سبھی مسکرانے لگے۔۔۔ لطیف نے ذرا رک کر کہا "میری بڑے عزتی ہوئی ہے اور میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

"حد کرتے ہو۔" رشیداں نے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا "یہ بھی کوئی مرنے کی بات ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ رشیداں۔ اب اس زندگی میں اور کچھ رہ ہی نہیں گیا۔ لیکن تم فکر نہ کرنا، نئے رولز کے مطابق تم کو پوری پنشن ملتی رہے گی۔"

رشیداں نے اس کے پہلو میں ہلکی سی ایک گدگدی کی اور اسے پلگ پر چت لٹا کر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔

جس شام بابلو لطیف کے قتل تھے، اس روز صبح سویرے رشیداں لطیف کے سارے نظریے، اصول، افکار اور سلسلے حوالے ایک تھیلے میں ڈال کر مارکیٹ لے گئی۔ اس نے دوکاندار سے کہا "میرے پاس کچھ قیمتی نوادرات ہیں اور میں مجبوری کی حالت میں انہیں بیچنا چاہتی ہوں۔" ڈارلنگ ذرا باہر آنا۔ ہمارا سودا ایک بار پھر واپس آ گیا ہے کمبخت۔" پھر اس نے چہرا اوپر اٹھا کر کہا "آپ جی! اس سارے مال کے ہم آپ کو چھ روپے دے سکتے ہیں، وہ بھی آپ کی خاطر!"

Virtual Home
for Real People

ماسٹر روشی

یہ کہانی ملک کے اس مایہ ناز آرٹسٹ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے جس نے اپنے فن کو اپنے ہم وطنوں کے قدم مہمنت لزوم پر نچھاور کر دیا اور خود اگلے پیروں چلتا ہوا ان کی محفل سے نکل گمنامی کی دادی میں غائب ہو گیا۔ لاکھوں کے لاڈلے ماسٹر روشی کو اس وقت یا تو اس کے چند قریبی دوست جانتے ہیں یا اس علاقے کا ہر کارہ جو ہر سال جون کی آخری تاریخوں میں اس کے نام وزارت تعلیمات کا تار لایا کرتا ہے کہ:

REFERENCE OUR LETTER NO. D.903/EXP-JR (ED) 59 STOP
GRANT FOR THE DESTITUTE ARTISTS / DEPENDENTS OF THE
DECEASED ARTISTS OFR THE YEAR 1970-71 STOP. YOUR
GRANT RELEASE AUTHORITY OF RS 4800/= DWSPATCHED TO
AGPR JAUHARABAD.

EDUCATION

اس تار کو حفاظت کیساتھ جیب میں ڈال کر جب وہ اپنی بڑی لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹیکسی میں سوار ہوتا ہے تو سمن آباد سے لے کر اے جی کے آفس تک کوئی نہیں پہچانتا کہ اس گاڑی میں اپنے وقت کا وہ ہیرو جا رہا ہے جس نے لاکھوں دلوں کو مٹھی میں لے رکھا تھا اور جس پر سینکڑوں عورتوں نے اپنی زندگیاں گھول گھمائی تھیں۔ اے زمانے تو بڑا ہر جائی ہے، تو کسی کا ساتھ نہیں دیتا اور کسی کی پروا نہیں کرتا۔ اے جی آفس کے سامنے جوگی بین کالہرا بجا کر سانپ کی بند پٹاری کو انگلی سے ٹھکورتا ہے اور کہتا ہے:

بچہ جمورا!

واہ وا

سپ نوں چھڈاں؟

چھڈ!

اوائے وڈھ کھائے گا

نہیں وڈھ دا

اچھائی جوگی تے بین و جا کے سڀ نوں مست کر لید اے، توں کنویں کریں گا؟
نچ کے!

لوو جی کہند اے نچ کے، واہ و کنویں پھیر

جمورا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے چٹکیاں بجاتے ہوئے کوڈا کوڈا ہو کے ناچنے لگتا ہے: کاہنوں روک ریاں پہرے دارا، روضے دی جالی چم لین دے۔

ماسٹر روشی اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ایک چونی جیب سے نکال کر جمورے کے پاؤں میں پھینکتا ہے اور سراونچا کر کے اے جی آفس کی اونچی بلڈنگ کو دیکھتا ہے۔ عمر اند اس کی آستین پکڑ کر کھینچی ہے اور وہ آنکھوں میں آنسو لئے پھانک کے اندر داخل ہوتا ہے۔

ایک وہ زمانہ تھا جب عورتیں اپنے کانوں کے بالے، ہاتھوں کی پہنچیاں، جوڑے کے ہار اور لٹوں کے لچھے سٹیج پر اس کے قدموں میں پھینک دیتی تھیں اور وہ کمال بے نیازی کے ساتھ دونوں ہاتھ پھیلا کر، سر جھکاتا، بدن نچاتا سٹیج پر سے غائب ہو جاتا تھا اور دیر تک تا لیاں بھتی رہتی تھیں پیٹی ماسٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر سٹیج پر سے بکھری ہوئی چیزیں سمیٹتا تھا اور ونگ میں تحلیل ہو جاتا تھا۔ ماسٹر روشی نے چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی کبھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ یہ تمام کی تمام تھیٹر کے کارندوں میں تقسیم ہو جاتیں اور ان کی وجہ سے بہت سے غریب آرٹسٹوں کے گھروں میں چولہے روشن رہتے۔ آج وہی ماسٹر روشی اپنی جوان بیٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک ایک کر کے تیسری منزل کے زینے طے کرتا ہے اور اس کا سارا بدن ٹھنڈے پسینے سے بھیگ جاتا ہے۔ اس ملک میں ادیب، آرٹسٹ، فن کار کی کوئی قدر نہیں۔ جب اس کی شہرت کا سورج زوال پذیر ہو جاتا ہے تو وہ رات کے اندھیرے میں بھی باہر نکلنے سے گھبراتا ہے کہ کہیں وقت کے چمکاڈر اس کے بدن سے چمٹ کر خون کے آخری قطرے بھی نہ چوس لیں۔ جوں جوں وقت قریب آتا ہے، آرٹسٹ مرنے سے اور خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے صحن میں مردہ دھڑکتے کی طرح لیٹا ہوا اپنے کانوں کی ڈگڈگی بجا کر کھیاں اڑاتا رہتا ہے اور زندگی پپیل کے چمک دار اور نروئے پتوں میں سے اس پر بیٹیں کرتی رہتی ہے

اگر میں خود آرٹسٹ نہ ہوتا اور مجھے اپنے انجام اور ماسٹر روشی کی موجودہ حالت کے درمیان کاربن پیپر کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا تو میں کبھی اس کے گھر نہ جاتا، کبھی اس کی دراز قد سانولی لڑکی کے ہاتھوں سے چائے نہ پیتا اور کبھی اس پر ایسا مضمون نہ لکھتا جس کی تیسری اور آخری قسط چھپ چکنے کے بعد بھی قارئین کی زوردار فرمائش رہتی کہ یہ سلسلہ رہنا چاہیے۔

ماسٹر روشی ایک لانی منجی پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے سر کے نیچے سنبل کا ایک مردار سا تکیہ تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا "ریڈیو پر اکثر آپ کی آواز سنائی دیتی رہتی ہے لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ آپ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل

ہوگا۔ میرے نصیب اور اس جھونپڑی کے بھاگ کہ چیونٹی کے گھر بھگوان آ گئے۔ "میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور میں ان کی اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ عمرانہ نہ کہا "ڈیڈی سارا دن اسی طرح لیٹے اپنے ماضی کو یاد کیا کرتے ہیں۔ خود بھی روتے ہیں۔ اوروں کو بھی رلاتے ہیں۔ اب تقدیر کے آگے تو کسی کا بھی بس نہیں چلتا ناں جی۔"

میں نے کہا "ہاں جی، تقدیر کے آگے تو آدمی بالکل مجبور ہوتا ہے۔"

ماسٹر روشی ہماری یہ بات سن کر کہنی کے بل اٹھے اور کہنے لگے "بیٹی ذرا اندر سے پٹی لانا۔ کچھ یہ آئے ہیں، کچھ دل اندر سے پھٹا جا رہا ہے۔ اس وقت دونوں اندھیرے ملتے ہیں۔ میں رفتہ رفتہ آواز دے کر اس کی گونج سننا چاہتا ہوں۔" پھر مجھ سے فرمانے لگے "جب شام کا اندھیرا اور دل کا اندھیرا دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بھاگ کی کوک فریاد پیدا ہوئی ہے اور پتھروں کے دل چھوٹ جاتے ہیں۔" مہیں نے کہا "ہاں جی پتھروں کے قلعے ٹوٹ جاتے ہیں، کچے منڈپ نہیں ڈھتے۔ کچے بڑے سنگ دل ہوتے ہیں۔"

کہنے لگے "واہ میاں وا، کیا بات کہی ہے تم نے۔ ساری عمر کچے لوگوں سے یاری کی لیکن کوئی بھی دل ہمارے لئے مہینوال کے بھاٹے کی طرح نہ ٹھنک سکا۔"

میں نے کہا "ماسٹر صاحب! انجیل میں لکھا ہے کہ اگر میں سارے جہان کی بولیاں بولوں اور تمام دنیا کے علم حاصل کر لوں لیکن محبت نہ کروں تو میں ٹھنٹھنا تا ہوا پیتل اور جھنجھناتی ہوئی جانجھ ہوں۔" انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سنبل کے تکیے پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ "عمرانہ پیٹی لے کر آگئی اور ڈیڈی کے سامنے پانکٹی پر بیٹھ گئی۔ ماسٹر روشی نے کہا:

"یہ غزل سر بندر نے بھی گائی تھی اور اپنے کلباڑا سے گلے کے ساتھ اس کے خوب چھوڑے اتارے تھے اسی زمانے میں، میں بھی سیٹج پر یہ گاتا تھا۔ ہاں بیٹی۔"

عمرانہ نے ہارمونیم بجانا شروع کیا:

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا نہ شاخ گل تھی، نہ بلبل نہ آشیانہ تھا

لیکن ماسٹر روشی کی آواز میں اب کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ ایک آرٹسٹ کی انا تھی، جو دوکل کورڈز کے بجائے بول رہی تھی۔ عمرانہ بڑے سر میں باجہ بجا رہی تھی اور اس کی انگلیاں پردوں کو چھوٹے چھوٹے بوسے دے رہی تھیں۔ میرا دل بھی ہر پردے کی دھب کے ساتھ تھوڑا تھوڑا نیچے کو ڈول جاتا تھا۔

غزل ختم ہوئی تو میں نے ماسٹر صاحب کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنی آنکھوں کے ساتھ لگا لیا۔ عمرانہ پیٹی کے لے کر اندر چلی گئی تو ماسٹر روشی نے بڑی آہستگی سے کہا۔۔۔ مہاراج بڑوودہ کی تین بھانجیاں تھیں، تینوں چودھویں کا چاند لیکن درمیانی کے حسن کی تاب برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میں ایک مہینہ ریاست میں رہا اور ہر شام اسے مکمل تال کے کنارے یہ غزل سناتا رہا لیکن اس کی طبعیت سیر نہ ہوئی۔ آخر ایک دن کہتے لگی، راج پاٹ، محل و محلے، ماں ماما سب جائیں بھاڑ میں۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں جہاں لے جاؤ گے، داسی بن کر رہوں گی۔ بڑوودہ کا نام تک نہ لوں گی۔ "میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جس کا ماما مہاراج ہو، اس کی بھانجی راج کمار ہی ہو

گی۔ اس کی بات سن کر دل تو خوش ہوا پر اندر سے روح کا پٹنے لگی۔ میں نے کہا "ریاست سے نکل کر انگریزی علاقے میں جا لینے دے، پھر تمہیں بلالوں گا۔" چند راوتی نے میری بات مان لی۔ تین لاکھ کے ہیرے اور سونے کی بارہ اینٹیں مجھے چوری سے دیں اور گلے میں ہاتھ ڈال کر بولی "انگریزی کے علاقے میں جا کر بھول نہ جانا۔ انگریز چا تر اور بے دھرم ہوتا ہے۔" میں نے کہا "تو چند راہے تو میں روشنی ہوں۔ روشنی چاند کو کس طرح چھوڑ سکتی ہے۔" لوجی پھر میں جالندھر آ گیا۔ عالی کے پر رشیدہ ڈومنی کی تین منزلہ عمارت تھی۔ تین لاکھ کے ہیرے بک بکا کر ان تینوں منزلوں میں کہیں گم ہو گئے، لیکن ٹائم بہت اچھا پاس ہوا۔ ہمارے پاس اس وقت پانچ فورڈ کیا گاڑیاں تھیں۔ ایک میری اور رشیدہ کی، ایک اس کے لڑکے رفیق کی اور تین اس کی لڑکیوں کی۔ سب کی الگ الگ ماسٹر روشی نے کہا کہ اس ڈیڑھ پونے دو سال کی مدت میں ہندوستان، نیپال، سکم اور لنکا کے بڑے بڑے گویے ہمارے گھر آ کر چوکی بھرتے رہتے اور منہ مانگے انعام پاتے رہے۔ تین لاکھ روپیہ اس زمانے میں تین کروڑ روپے سے کم نہیں تھا۔

"اور چند راوتی؟" میں نے پوچھا "اس سے آپ کی ملاقات نہ ہوئی؟"

کہنے لگے "اس عرصے میں نے کسی سے بھی ملاقات نہ کی۔ مایا پارسی تھیٹر نے کراچی میں بڑا بزنس کیا۔ خود سیٹھ نسران مجھے لینے آیا لیکن رشیدہ نے مجھے جانے نہیں دیا۔ محبتوں کے پارٹ کے لئے مجھے ایک ہزار روپے روز پر بک کرتا تھا لیکن میں نہیں مانتا۔ دراصل اس زمانے میں کراچی اتنا بڑا شہر نہیں تھا۔ پھر عالی کے عے سے میری زندگی بندھی تھی، میں کس طرح سیٹھ کے ساتھ چلا جاتا۔"

"او چند راوتی" میں نے پھر پوچھا "وہ آپ کو بھی کبھی نظر آئی؟"

"آئی ___ آئی کیوں نہیں۔" ماسٹر روشی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "کولوٹولہ سٹریٹ کلکتہ میں ہامون بھائی ناتھن جی کے تھیٹر میں نے فرہاد کا پارٹ کیا۔ اگلے صوفے پر چند راوتی اور اس کا خاندان بیٹھے تھے۔ کسی چھوٹی سی ریاست کا رجواڑہ تھا۔ کیسری رنگ کی پگڑی، کانوں میں نیلم کے بندے، گورارنگ، موٹی ناک، آنکھوں سے ٹیر مارتا تھا۔ میں نے بھی شیریں کے دکھ کے سارے ڈائلاگ چند راوتی کی طرف منہ کر کے ادا کئے اور جب میں نے تیشہ اپنے سر پر مارا تو مرنے سے پہلے مجھے چند راوتی کی چیخ سنائی دی۔ کوئی دس منٹ تک ہال میں تالیاں بجتی رہیں۔ پھر پردہ اٹھا، ساری کاسٹ آڈینس کے سامنے آئی تو نعروں اور جے جے کا رول کا طوفان اٹھ آیا۔ میں اسی طرح ہاتھ با ندھے سٹیج سے اتر ا اور مہارانی چند راوتی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے سر پر جے ہوئے سفید ساڑھی کے پلو سے ہیرے کا کلپ اتارا، پلو پیچھے پھینکا اور گلے سے موتیوں کی مالا پکڑی تو دل پر ایک گھونسا لگا۔ مہارانی نے پلو سر پر رکھا اور کلپ لگا لیا۔ رجواڑے نے رانی کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر میری طرف منہ کر کے بولا "شاہد ماسٹر، سہاونا کام دکھایا تے نے۔"

میں نے کہا "حضور ہم تو رانی جی کے آدور میں پہلے بھی گاتے رہے ہیں، جب یہ راج کمار تھیں۔"

رانی نے دماغ پر زور دے کر کہا "مانویا تو پڑتا ہے پر یاد نہیں آتا۔" اور پھر وہ ہال سے باہر نکل گئیں۔

میں نے کہا "ماسٹر جی، وہ موتیوں کا ہار؟"

ماسٹر روشی نے کہا "ایسے کئی ہار آئے اور چلے گئے۔ میسرز اینڈ رسن جی برو تھ سکاج وہسکی کے امپورٹڈ تھے۔ مین ان کی دوکان سے

مال نہیں لیتا تھا، ان کی معرفت اپنی شپ منٹ الگ منگواتا تھا۔ ہر بوتل پر سنہرے رنگ کا ایک سنہرا لیبل ہوتا تھا جس پر لوہے کے چھاپے میں "ماسٹر روشن، تھیٹر ہیرو کے لئے" اردو میں چھپا ہوتا تھا۔ یہ لیبل ولایت ہی میں چھپتا تھا اور وہیں سے بوتلوں پر لگ کر آتا تھا۔ بڑا یادگار ٹائم پاس کیا ہے اس گنہگار نے اور بڑے بڑے زمانے دیکھے ہیں۔ اب دیکھ لو، اس کھنڈر میں پڑے ہیں این ٹائپ کو ارٹھر میں۔ کل چار سو روپے ماہانہ سرکار سے مدد ملتی ہے۔ اس میں سے ایک سو تیس کرائے کے چلے جاتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ سواتین سو روپے اپنے خانسائے کو ماہوار دیتا تھا اور انعام اکرام جو اس کے مقدر کا بن جاتا تھا، وہ الگ، "ماسٹر روشنی نے کہا" انسان حقیقت سے آنکھیں بند کر سکتا ہے لیکن پرانی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ پرانی یادیں زنگ آلود پتھروں کی طرح ہوتی ہیں، کوشش کا بیج کس ٹوٹ جاتا ہے لیکن بیج نہیں کھلتا۔"

میں نے کہا "سر، پھر آپ جمعرات شام کے ساتھ ساڑھے سات بجے ٹیلی ویژن سٹیشن پہنچ جائیے اور عمرانہ کو بھی ساتھ لیتے آئیے۔ ماسٹر روشن نے دکھی ہو کر کہا "یہ تو ضرور آئے گی۔ اس کو تو آنا ہی پڑے گا۔ یہی تو میرا رستہ کی لاٹھی ہے۔ انہی راستوں میں تو اس غریب کی جوانی برباد ہوئی۔ واہ عمرانہ واہ _____ کیا دیا باپ نے تم کو _____ کیا ملا تم کو اس گھر سے _____ ہائے ہائے ہائے۔"

السلام علیکم خواتین حضرات! ٹی وی پروگرام "یاران کہن" کا میزبان آپ سے مکاتب ہے اور آپ کی کد مت میں سلام پیش کرتا ہے۔ ہمارے آج کے اس پروگرام میں برصغیر کے نامور فن کار، اداکار، شاعر اور موسیقار جناب روشن علی ساغر المعروف ماسٹر روشنی آپ سے ملاقات کی غرض سے تشریف لائے ہیں۔ (ماسٹر روشنی کا کلوز اپ، وہ ہاتھ اٹھا کر ناظرین کو سلام کرتا ہے) ناظرین کرام! وہ لوگ جنہوں نے ماسٹر صاحب کو اپنے فن کے عروج پر دیکھا ہے، میرے ساتھ اتفاق فرمائیں گے کہ گزشتہ ربع صدی میں دنیا کے چار پانچ باکمال فن کاروں کی فہرست میں ماسٹر صاحب موصوف کا نام بھی شامل تھا اور یورپ کے نقاد انہیں ساحر مشرق کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان کے فن اور زندگی پر جیتے مضامین مغربی ممالک کے اخباروں اور فنی جریدوں میں شائع ہوئے، اتنے کسی اور ایشیائی فن کار، مصنف، سائنس داں یا ماہر تعلیم کا مقدر نہ بن سکے _____ خواتین و حضرات! میں زیادہ دیر تک آپ کے اور ماسٹر روشنی کے درمیان حائل رہنا نہیں چاہتا، فقط چند جملوں کے ساتھ ان حضرات کا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں جو پروگرام "یاران کہن" کے سلسلے میں ہمارے سٹوڈیو میں تشریف فرما ہیں اور ماسٹر ماسٹر روشنی کا انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرے دائیں ہاتھ ہیں جناب بھائی چھیلا صاحب، معروف سنگر اور مہاراجہ پٹیل کے درباری گویے۔ آپ کے ساتھ ہیں جناب نذیر حسینی صاحب، تھیٹر کے اداکار اور ریڈیو، ٹی وی کے فن کار (نذیر حسینی مسکرا کر سر ہلاتا ہے)۔ اور آخر میں جناب احمد بشیر صاحب _____ صحافی، ادارہ نویس، فلم ساز اور موسیقی نواز۔ ان تینوں حضرات نے ماسٹر روشنی کے فن سے خوشہ چینی کی ہے اور سینکڑوں ہزاروں اور لوگوں کی طرح وقت کے اس عظیم فن کار کو برامان دینے ہیں _____ ناظرین کرام! اب ہم جناب بھائی چھیلا سے پوچھیں گے کہ انہوں نے سب سے پہلے ماسٹر روشنی کو کہاں

اور کب دیکھا؟

بھائی چھیلا: جناب ماسٹر صاحب کو میں نے سب سے پہلے چھ جولائی سن انی سو چھبیس میں پٹیا لے میں دیکھا۔ اس وقت عید گاہ کے سامنے ان کا تھیٹر لگا تھا اور مہاراج نے خاص تاکید کر کے انہیں ریاست میں بلوایا تھا۔ پہلا دن عام لوگوں کے لئے نہیں تھا، صرف مہاراج اور راج پر یوار کی بی بیوں اور درباریوں کے لئے تھا۔ دلی سے وائسرائے کے ایڈی کا نگ ایڈن مور اور راج پرکھ کے لسی ناظم جان گبور صاٹ مہاراج کے ساتھ موجود تھے۔ درباری گویوں میں سے مہاراج نے صرف مجھ کو آنے کی اجازت دی تھی۔

ایم سی: یہ تھیٹر دربار ہال میں ہوایا یا ہر؟

چھیلا: میں نے عرض کیا ناں جی کہ تھیٹر عید گاہ کے باہر لگا تھا۔ ماسٹر روشنی نے دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ماسٹر روشنی: یہ میرا اصول تھا کہ چھوٹی ریاستوں کے درباروں میں نہیں گاتا تھا۔ بڑی ریاستوں میں سے بھی میں نے چھ کا انتخاب کر رکھا تھا جہاں میں پانچ راجوں اور چھٹے نظام کے سوا اور کہیں اپنے فن کا مظاہرہ نہ کرتا تھا۔

ایم سی: خواتین و حضرات! یہ ایک فن کار کی غیرت اور انا کا سوال ہے۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن فن کو بیچتا نہیں۔ فن ایک ایسی چیز ہے جو نہ بیچی جاتی ہے نہ خریدی جاسکتی ہے۔ فن تو فن ہی ہوتا ہے۔ ہاں جی بھائی چھیلا صاحب، تو آپ نے ان میں کیا کمال دیکھا؟

چھیلا: جناب عالی ماسٹر صاحب ایک سمندر تھے، ایک ساگر تھے۔ رکب، کوئل، گندھار ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ سرتیاں ان کے گھر کا پانی بھرتی تھیں۔ جب انہوں نے سٹیج پر کھڑے ہو کر پہلی تان لی تو بدھ سنگ پکھا و جی نے بتایا دھاماں خود بخود گونجتے لگا اور پکھا و جی ڈر کر جوڑی سے پرے ہو گیا۔

ایم سی: شاید وہ ابھی کچا پکھا و جی تھا۔

چھیلا: جی نہیں جناب، بیدی بدھ سنگھ کی سال دربار صاحب میں ارداس کرتا رہا تھا اور سارے ملک کا مشاہور طبلہ بجانے والا تھا۔ مہاراج جب دربار صاحب متھاٹھینے گئے ہیں تو انہوں نے بدھ سنگھ پکھا و جی کو سنا اور وہیں سے اسے ساتھ لیتے آئے۔ بھلے زمانے میں تین سو روپے مہینہ اور رہنے کو گھر دیا تھا مہاراج نے۔

ایم سی: ماسٹر روشنی صاحب نے وہاں پہلا گانا کون سا گایا؟

چھیلا: مجھے اب تک یاد ہے جناب عالی! وہاں انہوں نے "پٹیا لہ ولا راجہ بول ہو ر بولدا، نی چکور بولدا کوئی مور بولدا" گایا تھا۔

ایم سی: لیکن یہ گانا تو آپ بھی گاتے رہے ہیں اور آپ نے اس سے کافی شہرت حاصل کی ہے۔

چھیلا: (دونوں ہاتھ کانوں کو لگا کر) تو بہ جناب، تو بہ! کتھے رام رام کتھے ٹیٹیں ٹیٹیں۔ ماسٹر صاحب کے سامنے ہماری آواز تو کٹے کی رینگ تھی۔

ماسٹر روشنی: نہیں بھائی چھیلا جی، آپ بھی خوب تھے ماشاء اللہ۔

چھیلا: آپ کی کرم نوازی ہے جناب عالی! ہم مقدر کے کڑچھے اڑاتے رہے، فن وغیرہ تو توبہ توبہ (پھر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔)
چھیلا: مہاراج نے لسی ناظم صاحب کو پاس بلایا اور انہوں نے سٹیج پر جا کر اعلان کیا کہ اس گانے سے خوش ہو کر مہاراج نے سنام میں
باراں مرتبے، پٹیالے میں ایک حویلی اور پیلے جھول والی تھین بھوری بھینس ماسٹر صاحب کے نام کریں۔ ماسٹر صاحب نے
(ان سے مخاطب ہو کر) حضور کو یاد ہوگا، اسی وقت ایک شکریے کا ترانہ پڑھا اور سٹیج سے اتر آئے۔

ایم سی: ماسٹر صاحب آپ نے وہاں قیام فرمایا؟

ماسٹر روشی: جی نہیں۔ ایسی خشک اور بے فیض جگہ میں ہمارا دل کس طرح لگ سکتا تھا۔ میں نے ایک مہینہ قیام کرنے کے بعد وہ جگہ چھوڑ دی
ایم سی: اور وہ زمین اور حویلی؟

روشی: وہ میں نے علاقے کے ذیلدار کے ہاتھ فروخت کر دیں۔

چھیلا: جی جناب مجھے یاد ہے۔ ایک لاکھ دس ہزار میں دونوں چیزیں فروخت کر دی تھیں انہوں نے _____ کوڑیوں کے مول سونے
جیسی زمین بیچ دی۔

ایم سی: اور بھوری بھینس؟

چھیلا: ایک تو مجھے تحفے کے طور پر دی تھی۔ دوسری دونوں دیپو سانس کی بیٹی کو دے دی تھیں۔ بڑی جوان نچارتھی وہ بھی اپنے وقت کی۔

ایم سی: نذیر حسینی صاحب! آپ نے بھی ماسٹر روشی کے کمالات دیکھے ہیں۔ یہ فرمائیے کہ آپ نے ان سے کچھ سیکھا؟

نذیر حسینی: ان سے کچھ سیکھنا یا ان کے ساتھ مقابلہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی۔ میں نے
اپنے بچپن میں ان کو جالندھر میں عالی کے مے پر دیکھا تھا۔ ان کے پاس پانچ موٹریں تھیں اور ہم علاقے کے سارے لڑکے شام کو
کھیل کود سے فارغ ہو کر ان کی موٹریں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ یہ سب لوگ سوار ہو کر کمپنی پاغ اور پھر چھاؤنی کی سیر کو تشریف
لے جایا کرتے تھے۔

ایم سی: لیکن آپ نے ان کو سٹیج پر کب دیکھا؟

نذیر: سٹیج پر میں نے ان کو انبالے میں دیکھا۔ میں گھر سے چوری ان کے فن کا کمال دیکھنے انبالے گیا تھا اور پھر تین سال تک لوٹ کر
گھر نہیں آیا۔

ایم سی: وہ کیوں؟

نذیر: جہاں جہاں ان کا تھیٹر جاتا تھا، میں بھی جاتا تھا۔ راستے میں محنت مزدوری کرتے _____ منڈیوں، بازاروں میں بوجھاٹھاتے
_____ کرایہ اور تھیٹر کا ٹکٹ بناتے _____ ہم بردھوان تک پہنچ گئے۔

ایم سی: ہم سے آپ کی کیا مراد ہے؟

نذیر: ہم سے میری مراد ان نوجوانوں سے ہے جو میری طرح سوڈیٹھ سوکی تعداد میں ان کے تھیٹر کے ساتھ ساتھ چلتے تھے اور جہاں

ماسٹر صاحب قدم رکھتے تھے، وہاں اپنی آنکھیں بچھاتے تھے۔ ماسٹر صاحب کو اپنی زندگی میں جو شہرت، جو مقبولیت اور جس قدر دولت نصیب ہوئی وہ میرے خیال میں اب تک کسی اور آدمی کے مقدر میں نہیں ہوئی۔

ماسٹر روشی: لیکن اس شہرت، اس مقبولیت اور اس دولت سے مجھے کیا فائدہ پہنچا؟

ایم سی: آپ بجافرماتے ہیں۔ دراصل ہمارے ملک میں فن اور فن کار کی وہ قدر نہیں جو دوسرے ملکوں میں ہے۔ یہاں تو فن کار کو اپنا فن بیچ کر پیٹ پالنا پڑتا ہے۔ ہاں جی حسینی صاحب تو وہ کون سی ایسی چیز تھی جو آپ کو کشاں کشاں ماسٹر صاحب کے ساتھ لئے پھرتی تھی؟

نذیر حسینی: یہ ماسٹر صاحب کے فن اور ان کی صداکاری کا کمال تھا جس نے لاکھوں دلوں کو اسیر بنا رکھا تھا۔ ان کو یاد ہوگا کہ جب یہ نائک لیلیٰ مجنوں میں مجنوں کا پرٹ کیا کرتے تھے تو دو دو مہینے پہلے ٹکٹ بک جاتے تھے اور ہزاروں لوگوں کو جو دور دور سے آئے ہوتے تھے، مایوس ہو کر لوٹنا پڑتا تھا۔

ایم سی: آپ اس نائک میں ان کے کمال فن کی کوئی ایک خوبی بیان کر سکتے ہیں؟

نذیر: مجنوں لیلیٰ سے جدا ہو کر جنگل میں نکل جاتا ہے اور اسے تن من کا ہوش نہیں رہتا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پاؤں سپارتا ہے تو معاً اسے خیال آتا ہے کہ کہیں ادھر لیلیٰ کا گھر نہ ہو۔ اٹھتا ہے اور کھجور کے ایک درخت کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بھوک پیاس سے بے نیاز اور اپنے وجود سے بے خبر وہ کئی مہینے تک اسی طرح کھڑا رہتا ہے۔ اس کا بدن سوکھ کر کیکر کے تنے کی طرح کھر دار اور بے جان ہو جاتا ہے۔ اس وقت جنگل میں چند لکڑہارے لکڑی کاٹنے کی غرض سے آتے ہیں اور کیکر کے اس سوکھے ہوئے درخت کو دیکھ کر اس پر آرا چلاتے ہیں۔ آرے کی پہلی رگڑ کے ساتھ ہی اس نحیف و نزار بدن سے ایک کراہ پیدا ہوتی ہے جو نقاہت کی وجہ سے بلند نہیں لیکن پھر بھی آڈینیس کی آخری قطار تک پہنچتی ہے۔ بس ان کی یہ کراہ لوگوں کا کلیجہ نکال لیتی تھی اور میسوں لوگ ہال میں بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔

ایم سی: وہ صاحب، وہ وہ _____ جناب یہ ہے تو گستاخی اور ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ کو زحمت دیں لیکن ہمارے نارین کی آرزو ہے کہ آپ اس طرح کی آواز ایک مرتبہ نکال کر سنائیں _____ میں معافی چاہتا ہوں۔ (ماسٹر روشی اپنی کرسی سے اٹھتا ہے۔ ایک قدم آگے بڑھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیمرہ اس کا M.C.U. لیتا ہے اور ماسٹر روشی دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک گمبیر آہ بھرتا ہے۔ ایم سی ماتھے پر عقیدت کا ہاتھ لے جا کر اسے سلام کرتا ہے اور واپس کرسی میں بیٹھنے میں مدد دیتا ہے۔)

ایم سی: نذیر حسینی صاحب آپ کو ماسٹر روشی صاحب کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ہوگا اور آپ نے محسوس.....

نذیر: (بات کاٹ کر) نہیں جناب، یہ فخر ہم جیسے خاک نشینوں کو حاصل نہیں ہوا۔ اگر خدا نخواستہ ہمیں ایسا چانس ملتا بھی تو ہم ان کے ساتھ چھوٹے موٹے پارٹ کئے تھے لیکن وہ بھی ان کے آگے اچھی طرح سے جم نہ سکے تھے۔

ماسٹر روشی: محمد حسین میں بڑی جان تھی، بڑی ادائیگی تھی۔ بڑا فن کو سمجھنے والا تھا۔ افسوس اس کی عمر نے وفانہ کی نہیں تو اپنے وقت کا عظیم

ادا کار ہوتا۔ اس کے ساتھ کام کرنے میں مزا آتا تھا۔ (کیمرے کی طرف چہرا اٹھا کر) لیکن خواتین و حضرات، اچھا ہی ہوا کہ وہ مر گیا اور اس بے دید اور بے مروت دنیا کو چھوڑ گیا۔ آخر اس کو کیا مل جاتا! یہ واہ کرنے والے اس کو کیا دے دیتے۔

ایم سی: یہ بڑی دردناک باتیں ہیں ناظرین کرام لیکن اس پروگرام میں پوری کوشش کے باوجود ایسی باتیں آہی جاتی ہیں جس کے لئے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ اب میں جناب احمد بشیر صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ ماسٹر روشی صاحب کے فن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

احمد بشیر: جناب جہاں تک فن کا تعلق ہے، اس معاملے میں میں خود کورا ہوں البتہ.....

ایم سی: نہیں حضور، ایسی کسر نفسی بھی واجب نہیں۔ ہم نے آپ کے مضامین خاص طور پر آپ کے کریکٹر سکچر بھی پڑھے ہیں اور آپ کی فلم بھی دیکھی ہے۔ یہ بات ہم ماننے کے لئے ہرگز نہیں کہ آپ اس راہ سے نا آشنا ہیں۔

احمد بشیر: چلئے جناب آپ کی بات مان لیتے ہیں کیونکہ ٹی وی کے پروگراموں میں ایک دوسرے کی باتیں ماننے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماسٹر روشی سے بڑا فنکار میں نے اپنی زندگی میں اس برصغیر میں نہیں دیکھا۔ ہالی وڈ میں البتہ میں بڑے بڑے آرٹسٹوں اور فن کاروں سے ملا ہوں جنہوں نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ میرے اور ان کی ملاقات 60ء میں کراچی میں ہوئی تھی، جب انہوں نے سٹیج پر آنا چھوڑ دیا تھا اور ڈیزیز سینما میں دو آنے کے پتی دار تھے۔ اس وقت ان کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ نہ تھی۔ افسوس کہ طبقاتی نظام میں حالات کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتے..... خاص طور پر فن کاروں، ادیبوں، شاعروں اور تخلیق صلاحیت رکھنے والوں کے ساتھ بہت زیادتی کرتے ہیں۔ (کیمرہ بھائی چھیلا کا کلوز اپ دکھاتا ہے جو اس فقرے پر سر دھناتا ہے اور انگشت شہادت اٹھا کر اس کی تائید کرتا ہے) ماسٹر روشی نے گاہے گاہے کبھی میرے دفتر میں اور کبھی اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر دوستوں کی ایک مخصوص محفل میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ادائیگی کی باریکیوں سے ہمیں روشناس کرایا۔ ان کے فن سے بہرہ مند ہونے کے لئے ہمیں تخلیق کی جدلیاتی قدروں سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ماسٹر روشی کا فن ٹیکسپیرن تھیٹر اور مارکسی تصور تخلیق کا ایک ایسا سنگم ہے جس کی مثال ہمیں اور کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ گو ماسٹر صاحب شعوری طور پر ان دونوں چیزوں سے نا آشنا ہیں لیکن آرٹسٹ کے اندر کا جو ہر ایسی خود ساختگی اور خود تراشی کا حامل ہوتا ہے کہ کوزہ گر کی طرح برتن خود بن کر چاک سے اترنے لگتے ہیں۔

ایم سی: آپ کے خیال میں ماسٹر صاحب کو ابھی اور کام کرتے رہنا چاہئے تھا تا کہ وہ گمنامی کے گھور اندھیرے سے محفوظ رہتے؟

احمد بشیر: یہ آپ کیا فرما رہے ہیں حضور۔ ماسٹر صاحب کے گمنامی میں جانے اور اس طرح کسمپری کی حالت میں زندگی بسر کرنے کی ساری ذمہ داری معاشرے پر ہے جس نے ایک فن کار کو وقت سے پہلے بوڑھا کیا اور اب وقت سے پہلے مارنے کے لئے واردات کر رہا ہے۔ فن کار ایک انسان، ایک شخص یا ایک فرد نہیں ہوتا۔ وہ ایک مکتبہ فکر، ایک سکول آف تھاٹ ہوتا ہے۔ اس نے معاشرے کو اچھا دیا ہوتا ہے۔ اس نے معاشرے پر کچھ احسانات کئے ہوتے ہیں اور ان احسانات کا بدلہ چکانا معاشرے کے

فرائض میں داخل ہوتا ہے۔

ایم سی: خواتین و حضرات، ہمیں افسوس ہے کہ اس دلچسپ گفتگو میں اس پروگرام کے لئے مخصوص وقت پر توجہ نہ دے سکے اور باتوں کا سلسلہ طویل ہو گیا۔ اب میں احمد بشیر صاحب سے معذرت کے ساتھ سیدہ ماسٹر روٹی صاحب سے سوال کرتا ہوں کہ انہیں اپنے فن اور اپنی زندگی کے بارے میں کیا کہنا ہے اور آنے والوں فن کاروں کو کیا نصیحت کرنے ہے۔

ماسٹر روٹی: میں، اور اپنے بارے میں کچھ کہوں! میں، اور اپنی زندگی کے حالات سناؤں! میں، اور کسی کو نصیحت کروں! ہا ہا ہا۔ خیال دلرباستان، پیکر بے وفائی، جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر، ظالم کے دل کی طرح سیاہ رات، اور تاریک ہو جا۔ بالکل ڈراؤنی ہو جا۔ ہم خوف کھانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ لیکن اے باد صبا، اے نسیم سحر! تو اپنے جھونکوں سے، اٹھکیلیوں سے خرام ناز چلتی ہے اور مرجھائے ہوئے دل والوں کے ساتھ روح گلاب کا کام دیتی ہے۔ مگر یہ کیا بے انصافی ہے۔ کیا تو نے میرے زخم جگر کو ہر ارکھنے کی قسم کھائی ہے!

ایم سی: واہ وا کیا کہنے۔ آپ نے تو الفاظ کے روئے چن کر ایک رنگین محل کھڑا کر دیا۔

ماسٹر روٹی: مجھے آپ سے، آپ کے ناظرین سے یا اس ٹی وی کیمرے سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں لوگوں کی ناقد رشناسی اور اہل ثروت کی بے قدری کا رونا کب تک روؤں اور کس کس دیوار سے سر ٹکراؤں اور کس کس کے سامنے در یوزہ کا دامن پھیلاؤں۔ میں ایک احسان فراموش اور بے دید زمانے میں پیدا ہوا اور فن کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوا۔ میں نے اپنے معاشرے پر، اپنی قوم پر، اپنے ہم نفسوں اور ہم جیسوں پر احسان کئے۔ ان کے قدموں میں اپنے فن کے پھولوں کو بچھا دیا۔ ان کی بے رخی کے سامنے اپنے سروں کو سجدے کرائے۔ ان کی کیف اور بے رنگ ساعتوں کو اپنے خون جگر سے سچا اور اس کا انعام کیا پایا..... دو وقت کی سوکھی روٹی، موت کا قرب، بڑھاپا، ضعف، کابلی، گراں جانی، گمنامی، بے تعلقی..... میں پوچھتا ہوں میرے خدمات کے صلے میں میری قوم نے مجھے کیا دیا؟ میں پوچھتا ہوں میری خدمات کے جواب میں عوام نے مجھے کیا بخشا؟ میں پوچھتا ہوں.....

ایم سی: خواتین و حضرات، پروگرام "یاران کہن" کا وقت ختم ہوا۔ ایک ہفتہ بیچ اگلے ہفتے ہم پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ اس وقت تک کے لئے اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

عمدہ ہے آدم چائے _____ اعلیٰ ہے آدم چائے

ہر گھر میں ہر محفل میں _____ یہ رہتی ہے ہر دل میں

عمدہ ہے آدم چائے _____ اعلیٰ ہے آدم چائے

بڑی عمدہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ میرے دل کے سیلے سیلاب آنگن میں بہت سے چھوٹے چھوٹے غم ننگ دھڑنگ

بچوں کی طرح سر جوڑے سیلی مہا تابیاں روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے آج ایک آدمی کو مال روڈ پر دیکھا۔ وہ اس گرمی میں سمر کا سوٹ پہنے روتا ہوا جا رہا تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بار بار عینک اتار کر رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتا تھا اور آنسو پھر اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے تھے۔ میں چند قدم تک اس کے پیچھے چلا لیکن پھر میں نے اس کی پیروی چھوڑ دی۔ اگر میں اس کے رونے کی وجہ پوچھ بھی لیتا اور وہ بیان بھی کر دیتا تو میں کیا کر لیتا؟

گرمیوں کے اس تکلیف دہ اور گل گھونٹوں موسم میں ٹھنڈی ہوا، مستقبل کے لئے پس انداز کے بینک بیلنس کی طرح سہانی اور خوش گوار ہے۔ جس الماری میں چیک بک، ڈیفنس سیونگ سرٹیفیکٹ، آدم جی شوگرل کے شمیرز، این آئی ٹی یونٹ، ای ایف یو کی پالیسی اور مکان کی رجسٹری رکھی ہے، اس کا پٹ کھولو تو اس میں سے بھی ایسی ہی ٹھنڈی ہوا آیا کرتی ہے، چاہے موسم کوئی بھی ہو۔ ملازم نے کہا "کوئی بابا ابراہیم آپ سے ملنے آیا ہے۔"

میں نے کہا "اسے یہیں لان میں بھیج دو اور چھوٹا موڑ ہا میرے سامنے رکھ دو۔"

ٹھنڈی ہوا کو ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا بابا ابراہیم میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا "بیٹھ جاؤ بابا جی اور حکم کرو۔"

بابا ابراہیم ذرا سا جھک کر موڑھے کو ٹٹول کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "غریب نواز! میرا نام ابراہیم کھرا دیا ہے اور میں پورے تیرے سال

پلنگوں اور منجیوں کے پاؤں کھرا دتا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اچھا بابا جی۔۔۔ شاباش!"

کہنے لگا "پچھلے سال سے آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے اور مجھ سے کام نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "بابا جی کوئی پتر؟ کوئی دھی؟"

کہنے لگا "کوئی نہیں جی۔۔۔ ایک پتر تھا۔ اس کو کھرا دکا کام سکھایا تھا پر وہ سنہ پینٹھ والی جنگ میں گولا بردارک میں چڑھاتا

ہوا شہید ہو گیا۔ خیر چنگار رہا۔ اپنا مقدر تھوٹھکا بنا گیا، پر بابے کو اکیلا چھوڑ گیا۔"

میں نے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے بابا جی۔"

بولا "....." نہیں "افسوس کی کوئی بات نہیں بس ٹیم مشکل سے پاس ہوتا ہے۔ میں کریم بخش ترکان کے چھپر میں رہتا ہوں۔ منجی

بھی ہے، پانی کا گھڑالوٹا بھی ہے۔ جمعرات کے جمعرات کریم بخش ایک روپیہ بھی دے دیتا ہے۔ پھر بھی مشکل ہے۔ ان پانی کی گز نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "بزرگو، پھر کیا کروں؟"

کہنے لگا "موچی دروازے گھائی پر رشید خاں وکیل نے حضور کا پتہ دیا تھا کہ ریڈوے پر آپ نے ماسٹر روشی کا نام بول کر قوم سے

اور گورنمنٹ سے بڑھاپے میں اس کا ہاتھ پکڑنے کی درخواست کی تھی۔"

میں نے کہا "ہاں ریڈیو پر، ٹیلی ویژن پر، اخبار میں، سب جگہ اس کے لئے کوشش کی جا رہی ہے۔"

کہنے لگا "پچی کورو پے مہینہ میرے نام بھی لگوا دے۔ میرا ٹیم پاس ہو جائے گا۔"
میں نے کہا "بزرگوں! وہ فن کار ہے، آرٹسٹ ہے، صدا کار ہے۔ اس کے قوم پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔ آپ نے قوم کے لئے کیا کیا ہے؟"

بابا ابراہیم نے ڈرتے ڈرتے کہا "جناب میں تیرہ سال قوم کے واسطے پاوے بناتا رہا ہوں۔"
میں نے ہنس کر کہا "بابا اس سے قوم کو کیا فائدہ پہنچا!"

کہنے لگا "جناب قوم منجیاں کھاٹاں تے سوندی رہی اے۔"

میں نے کہا "بابا تو کوئی اللہ واسطے پاوے بناتا رہے ہے؟ دہاڑی بھی تولیتا ہوگا؟"

کہنے لگا "ہاں جی، جھوٹ نہیں بولنا۔ ڈیڑھ روپے روز سے دہاڑی شروع کی تھی، سات روپے روز پر آ کر ختم ہوئی۔ بڑے پیسے

بنائے عالی جاہ۔ برا اچھا ٹیم پاس کیتا۔ پر اب مجبوری ہے، موتے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا۔ ہو سکتے تو وظیفہ لگوا دیو۔"

میں نے کہا "یہ کام مشکل ہے۔ تم نے اپنے ذہن سے یا اپنے فن سے یا اپنی فکر سے قوم کی خدمت کی ہوتی تو میں تمہارا کیس لے کر

چلتا بھی اور تمہارا قوم پر حق بھی بنتا۔ یہ پاوے بنا کر اور گنڈھے بچ کر قوم کی خدمت نہیں ہوتی۔ قوم کی خدمت صرف ذہنی کام کرنے والے

کرتے ہیں، ہتھیں کام کرنے والے نہیں۔"

کہنے لگا "ہاں جی، یہ بات تو آپ کی چالی سیری سولہ آنے ہے۔ دہاڑی تو میں لیتا رہا ہوں۔ پہلے پہل ڈیڑھ روپیہ روز، آخری

دنوں میں ست روپے روز..... میرا ارادہ تو نہیں تھا خاص، وہ اپنے رشید خاں وکیل نے زبردستی بھیج دیا۔ السلام علیکم!"

میں نے کہا "وعلیکم السلام"

اور بابا ابراہیم ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کو کبا کبا کر ٹٹولتا ہوا لان سے باہر نکل گیا۔

Virtual Home
for Real People

خانگی سیاست

انجمن چوکی پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اسے اپنے بچپن کا ساتھی رمدایا آگیا جو اس کی جوتیاں بغل میں دبا کر اس کے پیچھے دم کٹے کتے کی طرح پھرا کرتا تھا۔ دن بھر میں صرف گھڑی دو گھڑی انجمن کا ساتھی بننے کے لئے اسے ہر وقت خوشامدیں کرنا پڑتیں، الٹی سیدھی چالیں چلانا ہوتیں اور اس کی کہنی کے پوڑھے کو کتنی ہی مرتبہ سہلانا پڑتا جس کا نہ تو انگوری ہی بھرتا تھا اور نہ زخم ہرا ہوتا تھا۔ آج اتنے سالوں بعد انجمن کو رمدایا آیا! بہت ممکن ہے یہ بچہ بھی رمدایا کی طرح چماری لڑکیوں کی جوتیاں اٹھائے پھرے اور _____ اس کے بچے نے قلابازی لگا چاہی اور وہ درد سے بے تاب ہو گئی۔ چوکی پر لیٹ کر اس نے اپنی شنیل کی شلوار کے پائینچے اوپر کھینچ لئے اور ایک نظر سفید سفید پنڈلیوں کو دیکھا جن پر کولمبال سنہری سنپولیوں کی طرح کندلیاں مارے سو رہے تھے۔ آستنیوں کے بٹن کھول کر اس نے باہیں چڑھالیں اور اپنے عریاں بازوؤں کو سونگھنے لگی۔ پسینے کی ہلکی سی مہک اس کی ناک کو کندھوں کی طرف کھینچ لے گئی اور وہ اسی کھیل میں مگن ہو گئی۔ "آج یہ کمبخت مجھے مار ڈالے گا" اس نے آہستہ سے کہا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے ہونے والے بچے کی پوشیدہ شرارتوں سے دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ "ناک میں دم کر رکھا ہے شریر نے، کاش یہ اتنا حسین بھی ہوتا جتنا من چلا ہے" اس نے ایک سانس بھری اور خود ہی اپنے آپ کو ڈھارس بندھا نے لگی۔ "کیوں نہ ہوگا۔ باپ پر تو جائے گا ہی پتا پر گھوڑا _____ اور مجھ پر؟ مجھ سے تو حسن لے سکے گا تھوڑا بہت _____" آج اسے اپنے حسن کا رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ میدہ اور شہاب پنڈلیاں ایک دفعہ اس نے پھر دیکھیں اور خوش ہونے لگی، مگر بچہ تھا کہ اپنی جیسی کئے جاتا تھا۔ انجمن نے دو چار لمبے لمبے سانس کھینچ کر اسے ایسا دھتاتایا کہ خاموش سو رہا۔ صحن خالی پڑا تھا۔ اس نے اپنے انگ انگ پر ہاتھ پھیرا اور ایک عجیب لذت محسوس کی۔ شادی سے پہلے یہ بات نہ تھی۔ چٹاخ سے غسل خانے کی چٹخی گری اور قمر چڑتے ہوئے بال تولنے میں لپیٹے باہر نکلی پھنسی ہوئی قمیص گلے کے پاس بھیک چکی تھی اور پھٹی پڑتی تھی۔ اسے دیکھ کر انجمن نے اپنے کو سنبھالا۔ اٹھی اور پلنگ سے تولیہ اٹھا کر حمام کی طرف چل دی۔ قمر کا دل چاہتا تھا کہ کاش کوئی اس کے جسم پر ایسی برقی شعائیں چھڑک دے جو پل بھر میں سارے جسم کو میموں کی طرح سفید بنادیں یا برص کے مریضوں کی طرح گلابی گلابی۔ اندر آ کر اس نے اپنی قمیص اتار دی اور پاؤں کا ڈبہ لے کر سنولائی ہوئی جلد پر پل پڑی۔ دن رات یہی ایک خیال تھا جو اسے گھن کی طرح کھائے جاتا تھا۔ "انجمن سفید ہے، گوری ہے، دودھ کی طرح چٹی ہے۔" کبھی بھی

اس کا ذہن اس بات کو نہ سوچ سکا کہ انجمن کی ناک مانو پللی کی سی ہے، اس کے کان لمبے لمبے اور ہموار ہیں، چہرے کے مسام سیاہی چوس کی طرح اپنے دہن کھولے رکھتے ہیں اور چہنیاں سی آنکھیں ہر دم جھپکتی رہتی ہیں۔ سفید تھی تو کیا ہوا، قبر کے سر ہانے صلیب بھی تو سفید ہی ہوتی ہے۔

دونوں کی شادی ایک ساتھ ایک ہی گھر میں ہوئی، مگر ذرا بے ترتیبی کے ساتھ..... یعنی انجمن جو چھوٹی تھی، اس کے بڑے کے ساتھ اور قمر جو بڑی تھی، وہ چھوٹے کے ساتھ باہی گئی۔ خالہ ساس بنی اور خالو سسر اور بچپن کے دھینگا مشتی کرنے والے بھائی اب خاوند قرار دیئے گئے۔

قمر کو اپنے ناسفید ہونے کا کافی احساس تھا اور انجمن کو اپنی ننھی ننھی زیرہ سی آنکھیں بہت بری لگتی تھی۔ دن میں بار بار دنبالہ دار سرمہ مگر وہ کجخت زیرہ سے لونگ بھی تو نہ ہو سکتیں۔ رنگ سفید تھا اور بہت سفید۔ ہر ایک نظر پہلے ادھری ہی پڑتی اور پھر اسی کے چہرے پر ٹک جاتی۔ یہی اس کی انتہائی خوشی کا موجب تھی۔ قمر گھر کے کام کاج میں ذرا ہاتھ بٹاتی تھی اور ہر نئے آنے والے کو اپنی خدمت سے موہ لیتی۔ ہر کوئی اپنے آرام کو دیکھتا ہے، کسی کی شکل کو نہیں..... اماں ایران ہانپتی کا نپتی ادھر آتی تو قمر جھٹ پان لگا کر پیش کرتی۔

خوش باش بیٹی خوش باش _____ ہو _____ چہ کنم رنج و غم۔ مصائب زمانہ ہو بیٹا، عمرت دراز باد۔ بابا سلامت مالک سلامت
خوش باش ہو _____ چہ کنم، ہا _____ اور _____ اور _____ بیا _____ بیا قمر _____ بیٹا _____ چہ کنم
_____ ہو _____ شادی، بیاہ، سہرا _____ خوش روی سلامت روی۔ قمر خوب _____ سلامت سلامت!! _____ اور پھر قمر
اندر دوڑتی جاتی۔

شادی بیاہ ایسی دونالی بندوق ہے جسے چلتی ہوئی دیکھ کر لڑکیاں بہت خوش ہوتی ہیں اور پھر اس کی "دھائیں" سن کر یوں اندر دوڑ جاتی ہیں جیسے وہاں جا کر اس کی آواز اور بھی بھلی معلوم ہوگی۔ انجمن کہتی "پتہ نہیں باجی کو یہ اماں ایران کیوں پسند ہے۔ بوڑھی چھپکلی تھل تھل کرتی بد بودار عورت جس کے سینے میں لٹکتی ہوئی رسولی تیسری چھاتی معلوم پڑتی تھی _____ آخ تھو! _____ آخری باجی اس اماں میں ہے کیا جو تو اسے پان دینے دوڑتی ہے؟" انجمن پوچھتی اور پھر ہمہ تن گوش ہو جاتی۔ "بھئی سچی بات تو یہ ہے جو باجی کی تعریف کر دے، باجی اس کی۔" قالین پر لیٹا ہوا ابرار "حسین زمانہ" پڑھتا ہوا کہتا۔ انجمن ایک دم قہقہہ لگائی جو اندھی چمگاڑ کی طرح چھوٹے سے کمرے کی چاروں دیواروں سے ٹکراتا۔ "ہوں" باجی چڑھ جاتی "مجھے تعریف سے کیا! ہمیں پونڈ تھوڑی مل جاتے ہیں۔"

"جیہی تو میں پوچھتی ہوں باجی"

"بڑی فتنی ہے تو انجمن!"

"کیوں باجی؟"

"کہ باجی سے ایسی بات پوچھتی ہے جو وہ بتا نہیں سکتی۔" ابرار پھر کہتا اور خوشی کی ایک کرن انجمن کے چہرے پر ناچنے لگتی۔

"تو ہماری باتوں میں دخل دینے والا کون ہوتا ہے بے؟" باجی پوچھتی۔ تو وہ پھر اپنا رسالہ پڑھنے لگتا۔ پھر ذرا خاموشی رہتی، جسے

ابراہیم ہی توڑتا۔ "دیکھ انجمن! زنا نہ حسن و آرائش کا سامان کتنا ستا فروخت ہو رہا ہے۔" وہ ایک اشتہار دکھاتا اور جب وہ رسالہ پکڑنے لگتی تو ہاتھ پیچھے کھینچ کر کہتا "چکالے اپنے منہ کو بلور کی طرح، تیرا خاوند بھی کیا یاد کرے گا کہ ابراہیم کی بہن سے واسطہ پڑا تھا"۔ "چپ!"

بے

شرم "وہ ہاتھ کھینچ لیتی۔

"دل میں چاہے لڈو پھوٹ رہے ہوں۔ ہے ناں باجی؟" باجی پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی کہ اس کی ہاں میں ہاں ملائے یا

نہ۔

امی کا بھی یہی خیال تھا کہ قمر کی کیسی ہی سہی ہے اچھی۔ تھوڑا بہت کام تو کر دیتی ہے۔ کبھی روتا ہوا بچہ اٹھالیا، کبھی چھالیہ کتر کر پان دان بھر دیا اور گاہے چھوٹے بچوں کا منہ بھی دھلا دیا۔ اور انجمن جودن بھر میں تین پتلونوں کی ترپائی کرتی، چھ قمیضوں کے بٹن ٹانکتی اور دو چار چھوٹے چھوٹے پانچاے سیتی، کسی گنتی میں ہی نہ تھی کہ سارا دن بیٹھی بیٹھی ہی تو یہ کام کرتی تھی۔ وہ کام ہی کیا جو بیٹھ کر ہو جائے۔

مراد آباد والی خالہ آئیں تو انہیں انجمن بہت اچھی لگی۔ گوری چٹی چینی کی جاپانی گڑیا۔

"صدقے جاؤں انجمن تو اب بہت خوبصورت ہو گئی۔" انجمن بظاہر جھینپ گئی۔ قمر پاس ہی بیٹھی تھی، کٹاری سی لگی۔ اللہ میاں اور خالہ بی دونوں کو کوسنے لگی، بس چلتا تو انجمن کا سانس پی جاتی۔ دن بھر خالہ بی انجمن کے ہاتھ کے بنے ہوئے سویٹر اور اس کی سلائی کے نمونے دیکھتی رہی۔ قمر نے بھی نہایت مشقت کا نکالا ہوا کریپ کا ایک دوپٹہ چڑے کے بکس سے نکال کر پاس پڑے ہوئے بڑے ٹرک پر ڈال دیا کہ شاید بھولے سے خالہ کی نظر ادھر بھی پڑ جائے، مگر وہ پڑتی ہی کیوں! رات کو سوتے وقت انجمن نے کہا "خالہ بی اچھی ہیں بے چاری۔" کیوں باجی؟

"ہیں" قمر نے چونک کر پوچھا اور پھر ایک ٹھنڈی سی "ہوں" کر کے خاموش ہو گئی۔

"اگلے وقتوں کی ہیں سیدھی سادی سی!

"ہاں!"

"وہ پیراشوٹ کی قمیض کا جوگلا میں نے بنایا تھا، خالہ اس کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔ کیا ہے بھلا باجی پھانسی کا پھندا سا، مجھے تو ذرا

بھی پسند نہیں۔"

"کیوں؟" قمر نے چونک کر پوچھا "بہت اچھا ہے۔ ایسے ہی تو ہوتے ہیں گلے۔"

انجمن جل گئی کہ باجی نے قمر اور واقعی داؤ نہیں دی اور باجی سوچ رہی تھی کہ اب یہ لڑکی خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ شکل کے ساتھ ساتھ لوگ اس کے کام کی بھی تعریف کرنے لگے ہیں۔ ایک نامعلوم کرب سا تھا جو اس کی روح کو فنا کئے جا رہا تھا۔ جس نے اس کی برتری کے لباس کو پھاڑ دیا تھا اور اب کسی اور کی تعریف تپے ہوئے لوہے کے پترے کی طرح اس کے جسم سے چمٹ جاتی تھی۔ اسی دن شام کو انجمن کے ہاتھ منجھڑا یوڈین کی پورے بارہ اونس کی بوتل چھوٹ کر ٹوٹ گئی۔ امی کی زبان کا ٹانکا ٹوٹ گیا۔ وہ بے نقط سنائیں کہ شیطان

بھی پناہ مانگنے لگا۔ خالہ بی نے لاکھ صفائی پیش کی مگر اپنا سامنہ لے کے رہ گئیں۔ انجمن بستروں کے ڈھیر میں دھنس کر رونے لگی اور قمر نے زمین پر بکھرے ہوئے کانچ کے ٹکڑے پہلے ایک کاغذ پر جمع کئے پھر ردی کے ڈھول میں پھینک آئی۔ سارے کمرے میں آیوڈین کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی جہاں قمر ایک جہاندیدہ نرس کی طرح پھر رہی تھی۔ جوں جوں انجمن سسکیاں بھرتی، اس کے دل کا غبار دھواں بن کر جھسک! جھسک!! کرتا ہوا اوپر کواٹھتا اور وہ اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرنے لگتی۔

دو چار دن بعد خالہ نے قمر کی اہمیت کو محسوس کیا۔ وہ وقت بے وقت اٹھنے پر گریز نہ کرتی۔ رات کو گھر بھر کی کنڈیاں کھٹکے چڑھا کر سوتی۔ سرشام ہی سے مکان کا کونا کونا نیو لے کی طرح سوگھمتی اور باہر جانے والی موریوں میں اینٹیں پھنسا دیتی۔ رات کو کوئی بچہ منمنایا اور اس نے لپک کر اٹھا لیا۔ کبھی موقع ملا تو خالہ بی کے پاؤں بھی داب دیئے۔ اب وہ قمر کی طرف داری کرنے لگی تھیں۔ گودونوں بہنوں کی درپردہ کھٹک سے بخوبی واقف تھیں مگر اپنا الو سیدھا کرنے کا موقع دیکھ کر اس رنگ میں ڈھل جاتیں۔ دوپہر کو قمر ڈلی کتر رہی تھی۔ خالہ کو پان کی سخت طلب لگ رہی تھی۔ امی بچی کو گود میں ڈالے تدرکۃ الاولیاء پڑھ رہی تھیں اور انجمن فرش پر بیٹھی فراک سی رہی تھی۔ خالہ منہ پکا کر کہنے لگیں ”بھئی خدا کی خدائی اور محمد کی بادشاہی میں کہوں پر کہوں قمر جتنا کام آج کی کوئی لونڈیا بھلا کیا کرے گی۔“ انجمن نے یوں محسوس کیا جیسے خالہ نے پیک بھرا تھوک اس کے منہ پر اگل دیا ہو۔ آخر کیا کام کرتی ہے قمر؟ سارا دن قمر ساری رات قمر۔ کڈ کڑے مارتی پھرتی ہے پھر کلونتی کی کلونتی۔ آنکھ نہ ناک بنو چاند کی سی۔ اس کا دل چاہا کہ ساری باتیں پکار کر کہہ دے مگر اس جگہ تو سبھی لوگ موجود تھے۔ خود باجی بھی وہیں موجود تھیں وہ کہتی تو کیسے؟ اور خالہ نے پان لے کر ظلم جو کیا تو پلنگ سے نیچے اتر کر فرش پر بیٹھ گئیں، کلی میں بیڑا دبا کر اگل دان میں پچکاری چھوڑی پھر دو فراک ہاتھ میں پکڑ کر بولیں ”بس رات بھر میائی اور ایک بچہ بیائی۔“ صبح سے لے کر اب تک یہی دو فراک!، قمر ہنسنے لگی۔ انجمن کے لئے زمین سخت اور آسمان دور والا معاملہ تھا۔ منہ نیچے کر کے مشین کی ہتھی زور سے گھمانے لگی۔ خالہ نے گھڑی کے سامنے کھڑی ہوئی قمر کو دیکھا۔ روشنی سلاخوں سے گزر کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اس سے اس کی آنکھوں کے موتی اور چمکنے لگ گئے تھے۔ اس نے ایک دفعہ کوشش بھی کی کہ اٹھ کر پاؤں پر سر رکھ دے اور شبیر کے لئے رشتہ مانگ لے، مگر اٹھ نہ سکی۔ اسے معلوم تھا کہ سب جانتے ہیں شبیر بیڑی پیتا ہے۔ گلے میں سرخ رومال اور ہاتھ میں سیاہ ڈنڈا رکھتا ہے، کندھوں تک گھنگھریا لے بال چھوڑ رکھے ہیں اور ستھروں کے ساتھ مل کر ”پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے“ گاتا ہے۔ خالہ جلدی جلدی پان چبانے لگی اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوئی قمر کو تنکنے لگی جواب ذہنی طور پر اس کی بہو بن چکی تھی۔

جلیل بھائی سے اپنے بچے کا علاج کرانے یہاں آئے تو چند دن میں ہی قمر کی خدمت گزار طبیعت کو بھانپ لیا۔ وہ انہیں ہر صبح شیو کے لئے گرم پانی کر دیتی۔ چائے بنا کر لاتی۔ بوٹوں کو پالش بھی کر دیتی اور ہر شام سونے سے پہلے بجلی کی استری گرما کر ان کی چڑھ قسم کی پتلون پر استری پھیر دیتی۔ ایک شام انہوں نے سینما چلنے کو کہا۔ قمر جھٹ سے برقہ پہن کر تیار ہو گئی اور انجمن کو اسی طرح کھڑے دیکھ کر بولی ”انجمن! چلو سینما چلتی ہو؟“ اس نے جلیل بھائی کو یہ کہنے کو موقع ہی نہ دیا اور جب اس نے ساتھ جانے کی رضا مندی ظاہر کی تو برقہ لہراتی ہوئی جھٹ پٹ باہر نکل آئی جیسے اپنی دعوت کی غلطی کا مداوا کر رہی ہو۔ انجمن نے کھڑی سے دیکھا، ان کا تانگہ بہت دور جا چکا

تھا۔ ”دونوں سو رہیں“ اس نے آہستہ سے کہا اور بستر کے انبار میں جا کر لیٹ رہی۔ پھر اٹھی اور قمر کی تصویر اس کے بکس سے نکال کر زمین پر پھینک دی۔ اس پر پاؤں رکھ کر دیر تک کھڑی رہی، بعد میں ٹھوکر مار کر کنستروں کے پیچھے پھینک دی۔

ایک انہونی سی نفرت تھی جو دونوں طرف سے شعلے کی طرح لپک رہی تھی۔ یوں تو دونوں دن بھر اکٹھی کھاتی پیتیں اور ساتھ ساتھ سوتیں پران کے درمیان ہزاروں فرسنگ کا فاصلہ تھا جو کسی صورت بھی قرب میں بدلتا نظر نہ آتا تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک تو ان کی زندگی اچھی رہی۔ چھینا جھپٹی اور مار پیٹ میں وقت گزر گیا، لیکن اب سکون کا ایک لمحہ بھی کاٹے نہ کٹتا تھا۔ ان کے اس ناقابل عبور بعد کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی تھیں جو ایک کی موجودگی میں دوسری کی تعریف کر دیتے اور وہ بھی اس رنگ میں کہ دوسری انگاروں پر لوٹنے لگے۔

قمر بیمار پڑی اور ایسی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ تپ محرقہ اس خاندان میں جس جو چڑھتا، لحد میں لے کر اترتا۔ گھر بھر میں فکری کی لہر دوڑ گئی۔ امی بیچاری دن بھر اس کے پاس نہ بیٹھ سکتیں، چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور مرض متعدی! انجمن کو بھی فکر پڑی۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ باجی کے بال جھڑ رہے تھے اور آنکھیں چمکی جا رہی تھیں۔ انجمن اپنی سرد مہری پر بہت نادم ہوئی۔ رات بھر لحاف میں منہ چھپا کر روتی رہی۔ ”اگر باجی مر گئی! اگر باجی مر گئی تو اس کا خون کس کی گردن پر ہوگا؟“ رات بھر یہ آوازیں اس کے کانوں میں گونجتی رہیں، جیسے کوئی دیوانہ کسی کھنڈر میں اونچے اونچے ہنس رہا ہو۔ پھر مری ہوئی باجی کا دھویا دھایا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور قمر کے بستر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے سر ہانے مدھم سا بلبل جل رہا تھا اور وہ کروٹ بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انجمن اس کے پاس جا کر کھڑ ہو گئی۔ ”کیوں کیا ہے باجی؟“

قمر نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھ کر لبوں پر زبان پھیرنے لگی۔ تپائی پر پڑے ہوئے چینی کے پیالے مین سے انجمن نے پانی سے تر رومال اٹھایا اور اس کے لبوں میں ٹپکا دیا، پھر اس کے سر ہانے بیٹھ کر سرد بانے لگی۔ باجی تو ایک دم بدل گئی ہے، اس نے سوچا اور اس کے ساتھ لیٹنے کی خواہش عود کر آئی، مگر اس کا مرض خوف ناک تھا۔ انجمن نے اپنی جان کو پیار سے دیکھا اور وہ خیال چھوڑ دیا۔

دوسرے دن چچا ابا عیادت کے لئے آئے۔ چند لمحے قمر کے پاس بیٹھے حقہ گڑ گڑاتے رہے۔ شام کو پھر مریض کے پاس ایک چکر لگا کر گھر چلنے کو تیار ہوئے تو دکھی دل بن کر کہنے لگے ”میری اس رام گنو کو تو اللہ کبھی بیمار بھی نہ کرے۔ گھر کی رونق اجڑ گئی ہے۔ اب یہاں کوئی پانی تک کو تو پوچھتا نہیں نہ کوئی اس آنکھ مندی کے پاس آ کر بیٹھتا ہے۔ پتہ نہیں اس گھر میں قمر سے ہمدردی کرنے والا بھی کوئی ہے کہ نہیں!“ وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے مگر انجمن کو تنگنے کے لئے چھوڑ گئے۔ تھوڑی سی ہمدردی جو باجی کے متعلق اس دل میں پیدا ہو چکی تھی، بھک سے بارود کی طرح جل بجھی اور وہ قمر سے اتنی ہی دور ہو گئی جتنی پہلے تھی۔ امی، ابا، ابراہن حتیٰ کہ ماما نے بھی اس کے رویہ کو بری نظروں سے دیکھا مگر وہ قمر کے بستر کے پاس تک نہ پھنکی۔ اٹھائیسویں دن کہیں جا کر قمر کا بخار اتر ا۔ اب وہ بہت نحیف ہو گئی تھی۔ سر کے بال جھڑ چکے تھے۔ دن بھر پلنگ پر لیٹ بڑبڑا رہی تھی۔ گھر کے لوگ اس کی موت سے بے خوف ہو گئے۔ امی بہت کم اس کے پاس بیٹھتیں۔ اب وہ بیمار نہیں تھیں، کمزور تھی۔ گھر کا تھوڑا سا کام انجمن نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اب وہی اماں ایرائن کو پان

بنا کر دیتی۔ خالو بابا کے حقہ اور پان کا انتظام کرتی۔ امی کے بچوں کا منہ دھلاتی اور ماما کو دال بگھارنے میں مدد دیتی۔ سب اس کے حسن اور حسن انتظام کی تعریف کرنے لگے۔ اسے قمر سے محبت ہو گئی۔ وہ اس کے لئے جی کا دلیرہ پکاتی۔ کوئیکر اوٹس دودھ میں ابالتی اور خود اپنے ہاتھوں سے باجی کو کھلاتی۔ انسان کی یادداشت بہت کمزور ہے، وہ ماضی کو بہت جلد بھول جاتا ہے۔ لوگوں کو قمر کی دیرینہ خدمت بھول گئی، وہ انجمن کی محبت کے گن گانے لگے اور انجمن کی حیثیت قمر کے لئے بڑھتی گئی، بڑھتی گئی۔

خالہ نے جہاں قمر کو مانگا تھا وہاں انجمن کا رشتہ بھی کھلو الیا۔ سعید اب شادی کرنے پر رضامند ہو گیا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی کی منگنی کے بعد اسے بھی خیال پیدا ہوا کہ کہیں تکلف میں عمر بھر کنوار ہی نہ رہ جاؤں۔ اس وجہ سے اسے انجمن ملی۔ دونوں بہنوں کے ڈولے ایک دم اٹھے اور ایک ساتھ اترے۔ دیکھنے والیوں نے انجمن کو پسند کیا۔ کیا لڑکی ہے، جانو سنگ مرمر کی جیتی جاگتی مورت۔ ایسی بھی تھیں جنہیں قمر کی مشرقی تراشیں پسند آئیں مگر وہ بہت تھوڑی تھیں۔ جو کوئی آتا، انجمن کے حسن کی تعریفیں کرتا۔ قمر سنتی، خار چھوڑ کٹار کا زخم لگتا۔ ایک دو چکر بہو بنے گزر گئے تو قمر نے باورچی خانہ میں جانا شروع کیا۔ مغلائی سے محبت کی پیٹنگیں بڑھالیں اور رات کو خالہ کے پاؤں دبانے لگی۔ وہ تھنیا کی ماری اوپر سے تو نہ نہ کرتی رہتیں مگر پہلو بدل بدل کر قمر کی خاصی "ٹرائی" لیتیں۔ انجمن اور اس کا خاوند بڑے مزے سے سوتے رہتے اور جب قمر کا شوہر شام کا کھانا کھانے کے بعد چکر لگا کر گھر واپس آتا تو قمر کو اپنی والدہ کے پاؤں دباتے ہوئے دیکھ کر بہت کڑھتا۔ وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر تلوے سہلانے لگتا اور کبھی کبھی اپنا ایک ہاتھ تھام کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکے دینے لگتا۔ قمر ہاتھ سے پرے دھکیلتی تو وہ اور شیر ہو جاتا اور اس کی ران میں پھنسی ساٹن کی شلوار پر زور سے چٹکی بھرتا تو وہ تڑپ اٹھتی۔ وہ پھر تلوے سہلانے لگتا۔ ذرا دیر کے بعد پھر یہ کھیل شروع ہو جاتا تو اس کی والدہ گھبرا کر کہتیں "بس بھئی اب تم سو جاؤ۔ ہاں بس! اب آرام ہے، بہت آرام۔" وحید ایک دم اٹھ کھڑا ہو تا اور قمر بدستور دبائے جاتی۔ اسے اگر قمر سے کوئی شکایت تھی تو یہی کہ وہ اس کے سب کاموں میں سے "ذرا اور ہر تو آنا" کو بہت دیر سے مانتی ہے۔ انجمن کو پتہ بھی نہ تھا کہ خالد گھٹیا کی مریض ہیں اور انہیں پاؤں دبانے کی بھی ضرورت ہے۔ وہ تو باتوں باتوں میں ہی چوم چاٹ کے چھوڑ دیتی۔ اس کے خاوند نے آج تک اپنی والدہ کی ٹانگیں چھو کے بھی نہ دیکھی تھیں کہ چورس ہیں یا گول!

جسے ہر روز آرام ملے، وہ آرام دینے والے کے گن گیوں نہ گائے۔ والدہ قمر کی تعریفیں کرنے لگیں۔ "طبعیت کی بہت اہمی ہے قمر" سے شروع ہو کر بات "ہوا انجمن نخرے پیٹی تو دن بھر اپنے بناؤ سنگار میں ہی لگی رہتی ہے" تک جا پہنچی۔ گھر کی فضا پہلے میالی سی ہو گئی اور پھر سیاہ! اٹڈ گھمڈ کر بادل آئے اور تل دہار بارش ہونے لگی۔

"خالد جان مجھے ہر وقت بولیاں مارتی رہتی ہیں۔" انجمن نے ٹسوے بہاتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟"..... باجی..... باجی

"باجی کیا؟"

"باجی..... قمر باجی..... پتہ نہیں کیا کیا کہتی ہیں ان سے؟"

"یہ باجی بھی عجیب ہے تمہاری!"

"عجیب ہی تر ہے۔ ہر ایک کو بھاڑے۔ پہ ڈال لیتی ہے..... بھیا کو دیکھو کیسے تل چاٹتے ہیں بنوکے۔"

"میں تو سمجھتا تھا قمر سیدھی سادھی ہے بچاری۔" سعید نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی ایک ہی کہی، بالی اور سیدھی۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟" انجمن نے بن کر پوچھا۔

"کہا تو کسی نے بھی نہیں پر میں نے خود ہی محسوس کیا۔ بچاری دن بھر ادھر ادھر آہلی گیلی جو بھرتی ہے۔ میں تو یہی سمجھتا رہا۔"

"آہلی گیلی، واہ! کنسویاں لیتی پھرتی ہے۔ اس کے پھپھروں لالوں میں نہ آ جانا۔" تو سعید متحیر ہو کر ادھر ادھر تنکنے لگا۔ اس کا چہرہ

اب قدرے محتاط دکھائی دیتا۔ کھوٹی پر لٹکے ہوئے کوٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور پھر انجمن کی ران پر سر رکھ کر کش کھینچنے لگا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا اور انجمن اس کے بالوں میں انگلی کھسکے جاتی تھی۔ گھر کے کام میں قمر ہی کو دخل تھا۔ خالہ کا کوئی مشورہ اس کے بغیر طے نہ ہو سکتا

تھا۔ باورچن اسے ہر بار نعمت خانے میں بلا کر پوچھتی "بی بی بھنڈی میں پانی تو نہ ڈالوں؟" حالانکہ اسے چالیس سال پہلے کا پتہ تھا کہ

بھنڈی میں پانی نہیں ڈالا کرتے۔ نصیر کوئی کاپی خریدنا ہوتی، لٹولانے کی ضرورت پڑ جاتی یا کنکواچڑھا چڑھانے کو دل چاہتا تو پیسے قمر و باجی سے ملتے۔ گوالا بھینسوں کے لئے بھوسہ چوکر لاتا تو باجی کو حساب دیتا۔ دھو بن کے کپڑے وہی لکھتی۔ درزی، قصائی، نائی، کنجڑہ، دھنیا، تیلی سب باجی بیگم سے درخواست کرتے اور اپنی محنت انہی سے وصول کرتے۔ وہ جہاں ان کا ایک آنہ ضبط کر لیتی، وہاں دوا آنے کی مزید

رعایت بھی دے دیتی۔ وہ سب اس کی دریا دلی کے معترف تھے اور جہاں اکٹھل بیٹھتے، قمر کی تعریف ضرور کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ بڑی

بہو تو کسی بڑے گھر کی بیٹی ہے۔ اپنی بیویوں سے ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے "خدا بخشے دلا اور حسین خان کی سگی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ وہی دل

گردہ، ویسا ہی رعب دا اور ویسا ہی نرم دل۔" قمر کی ہر دلچیزی کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور انجمن کا تنگ۔ گاؤں کے لوگ کچھ تو پہلے ہی سے

گورے رنگ کے خلاف ہوتے ہیں، کچھ انجمن کی طبیعت بھی ایسی ملنسار نہ تھی کہ ہر ایک کے من میں کھب جاتی۔ سعید کو ایک ضروری کام

سے باہر جانا پڑا۔ وہ چلا گیا تو انجمن سے بات کرنے والا بھی کوئی نہ رہا۔ اپنے کمرے میں منہ سر لپیٹے پڑی رہتی۔ قمر کی مقبولیت کا ڈنگا گھر

سے باہر بھی بچ رہا تھا۔ انجمن کو اس طرح نا کام دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی اور انجمن سے اس کا پیار بڑھ گیا۔ وہ دن بھر اسی کے کمرے میں

گھسی رہتی اور ہنستے ہنسانے کی باتیں کرتی مگر انجمن کا سل تو بجھتا ہی جا رہا تھا..... اس موم بتی کی طرح جو گھٹتے گھٹتے بالکل بجھ جاتی ہے اور

دھوئیں کہ لکیر ننھی پری کی روح کی مانند بل کھانے لگتی ہے۔ قمر ابھی بات بھی مکمل نہ کر پاتی کہ باہر سے آوازیں پڑنا شروع ہو جاتیں اور وہ

بظاہر مجبوریوں دکھاتی، مصروفیت کو کوستی باہر چلی آتی۔

انجمن کو اچانک پسلی درد کے دورے شروع ہو گئے، جو کسی علاج سے بھی نہ رک سکے۔ میٹھے تیل سے لے کر کارڈی مم آئیل تک کی

مالش ہوئی۔ جلد اچٹ گئی مگر درد نہ رکا۔ خالد کو بہت فکر ہوئی۔ مغلائی روز روز کوئی نئی دوائی لے کر آتی۔ بریٹھن نے ایک پور بی نسخہ بتایا۔

قصائی نے اپنے بیوی کے ہاتھ خصی بکرے کی چربی بھیجی۔ اس نے اپنی لڑکی سے جوان کے ہاں قرآن شریف پڑھنے جاتی، بہو کی بیماری کا

حل سنا تھا اس کا دعویٰ تھا کہ دوسرے سے تیسرا دن نہ ہوگا۔ چربی میں لونگ، الاچھی، جانفل کڑکڑایا گیا۔ پھر اس قوام کی مالش ہوئی مگر درد

بڑھتا ہی گیا۔ خالد کو خدشہ تھا۔ ایک تو انجمن دوجی سے تھی، دوسرے اس کا جسم اتنا نازک تھا کہ ہوا کے جھونکے سے ڈھنسل کی طرح ٹوٹ

جائے۔ وہ دن بھر اس کے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ خانہ داری کا سارا کام مکمل طور پر قمر کے کندھوں پر آ گیا۔ انجمن بستر میں بیٹھی دودھ ملائی کھاتی اور وہ سارا دن ادھر سے ادھر گھومتی رہتی۔ اب اسے انجمن پھر بری لگنے لگی تھی۔ پر نچی چڑیا سی فرنگن بندر یا۔ مگر صرف بری لگنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو کوئی آتا، انجمن کا حال پوچھتا۔ ہمسایہ عورتیں گھر میں داخل بعد کو ہوتیں، پہلے انجمن کی خیریت اور اس کی صحت کی دعائیں مانگنے لگتیں۔ قمر جھلا اٹھی تھی۔ اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا ورنہ وہ پکار پکار کر کہتی انجمن بیمار نہیں، بہانے کرتے ہے۔ اسے کوئی روگ نہیں کوئی تکلیف نہیں، اڑان گھائیاں بیماری ہے تو وہ بھوکے گھوڑے کی طرح ہنہنا کر ہنسنے لگا۔ "بھئی یہ عورتوں کی بیماریاں تم ہی جانو، ہمیں کیا خبر۔" قمر جل گئی۔ لمحہ بھر کو اس کا خاوند بھی اس کے دل سے اتر گیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ کر انگلیاں چٹانے لگی۔ کوئی بات نہ تھی جو وہ کرتی۔ ایک یہی خیال تھا جو روپ بدل بدل کر اس کے سامن راس دھاریوں کی طرح ناچ رہا تھا۔

"ادھر دیکھنا مت" اس کے خاوند نے ڈھیلا منہ کر کے کہا، "ہم تنہا پہننے لگے ہیں۔" پھر وہ سیٹی بجانے لگا اور چرچراتے ہوئے پلنگ پر دھم سے گر کر بولا "لو بھئی، اب دیکھ لو۔" مگر جب وہ اسی طرح بیٹھی رہی تو اسے فکر ہوئی مبادا وہ اس سے روٹھ گئی ہو۔ چارپائی سے اٹھ کر وہ اسے اپنے ساتھ لوالایا اور منہ اونچا کر کے پوچھنے لگا:

"ہم سے روٹھی ہو؟"

"نہیں"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں"

"کچھ تو ہے۔"

"اول ہوں"

"تو پھر یہ خاموشی کیوں؟"

"ایسے ہی"

"ایسے ہی؟ ارے بھئی ایسے کیوں آخر کس لئے؟ لوگ دیکھیں گے تو کیا سمجھیں گے۔"

"کیا سمجھیں گے؟"

"کہ دونوں میں تناہتی ہے۔"

"پڑے سمجھیں"

"اچھا جی! تو گویہ کچھ بات ہی نہیں۔ میں نے کہا میری جان آخر ماجرا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں بابا، مجھے سونے دو۔"

"پھر وہی بابا! دیکھواتنے دنوں سے ہمارا نکاح ٹوٹ رہا ہے اور تم کچھ دھیان ہی نہیں دیتی ہو۔"

وہ ہنسنے لگی تو اس نے قمر کی پسلیوں میں انگلیاں دے دے کر اسے اور ہنسانا شروع کر دیا۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو قمر پھر رو نکھی ہو بیٹھی۔ "اچھا ہے اگر خدا ہماری پسلی میں بھی درد پیدا کر دے۔"

"کیوں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس یونہی دل چاہتا ہے انجمن کی طرح"

"خدا سے ڈرو!"

"خدا سے ڈرو!"

"ڈر کر ہی تو یہ کہہ رہی ہوں۔ سارا دن پڑی مزے کرتی ہے اور میرے سعید بھیا جیسا بال باندھا غلام ملا ہے سونے پر سہاگہ۔ کیا مجال جو بنو سے ایک کام بھی کروائیں، مجھی کو ہر جگہ جھونکتے ہیں۔ دن میں دس دوست لے آئیں بیس لے آئیں، ان کو بلا سے۔ قمر سلامت رہے۔ پس موئی پکا موئی، آئے لوٹھے کھا گئے۔ اور انجمن کے بھی ٹیس اسی وقت اٹھتی ہے جب سعید بھائی صحن میں گنگنا رہے ہوں۔"

"تو کیا انجمن واقعی بیمار نہیں؟" وحید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں"

"جھوٹ! وہ تو ہر دم درد سے کراہا کرتی ہے اور تم..... نہیں بھئی۔ یہ نہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔"

"جھوٹ! ہاں جی میری باتیں تو جھوٹ ہی ہوتی ہیں۔ واہ کیسا منہ پھاڑ کے کہہ دیا جھوٹ۔ میں کہتی ہوں اگر جھوٹ نکلے تو تھو متے تیروں سے اڑا دینا۔"

"نہیں بھئی، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں جی ہو سکتا ہے بھلا۔ شرط بدلتے ہیں؟ لائیے بارہ گنا لکھتی ہوں۔"

"مگر۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ بھئی یہ تمہاری باتیں تم ہی جانو۔"

دوسری صبح جب وحید سو کر اٹھا تو اسے سعید بھیا زہر لگتے تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان کی ریا کاری کا پول کھول دے اور ان کے دل میں دبی ہوئی خواہشات کا مرقع چورا ہے میں ٹانگ دے۔ ان کے انجمن کو لکھے ہوئے خطوط گھر کی ساری دیواروں پر چسپاں کر دے، مگر وہ ایسا کرنے سکا۔ اسے سعید بھائی پر رحم آ گیا۔ وہ ان سے ڈر گیا۔

غسل خانے میں پھسلن تھی۔ انجمن کا پاؤں جو رپٹا تو پانی سے بھری ہوئی نافذ پر گر پڑی۔ کنارہ تیز تھا، کان کے نیچے جڑا چر گیا۔ تسلی کا پانی عنابی ہو گیا۔ کون تھا کہ برساتی نالے کی طرح اٹھا آتا تھا۔ قمر نے دیکھا تو بھاگ کر اسے اٹھایا، پھر سہارا دے کر دالان میں لے آئی۔ خالہ نے سر پیٹ لیا۔ کریم کو پتہ چلا تو وہ باورچی خانہ سے صدقے واری کرتی دوڑی۔ کلمے سے خون بہتا دیکھ کر بولی "کیا ہو گیا میری بنو؟ ہے ہے چاند سے چہرے پر داغ پڑ گیا۔" اور قمر جو دوسرے کمرے میں پٹی پھاڑنے لگی تھی، کپڑا پرے پھینک کر بڑبڑاتی باہر نکل گئی۔ "ہوں داغ پڑ گیا چاند پر جیسے چاند ہی تو تھی۔ شکل تو دیکھو، پتہ نہیں دنیا کو کیا ہوا ہے۔ پھر وہ باورچی خانہ میں جا کر کام کرنے لگی۔ اور

جب کریمین واپس آئی تو اس پر برس پڑی۔ "آج پھر ہنڈیا میں نمک زیادہ ڈال دیا۔ دیکھتی نہیں ہو برتن کس طرح بکھرے پڑے ہیں۔ کچھ تو خیال چاہیے، آخر دام لگے ہیں ان پر۔ یہ مصالحہ دانی کم بخت تو کبھی ڈھک ہی نہ سکی۔ اسی خانے میں لونگ تو اسی خانے میں چوہوں کی مینکنیں۔ آخر تمہیں ہوا کیا ہے۔" منہ بسور کر بولی "سارا الزام مجھی ٹھڈاٹوٹی کو دو بیٹھ بی، غلام حسین بھی تو ہے۔ اس دیدوں پھوٹے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ صبح کی کہو تو شام کی خبر لاتا ہے۔ اب بھی دیکھ لو پتہ نہیں کہاں مرا ہوا ہے۔ میں اللہ ماری اتنے جوگی کہاں کہ ہنڈیا چڑھا کر ادھر ادھر کے کام بھی کرتی پھروں۔" پھر وہ میلے دوپٹے سے جھوٹ موٹ اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔ جتنے عرصہ میں انجمن کے زخم کے کنائے ملتے گئے، دونوں بھائی دور ہوتے گئے اور وحید نے تو والدہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ ادھر انجمن بھی یہی کوشش کرتی رہی کہ سعید بھی یہی بات کہہ دے مگر وہ ابھی کتر اتار ہا تھا۔

پھر وہ دن آیا جس کی بڑی دیر سے آرزو تھی۔ انجمن کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نہایت خوبصورت، چینی کا بابا۔ اس کی ناک اونچی تھی اور آنکھیں بڑی بڑی۔ وہ اپنے باپ کی طرح صحت مند اور سرخ و سپید تھا۔ قمر ننھے بھانجے کی آمد پر بہت خوش ہوئی۔ اسے اٹھا کر چومتی رہی۔ اس کی بھچنی ہوئی مٹھیاں کھولتے وقت اس سے تلا تلا کر باتیں کرتی رہی۔ بچے اسے شروع ہی سے پسند تھے اور پھر یہ تو انجمن کا بچہ تھا..... اس کی اپنی بہن کا بیٹا، یہ کیوں نہ اچھا لگتا!

سردیوں کی طویل راتوں میں ڈھولک ڈھمکتی رہتی اور ایک ہی چار پائی پڑیٹھی ہوئی چھ عورتیں پان کھاتی رہیں اور "چچا گیریاں" گاتی رہیں۔ قمر انجمن کی چار پائی کے ساتھ لیٹی تھی اور بچہ اسی کے ساتھ سو رہا تھا۔ جب عورتیں ایک لمبی سر لگاتیں۔

میرے بابل کو لکھنؤ سندیس جنڈولا آج ہوا

تو قمر کا کلیجہ منہ کو آجاتا۔ اس کا بابل پردیس میں تھا اور اس کی انجمن کے گھر لڑکا پیدا ہوا تھا۔ اور جب وہ گا کر یہ کہتیں

بابل ہمارے راجہ کے چاکر برن بالے بھیس

جنڈولا آج ہوا

تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ گیت انہی کے لئے لکھا گیا ہو۔ واقعی ان کا باپ سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ پری گیت انہیں کیوں سنایا جا رہا تھا؟ کس لئے؟ قمر رجائی میں منہ چھپا کر رونے لگی اور اسے وہ رات یاد آگئی جب اس کے ابا اس کے لباس کے کئے چاندی کے جھممر جھممر کرتے آویزے لائے تھے تاکہ صبح اٹھ کر وہ سب سے بڑھ چڑھ کر عید منا سکے۔ اور وہ صرف اس وجہ سے بستر میں دب کر رونے لگی تھی کہ رات ختم ہونے میں نہ آتی تھی اور صبح عید کا کوئی نشان نہ تھا۔ اس رونے اور اس رونے میں کتنا فرق ہے، اس نے اندازہ لگایا اور کروٹ بدل لی۔ عورتیں اب بھی چچا گیریاں گا رہی تھیں۔ اتنے سارے آنسو بہا لینے کے بعد اب اسے سسکیاں آنے لگی تھیں اور ان سسکیوں میں اسے ننھے بچے کے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ان گنا مہینہ تھا۔ اس نے اپنے پہلو پر ہاتھ پھیرا اور ہنستا ہوا گول مٹول لڑکاریں ریں کرتی ضدی لڑکی میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور رضائی اور اوپر کھینچ لی۔ ایک سال میں ایک ہی گھر دوڑ کے کہاں پیدا ہو سکتے ہیں! اس نے اندازہ لگایا اور پھر خود ہی اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دینے لگی کہ اگلے سال میرے ضرور لڑکا پیدا ہوگا۔ اب انجمن کے

ساتھ کوئی پر خاش نہ تھی۔ قدرت نے جو اسے اس نعمت سے نوازا تھا، وہ کون ہوتی ہے مین میخ نکالنے والی۔ پھر اس کا انجمن سے خار کھانا سب کو کھلنے لگتا۔ وہ لڑکے کی ماں بنی تھی۔ سب قدر کرتے تھے، اور واقعی سب کو کرنی چاہئے تھی۔ قدرت نے اہمیت کے میدان میں انجمن کا ساتھ دیا۔ وہ جیت گئی۔ اب قمر اس کی فتح پر نالاں نہیں تھی۔ اتنی بڑی مدد سے بھی نہ جیتی!

بیس دن بعد ہی انجمن پلنگ کولات مار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس دوران قمر اس کے گن گانے والوں میں سے ایک تھی۔ اس کے پاس سوتی۔ دب بھر پلنگ کے گرد چکر لگاتی رہتی۔ انجم، بنو، نجی۔۔۔۔۔ اس کے سوا قمر اسے کسی اور نام سے پکار ہی نہ سکی۔ انجمن بھی اپنی برتری کو خوب محسوس کر رہی تھی اور اس سے ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھا چکی تھی۔ اس دن دوپہر کو قمر انجمن کے سر میں تیل لگا رہی تھی اور وہ اپنے بچے کو گود میں لٹائے مغیلہ شاہزادی کی طرح سراونچا اٹھائے ماش کروا رہی تھی۔ قمر اب پورے دنوں سے تھی۔ گھبراہٹ کے آثار ہر وقت اس کے چہرے پر ڈوبتے ابھرتے رہتے۔ ماش چھوڑ کر اس نے انجمن سے پوچھا "کتنی تکلیف ہوتی ہے انجمن؟" اس کے لہجہ میں گھبراہٹ تھی۔

"کس میں باجی؟" انجمن نے دھوپ کی تمازت سے ایک آنکھ بند کر کے پوچھا۔

"یہی۔۔۔۔۔ یہی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ بچہ"

"اوہ بچہ پیدا ہونے میں اب کچھ نہیں باجی۔۔۔۔۔ ذرا بھی تو نہیں۔ خواہ مخواہ کا خوف ہے۔"

"مگر....."

"مگر کیا؟ یونہی باتیں ہیں مردوں پر رعب ڈالنے کے لئے۔ وہ بے چارے تو قیامت تک اس سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔"

"ہاں! ہاں شاید..... شاید" وہ ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔

"باجی تمہارے بھی لڑکا ہوگا" انجمن نے نہایت محبت سے دل میں یہ کہتے ہوئے کہ خدا کرے ہرگز نہ ہو، قمر کو تسلی دی۔

"نہیں! نہیں!!" قمر نے سر سیمہ ہو کر جواب دیا۔

"کیوں؟"

"مجھے پتہ ہے"

"کیسے؟"

"بس! مجھے پتہ ہے۔"

پھر وہ اٹھی کر اندر چلی گئی اور انجمن کو یہ سوچنے کے لئے چھوڑ گئی کہ اگر کہیں باجی کے بھی لڑکا پیدا ہو گیا تو؟

پھر ایک دن ننھی سی چیخ دالان سے بلند ہوئی اور انجمن اندر روڑی گئی۔ خالہ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ ان کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا

۔ "مبارک ہوا انجمن، خدا نے تمہیں بھانجا دیا۔" اور انجمن کی گود سے اس کا بچہ پھسل چلا۔ تھوڑے عرصہ بعد محلہ بھر کی عورتیں ادھر آنی شروع

ہو گئیں۔ کوئی انجمن کے پاس ٹھہری بھی نہ، نہ کسی نے اس کے بچے کو چکارا نہ بلایا۔ وہ کھڑی خود ہی اس کا دودھ پلانے والا شیشہ صاف کرتی

رہی۔ "ایسی ہے ہوتی ہیں یہ اجڑ عورتیں" اس نے سوچا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ اور جب شام کو وہ کسی کام سے اندر گئی تو ابھی تک دس بارہ عورتیں وہاں بیٹھی تھیں۔ ایک نے نیا بچہ اپنی گود میں ڈال رکھا تھا اور اس سے تلاشتلا کر باتیں کر رہی تھی۔ انجمن دوسرے کمرے میں جانے لگی تو قمر نے آواز دی "ٹھہرو تو بیٹو، کہاں جا رہی ہو۔ کسی کے مرے جینے کی خبر بھی ہے یا اپنے ہی چونچلوں میں دن ختم کرتی ہو!" پھر اپنی کمر کے نیچے سے گرم پانی کی بوتل کھینچ کر بولی "لو اسے پھر سے بھراؤ، پانی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ احتیاط سے بھر کر لانا۔ زیادہ گرم بھی نہ ہو۔ سن لیا؟" اور جب وہ گرم پانی ربڑ کی بوتل میں بند کر چکی تو جھلکتا ہوا پانی یوں ہلا جیسے کہہ رہا ہو سن لیا! سن لیا!! اور پھر یہ سن لیا..... دیکھ لیا! دیکھ لیا!! میں تبدیل ہو گیا۔ اندر عورتیں اونچے اونچے ہنس رہی تھیں اور باہر پنگوڑے میں انجمن کا لڑکا زور زور سے چلائے جا رہا تھا۔



Virtual Home
for Real People

مسرور مرثیہ

www.HallaGulla.com

بادشاہ اور وزیر، دونوں ایک ساتھ، جان کے خوف کے مارے، سرکنڈے کی بیڑ میں چھپے بیٹھے تھے اور باغی انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ جب باغیوں کے ڈنڈیں ڈنڈیں کرتے نیزے ان کے ارد گرد آ کر گرتے تو دونوں سہم کر ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ جاتے۔ تلاش کرتے باغیوں کے کتے، لکڑیگر، لومڑ اور پالتو بھوتخت چھوڑ کر بھاگ جانے والے بادشاہ کی کھوج میں اپنے مالکوں کا ساتھ دے رہے تھے، لیکن دونوں ہی ان کا کام تھے..... باغی بھی اور ان کے پالتو جانور بھی۔ سرکنڈے کے جنگل میں ہر طرف تیز دھارا سترے اگے ہوئے تھے اور ان کے اندر داخل ہونا موت کو دعوت دینا تھا۔

لیکن زندگی بھی ایسی پیاری چیز ہے جسے بچانے کے لیے انسان موت کی بازی لگا کر بھی بچا لیتا ہے اور اپنے پیچھے عجیب عجیب داستانیں چھوڑ جاتا ہے۔ بادشاہ اور وزیر دونوں ہی استروں کے منڈپ میں چھپے اپنی زخم خوردہ زندگی کو بچانے کی کوشش کرتے تھے اور ان کے بدنوں پر جگہ جگہ چیلوں سے خون رس رہا تھا، پاؤں کے چھالے پھٹنے سے تلووں پر دلدل کی ہلکی سی تہہ چڑھ آئی تھی اور مسلسل بھوکے رہنے کی وجہ سے ان میں زندہ رہنے کی شکتی پیدا ہو گئی تھی، گو وہ اندر سے کبھی کے مر چکے تھے۔

جب بادشاہوں اور وزیروں پر افتاد پڑتی ہے تو اسی طرح سے ہوتا ہے اور جب حکومتیں تبدیل ہوتی ہیں تو سرخ آندھیاں ضرور چلتی ہیں۔ باہر چلیں یا بھیتر، بستیوں میں چلیں یا سنیکیوں کے اندر چلیں، خون خرابہ ضرور ہوتا ہے۔ رت کے اندر کچھ ایسا رساؤں ہے کہ اس کے جوش مارنے سے رت جگا ضرور ہوتا ہے انقلاب ہو چاہے شب عروسی، لوگوں کو جاگنا ضرور پڑتا ہے۔ بادشاہ اور وزیر بھی کئی راتوں کے جگے ہوئے تھے اور موت کی لمبی نیند سونے پر دونوں ہی تیار تھے، لیکن اپنی جبلت کی آمریت کے سامنے بے دست و پا اپنے آپ کو بچائے بچائے پھرتے تھے حالانکہ ان میں قدر و قیمت والی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اگر وہ اپنے رستے ہوئے زخموں کے ساتھ نفاہت کے مارے سرکنڈوں کے جھنڈ میں بیٹھے بیٹھے فوت ہو جاتے تو ان کو خوشی ہوتی اور وہ خوشی کے ان لمحات کو زندگی بھر نہ بھلا سکتے۔

بادشاہ کا نام راڑا تھا اور اس کے وزیر کا نام دڑو تھا۔ دونوں الگ الگ علاقوں میں پیدا ہوئے، الگ الگ بڑھے پھولے اور دونوں نے الگ الگ ہی اپنی زندگیوں کا آغاز بے کاری اور بے روزگاری سے کیا۔ دونوں ہی اچھے دنوں کی تلاش میں ایک ایسے مقام پر آ کر ملے جو ابھی دوسرے ترقی یافتہ دیسوں کے مقابلے میں پس ماندہ، گنوار، بے عقل اور مورکھ تھا۔ یہاں کے بہت سے لوگ ابھی تک جانوروں کی

سی زندگی بسر کر رہے تھے اور جو جانوروں کی سطح سے ذرا اوپر اٹھ آئے تھے، وہ بھی بے يقسنے سے تھے بڑے بزرگ، مرد عورتیں، سارے کے سارے زمین پر ہتھیلیاں ٹیک کر چوپایاں کی طرح چلتے تھے اور جو نو جوان لڑکے لڑکیاں دونوں پاؤں پر کھڑے ہو کر چلنے لگے تھے، وہ بھی ابھی کے کے سے چلتے تھے اور درختوں کے تنوں کو تھام تھام کر آگے بڑھتے تھے۔ بڑے بزرگ نو جوانوں کو گھور گھور کر دیکھتے اور چلا چلا کر کہتے "ناں الفت پنے کرو۔ ناناں اسمان میں ٹاکیاں لگاؤ۔ سیدھی طرح اپنے باپ دادا کی ریت پر چلو۔ بے اصولے چلنے سے منہ کے بل کرو گے اور ہڈی پیلی تڑوا لو گے۔" لیکن ہر بستی کے نو جوان چونکہ بے وقوف ہوتے ہیں، اس لیے وہ اپنے بزرگوں کی بات مانے بغیر دو پاؤں پر ہی چلتے رہے اور ڈگماتے رہے۔

راڑا سواں ندی کا باشندہ تھا اور اس کے علاقے کی بستیوں کے لوگ بڑی دیر سے دو پاؤں پر چل رہے تھے۔ ان بستیوں کے بڑے بادشاہ بھاماں کی دور دور تک کلاجگی ہوئی تھی کیونکہ وہ ندی کنارے اگی ہوئی گھاس سے نرم ہار نکال کر ایسے دستر بنادیتا تھا جن کو پہن کر نہ سردی لگتی تھی نہ گرمی۔ وہ سارا دن سواں ندی کے کنارے بیٹھا نرم نرم ہار نکال کر ان کے گھٹے بنا تا رہتا اور شام کو ان میں جوڑ ڈال کر گھٹ بھر چوڑی اور لال سانپ سے دو ہاتھ لمبی پٹی تیار کر لیتا۔ یہ پٹی جنے جنانی کے سینے اور پیٹ پر لپٹنے کے بعد بھی تھوڑی سی بچ رہتی جو چھوٹے بچے کے کندھے اور چھاتی کے ڈھانچے کے کام آ جاتی۔

بھاماں کا وزیر سہنگی تھا۔ سہنگی کو پہاڑوں کے اوپر کالے رنگ کے پتھر سے شیشے کا ایک ایسا تیز دھار ٹکڑا مل گیا تھا جس نے کٹاس کی ایک ڈلی پر صدیوں کی دھوپ پڑنے سے یہ صورت اختیار کی تھی۔ جن لوگوں کے بال چمک جاتے یا بدن کے کسی حصے سے چپٹ جاتے یا آنکھوں اور منہ کے سامنے جھالروں کی طرح یوں اٹک جاتے کہ بندہ نہ دیکھ سکتا نہ کچھ کھا سکتا، وہ سہنگی کے پاس آ کر شیشے سے بال کٹوا کر اپنا پنڈ چھڑوا کے لے جاتے۔ اس کے اس کمال کی وجہ سے بھاماں بادشاہ نے اسے اپنا وزیر بنالیا تھا۔

اصل میں اس زمانے کا یہی دستور تھا کہ انسانوں کے گروہ کو جس چیز کی اشد ضرورت ہوتی اور جس کے بغیر ان کی زندگی کے لالے پڑے ہوتے، اگر وہ چیز کوئی شخص بنا کر یا دریافت کر کے یا اختراع کر کے ان کو فراہم کر دیتا تو وہ اس کو اپنا پیشوا مان کر اسے اپنا بادشاہ بنا لیتے تھے اور زندگی بھر اس کی اطاعت سے سر نہ پھیرتے تھے۔

اکثر آبادیوں کے بادشاہ جولاہے تھے۔ بہت سے گروہوں پر پتھر جوڑ کر گھر بنانے والوں کی حکمرانی تھی۔ کچھ لوگ جنہوں نے کھودا کھودی کے پترے اور سونے بنا کر دکھا دیے تھے، ان کو سب نے کوش ہو کر اپنا بادشاہ مان لیا تھا۔ کئی علاقوں میں بال کاٹنے اور ناخن تراشنے والے بادشاہ تھے اور ان کی دور دور تک مانگ تھی۔ سوسو، دودو سو کے گروہ ان کے آگے ناپتے گاتے، انہیں اپنی اپنی بستیوں میں لے جاتے تھے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ سب سے بڑے نامی گرامی، طاقت ور اور مشہور زمانہ وہ بادشاہ تھے جنوں نے خود روپودوں سے ان کے بیچ تلاش کر کے انہیں مٹی میں دبائے کافن نکالا تھا۔ وہ اپنی بستیوں کے اندر کو روپودے اپنی مرضی سے اگالیتے تھے اور انہیں خوراک کی تلاش میں دور نہیں جانا پڑتا تھا۔ بیچ نکالنے اور دبائے کافن ان بادشاہوں نے اپنی مملکتوں کے علاوہ دوسرے سلطنتوں کے لوگوں کو بھی سکھادیا تھا، اس لیے یہ لوگ بادشاہوں کے مقابلے میں شہنشاہ کہلانے لگے اور غاروں اور درختوں کی کھوہوں میں ان کی پوجا عام ہونے لگی

تھی۔

اس زمانے میں چونکہ لوگوں کو صرف ہاتھ کا کام ہی آتا تھا اس لیے اعلیٰ درجے کا کام کرنے والے اور دوسروں کو ہاتھ کا کام سکھانے والے ہی راجے، مہاراجے اور راج ادھیراج تھے۔ اس وقت کرۂ ارض پر جولاں ہوں، ترکھانوں، لوہاروں، موچیوں، مستریوں اور دستکاروں کی حکومت تھی اور ان ہی کے پیشوں سے ملکتیں، سلطنتیں اور راجدھنیاں پہچانی جاتی تھیں۔

اپنے ہڑپہ سے کوئی بارہ کوس آگے چچا وطنی کی طرف ایک بہت بڑی آبادی صبہ کی تھی، لیکن یہ ہڑپہ کے وجود میں آنے سے کئی ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ صبہ کے لوگوں نے دونوں پاؤں پر چلنا شروع تو کر دیا تھا، لیکن اب ان کی زندگی ایک دردناک عذاب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ پہلے جوراہیں اور پگڈنڈیاں ان کی نگاہوں سے بانہ بھر دور ہوتی تھیں اب چھ سات فٹ نیچے اتر گئی تھیں۔ اونچے نیچے راستے، قدم قدم پر نوکیلے پتھر، سولوں کانٹوں سے بھری واٹیں..... پانچ دس قدم کے بعد پاؤں لہولہان ہو جاتے اور لوگ بیٹھ بیٹھ کر اور رک رک کر اپنے غاروں اور کھوہوں میں واپس پہنچتے۔ عورتوں اور چھوٹے پھونک کر قدم دھرتے تھے اور جوانوں سے پہلے اپنی منزل پر پہنچ جاتے تھے۔

راڑا سواں ندی کا باشندہ تھا۔ رمتا جوگی تھا۔ کام کاج سے اس کو دلچسپی نہ تھی۔ سیر و سیاحت کا دیوانہ تھا۔ ایک اچھے گھوڑے جتنی مسافت دن بھر میں طے کر کے کسی درخت کے نیچے یا درخت کے اوپر رات گزار کر اگلے دن اپنا سفر پھر شروع کر دیتا۔ اس کے پاؤں لمبے سفر کی صعوبتیں سہ سہ کر گھوڑے کے سموں کی طرح سخت ہو گئے تھے اور جب وہ چلتا تھا تو جنگلی گھوڑیاں دریا کنارے چرتی چگتی سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھنے لگ جاتیں کہ باقی دو سموں کی ٹاپ کیوں نہیں آرہی!

راڑا جب صبہ پہنچا اور اس نے ہتھیلی جیسی ہموار سرزمین پر خوب صورت مخلوق کو ایک دردناک عذاب میں مبتلا پایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بستی کی گاہن اور شیردار عورتیں اس کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئیں اور باری باری اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے اپنے گال اور گردنیں سہلانے لگیں۔ راڑا نے جب ان کے سوجھے ہوئے، لہولہان، زخمی اور کٹے پھٹے پاؤں دیکھے تو وہ کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ چپ تو وہ پہلے ہی تھا کہ ان کی بولی اس کی سمجھ سے باہر تھی، لیکن اب ساکت اس لیے ہو گیا تھا کہ سواں ندی کی عورتوں کا مساس صبہ کی عورتوں سے مختلف تھا۔

جب صبہ کے بادشاہ نے، جس نے اپنی رعایا کو گھاس سے رسی بننے کا علم سکھایا تھا، راڑا کے سامنے کچی گندم، جنگلی پونڈا اور کول ڈوڈے کے بیج رکھے تو بادشاہ کے پیپ دار لیس بھرے پاؤں دیکھ کر روڑا کھانا پینا بھول گیا اور اس نے اپنے دل میں مخلوق خدا کی اس مشکل کو آسان کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

راڑا بستی سے باہر نکل گیا اور اس نے باہر درختوں میں اپنا بسیرا کرنا شروع کر دیا۔ زخمی پاؤں والی عورتوں نے اسے بہت یاد کیا، لیکن وہ اتنی دور تک چلنے سے لاچار اور راڑا تک پہنچنے سے معذور تھیں۔ صبہ کے بادشاہ نے پردیسی مہمان کو کھانا بھجوانے کی کوشش کی، لیکن اس کے خدمت گار زیادہ فاصلہ طے نہ کر سکے۔ بستی کے لوگ بہت روئے اور ان سے الگ ہو کر راڑا بھی بہت رویا۔

روڑا نے اپنے پاؤں کے ساتھ پتے باندھ کر چلنے کی کوشش کی، لیکن پتے پہلے ہی قدم پر پھٹ گئے۔ اس نے درختوں کی چھال کے

ساکھے ٹوٹے ایٹی سے پنچ تک باندھ کر چلنا شروع کیا تو دس بارہ قدم کا پینڈا صاف طے کر گیا، لیکن پھر اس کے سموں کے نیچے چھال کے ٹوٹے کرچی کرچی ہو گئے۔ اس نے گھاس کی رسیاں بٹ کر پاؤں کے گرد لپٹیں اور بڑی دور تک آگے نکل گیا، لیکن جب وہ مڑنے لگا تو رسیاں ٹوٹ کر ریشہ ریشہ ہو گئیں اور اس کی انگلیوں میں سبز گھاس کے تینکے رہ گئے۔

اس کو بستی سے باہر زندگی گزارتے کئی مہینے ہو گئے لیکن اس کا نخل تنہا ہر نہ ہو سکا۔ اس عرصے میں وہ دو تین مرتبہ بستی کے اندر آیا بھی اور اعتراف شکست اور ناکامی کی خفت کا اظہار کر کے واپس چلا گیا۔ اس نے روتی ہوئی عورتوں کو بھی مڑ کر نہ دیکھا جو اپنے پاؤں کے زخموں سے بے نیاز اس کی جدائی کے بوجھ تلے رو رہی تھیں اور درختوں کے نیچے ان ہر نیوں کی طرح کھڑی تھیں جن کے کالے مرگ کو شکاری بانس سے لٹکا کر کندھوں پر دھرے لیے جا رہے ہوں۔

جس روز سردیوں کی دھوپ میں زمین پر پالتی مارے مارے راڑا اپنی چکر بھری انگلیوں سے چپیاں پھاڑ پھاڑ کر گول ڈوڈے کے بیچ کھا رہا تھا، اس وقت دڑو عین اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ راڑا نے جب اپنے ہاتھوں اور چھاتی پر اچانک اندھیرا سا ڈھا تو اس نے نظریں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے دڑو کھڑا تھا اور اس کے منہ جنگلی پونڈے کے ٹوری تھی۔ دونوں نے ہاتھ کے اشارے سے ایک دوسرے کی خبر پوچھی، لیکن دونوں ہی ان اشاروں کا ٹھیک ٹھیک مطلب نہ سمجھ سکے۔ اصل میں ان کے اشاروں میں گرامر کی گئی غلطیاں تھیں اور ابلاغ کے علم میں علم بالکل کورے تھے۔ دڑو بڑے اطمینان سے راڑا کے سامنے بیٹھ گیا اور غور سے اس کے پاؤں دیکھنے لگا۔

دڑو سمندر کے پاس دلدلی علاقوں کا باشندہ تھا اور اس کے پاؤں پیدائشی طور پر بڑے نرم و نازک تھے۔ وہ بھی راڑا کی طرح کا سیلابی جھونکا تھا جو رکتا، چلتا، دبکتا، گھومتا سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے صبح آ پہنچا تھا۔ اگر یہاں دھوپ میں راڑا نہ بیٹھا ہوتا تو وہ اس سے بھی آگے نکل کر پتا نہیں کہاں پہنچ جاتا، لیکن وہ رک گیا۔

چند دنوں کے اندر اندر ان دونوں کے درمیان ایسی شدید رغبت پیدا ہوئی کہ وہ راڑا کے جٹا دھاری بوڑھ کی کھوہ میں کھنڈلی مار کر ایک ساتھ سونے لگے۔ پتا نہیں یہ رغبت انسانی تھی، جسمانی تھی یا روحانی لیکن تھی بڑی سحر انگیز۔ چند دنوں کے اندر وہ ایک دوسرے کی بولی بھی سمجھنے لگے اور ایک دوسرے کے دلوں کا بھید بھی جاننے لگے۔ دڑو کبھی آنکھ کے ساتھ آنے والے ایک سال کی پوری تصویر دیکھ لیتا تھا، لیکن اس کو چولستان سے نکلی ہوئی ہرنوں کی اس ڈار کا پتا نہیں چلتا تھا جو اپنے بڑے غول سے بھٹک کر صبح سے ساتھ آٹھ کوس کی دوری پر گزر رہی تھی۔ راڑا اپنی آنکھیں چندھی کر کے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں گھنگی جتنا فرق رکھ کے آنے والی کئی صدیوں کو اچھی طرح دیکھ لیتا تھا۔ ان صدیوں کی چلتی پھرتی تصویروں میں اسے صرف ایک دو باتیں ہی تھیں، سمجھ میں آتی تھیں، باقی اس کے سر پر سے گزر جاتی تھیں۔ پرندے، ندیاں، آسمان، چوپائے اور درخت تو اس کو کچھ مطلب فراہم کرتے تھے لیکن باقی کی ساری چیزیں انسان سمیت اس کی گرفت میں نہیں آتی تھیں۔ اس کو نظر تو سب کچھ آتا، لیکن سمجھ نہ آتا۔ سمجھ نہ آتا تو بیان نہ کر سکتا۔ بیان نہ کر سکتا تو اس کی خاموشی کے پھیلاؤ اور بھی اضافہ ہو جاتا اور جب خاموشی میں اضافہ ہوتا تو دڑو اس سے خوف زدہ ہو کر دور نکل جاتا۔ دور نکل جاتا تو کئی دن تک واپس نہ آتا۔ کئی کئی دن تک واپس نہ آتا تو رغبت کا مارا راڑا اس کو تلاش کر کے واپس لے آتا۔ پتا نہیں یہ رغبت انسانی تھی، جسمانی تھی یا روحانی لیکن تھی

بڑی طاقت ور اور سحر انگیز!

سو جے سو جے، لہو لہان اور زخمی پاؤں کو پہنا دے عطا کرنے کے لیے دڑو بھی راڑا کی مہم میں برابر کا شریک تھا بلکہ ان دونوں کے درمیان باہمی رغبت کی ایک بڑی وجہ یہ تلاش ہی تھی جو انہیں صبح سے شام تک دیوانوں کی طرح ویرانوں میں لیے پھرتی تھی۔ اچانک ایک روز درخت کا ایک بڑا سا ڈالٹو ٹاٹا اور نیچے سوئے ہوئے باگڑ بلے پر گرا۔ یہ سب کچھ اس قدر خاموشی سے ہوا کہ بھورے بلے کو پتا بھی نہ چل سکا کہ وہ مر گیا ہے اور اب اس کا دنیا کے ساتھ کوئی رشتہ بھی باقی نہیں رہا۔ ڈالا بڑا تھا اور پتے زیادہ تھے۔ کئی دنوں تک گدھوں کو باگڑ بلے کی لاش نظر نہ آ سکی۔ پتا اس روز چلا جب باگڑ بلے کی سڑتی لاش کی بدبودور دور تک پھیل گئی۔

راڑا نے سانس روک کر باگڑ بلے کو تنسیو سے نکالا اور اپنے گھر کی کھوہ سے بہت دور لے جا کر کھلے میدان میں ڈال دیا۔ تین گدھ کنی مانگتی تلوں کی طرح فضا میں تیز سے اترے اور دیکھتے دیکھتے بھورے رنگ کے باگڑ بلے کی بھوری کھال ٹیالی ہو کر زمین کے ساتھ چمٹ گئی۔

صبح کی ایک نو خیز، چھریرے بدن اور سانولے رنگ کی گاہن لڑکی سب کی آنکھ کا تارہ تھی۔ یہ لڑکی نرم دھول کے راستوں پر چلتی اور نرم زمین کی کھوج میں کوئی میل بھر کا چکر کاٹ کر ہر دوسرے تیسرے راڑا کو دیکھنے ضرور آتی۔ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر وہ راڑا کو تکتے جاتی اور اپنی زبان میں کچھ ایسے بول بولتی جاتی جو اس وقت تو راڑا کو سمجھ میں نہیں آتے تھے، لیکن بعد ازاں کئی لاکھ برس گزرنے کے بعد جب وہی بول "ماہیا" کے روپ میں زبان زد عام ہوئے تو راڑا اس جہان سے کوچ کر چکا تھا۔ اپنے گربھ کی وجہ سے وہ لڑکی بیٹھی ہوئی یوں لگتی جیسے ابھی اٹھنے والی ہے اور جب بھرپور کھڑی ہوتی تو نظر آتا جیسے ابھی بیٹھنے والی ہے۔ اس کے بعدن میں اتنی گولائیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ سکون میں بھی اس کا انگ انگ متحرک رہتا تھا۔ اس کے فاختاؤں جیسے پیر زخمی بھی تھے اور سو جے ہوئے بھی۔ راڑا اس کے چہرے اور بدن سے لطف اٹھانے کے بجائے ہر وقت اس کے پیروں ہی کو دیکھا کرتا اور پیروں ہی میں گھرا رہتا۔

جب اس کرۂ ارض پر چڑے کا پہلا جوتا بنا تو وہ اس باگڑ بلے کی کھال کا تھا جس کو گدھوں نے چاٹ چوٹ کر اندر سے بالکل خالی کر دیا تھا اور اس کی کھال کو زمین پر بھیل دیا تھا۔ دنیا کا پہلا موچی راڑا تھا اور دنیا کا سب سے پہلا جوتا اس گربھوتی کے لیے بنا تھا جس کے پاؤں فاختاؤں جیسے تھے۔

صبح کے ڈور بیٹا بادشاہ نے بستی کے لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر پہلے تو راڑا کو سجدہ کیا، پھر اپنی پچیس سالہ پرانی حکمرانی اس کے حوالے کر دی۔ ہاتھ پکڑ کر راڑا کو خود تخت پر بٹھایا۔ اس کی دونوں آنکھوں اور پھر دونوں ہاتھوں کو الگ الگ دوسہ دیا اور بستی کے سارے لوگوں سے اس رسم کی ادائیگی کی درخواست کی۔ دست بوسی کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا اور جو لوگ صبح کے باسی نہیں بھی تھے، وہ بھی ارد گرد کے علاقوں سے آ کر راڑا بادشاہ کے ہاتھ چومتے رہے۔

دڑو جس کو راڑا نے اپنا وزیر بنالیا تھا، ایک خاص بوتے کا چھلکا اتار کر اس سے باریک اور مضبوط رسی بٹنے کا ماہر ہو گیا تھا۔ پھر اس نے چڑے کے اندر باریک سوراخ نکالنے کا راز بھی معلوم کر لیا تھا اور ساتھ ساتھ عورتوں کے دلوں کو چھیدنے کا بھی ماہر ہو گیا تھا۔

راڑا بادشاہ کے اوپن ایئر شاہی محل کے ہر طرف ہر طرح کے پالتو اور جنگلی جانور کٹتے تھے اور ان کی کھالیں ستھرائی اور صفائی کے لیے اور بعد میں چمڑے کی کمائی کے لیے بادشاہ کے پاس پہنچا دی جاتی تھیں۔ بادشاہ سلامت ستر پر ایک لنگوٹ سا لپیٹ کر سارا دن گندے پانی میں اترے بدبودار کھالوں کو دھوتے رہتے اور ان کے قریب وزیر یا تدبیر دژ و چمڑے کے کونوں کو تسوارے اور ڈوریاں بٹوریا لگے رہتے۔ سب سے پہلے صبح بستی کی عورتوں نے جوتے پہنے، ان کے بعد پاؤں چلنے والے لڑکے لڑکیوں نے، پھر جوانوں نے اور سب سے بعد بوڑھوں کے لیے جوتیاں بنانے کا ڈول ڈالا گیا۔

بادشاہ نے ارد گرد کے علاقوں سے لوگ بلوا کر انہیں بھی جوتا بنانے کا فن سکھایا اور وہ بھی چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں کے مالک بن گئے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے بادشاہ، اونچی عزتوں اور لمبی شہرتوں والے حکمران زیادہ تر جولاہے، نئی، پتھر پھوڑ اور کاٹھ پھوڑ مستری، دھات کار اور بیچا گئے تھے۔ اب ان میں خاندان موچیاں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ موچیوں کے کام کی ایسی کلا جگہ کہ بہت سے پرانے دھرانے سیانے بادشاہوں نے اپنے سروں سے راج ادھیراج کا مکٹ خود اتار کر موچیوں کے سروں پر رکھا اور انہیں اپنا بادشاہ بنالیا۔

جب موچی بادشاہ راڑا اور اس کے وزیر دژ و کوہمہ پر حکومت کرتے دس سال پانچ مہینے اور تینیس دن ہو گئے تو آج کے وسط ایشیا کی اور سے ایک پردیسی گھومتا گھماتا، بھوکوں مرتا، دھکے کھاتا ہمہ کی بستی میں آ نکلا۔ اس پردیسی کا رنگ صاف، بال لگے، قد لمبا اور آنکھیں کیری تھیں۔ تیز بولتا اور تیز چلتا اور تیز سوچتا تھا۔ ہمہ کے جنے اور جنیاں بھی اس کے گرد جمع ہو گئے اور بولی نہ جاننے کے باوجود اس کی محبت کے جھومڑ ڈالنے لگے۔ خود بادشاہ راڑا، بادشاہ کا وزیر اور اس کی عورتیں پردیسی سے دل لگا کر اسے نظروں کے سامنے بٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

تیز تیز چلنے اور تیز تیز بولنے والے پردیسی نے بڑی تیز کے ساتھ ہمہ والوں کی بولی سیکھ لی اور ان کے اور قریب ہو گیا۔ بستی کے سارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کھلے میدانوں، بند رستوں اور گہری نیا نیوں میں اس کے ساتھ گھومنے لگے۔ اس لگے کیرے پردیسی کو بات کرنے، بات کو چکانے اور چمکتی ہوئی بات کو گھما کر پھینکنے کا ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ وہ کسی بھی لڑکے کی جانگھوں و کسی بھی لڑکی کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ سکتا تھا اور لیٹتے ساتھ ہی خرمستیاں بھی کر سکتا تھا۔ اس کے بولنے میں بات کی بول بانٹ ایسی خوبصورت ہوتی کہ بڑھت میں چوکور بھی چلتی اور گول گول دائروں میں بھی برابر کی کاٹ کرتی جاتی۔ بڑے بوڑھے اور اپنے سونے پورے کرچکی عورتیں اس کی راہوں کو پلٹ پلٹ کر دیکھا کرتیں حالانکہ وہ ان راہوں سے کبھی کا گزر چکا ہوتا۔

کاکیرا ساری بستی کی آنکھوں کا تارا تھا۔ وہ ایک ٹیلے پر بیٹھ کر رات بھر جگمگاتا اور بستی کے سارے لوگ ساری ساری رات اس کی پوجا میں مگن رہتے۔ اس کا سب سے بڑا بچاری وقت کا بادشاہ راڑا تھا جس نے جوتے بنانے، مساس کروانے اور محبت کرنے کا کام چھوڑ دیا تھا اور اب ایک ہی طرف ٹکٹکی لگا دی تھی۔ لگے کیرے کے پاس آگہی کا خزانہ اور جان کاری کی مونی تھی۔ اس نے کبھی جوتا نہیں بنایا تھا، لیکن وہ جوتا بنانے پر دن بھر بیان دے سکتا تھا۔ وہ بال کاٹنے کے فن سے نا آشنا تھا، لیکن بالوں کے بارے میں کاٹنے کے حوالے سے، کٹنے کے رشتے سے، تیشے کی دھار سے، کانچ کی جھریٹ سے اچھی طرح واقف تھا، اس کو کپڑا بنانا نہیں آتا تھا، پر پٹھے کی قسم پر، ریشے کی شان میں

دھاگے کے بیان میں، ڈور کی لٹکن مین، لچھے کی الجھن میں پوری پوری رات بات کر سکتا تھا۔

اس کے پاس بات تھی اور بڑی ہی لمبی بات تھی۔ بول بچن کے زور پر وہ ہر خالی دل میں گھر کر لیتا تھا اور ہر بھرے ہوئے گھر کو خالی کر دیتا تھا اور خالی وقت کو اپنی باتوں سے بھر کر اس میں چکا چوند کے چھلے، گھنگھر و اور گھونگھے سپیاں ٹانک سکتا تھا۔ کاکیر ایک ایسی آسمانی مخلوق تھا جس کو کچھ بھی کرنا نہیں آتا تھا اور سارے کرنے والوں پر اس کی حکمرانی تھی۔ وہ محنت سے شدید نفرت کرتا تھا اور سارے محنت کرنے والے ایک ایک کر کے اس کی محبت کے تالاب میں ڈوبتے جا رہے تھے۔

ایک رات پورن ماشی کا چاند اس کے ٹیلے کے عین اوپر آ گیا تو لگے کیرے نے اپنے ساتھیوں سے کہا "میں بے کار رہ رہ کر تنگ آ چکا ہوں اور اب اپنی بقیہ زندگی اس بستی کا بادشاہ بن کر سکون و تسکین اور راحت و آرام سے گزارنی چاہتا ہوں۔" اس کے سارے ساتھی یہ بات سن کر سکتے میں آ گئے۔ بڑی دیر تک چاند کی چاندنی میں پتھر کے بت ساکت و صامت بیٹھے رہے..... دیوتا ٹیلے پر اور پجاری نیچے ٹھنڈی ریت پر۔

جب بڑی دیر گزر گئی تو دیوتا نے اپنی بات ایک بار پھر وضاحت کے ساتھ دہرائی اور ہاتھ کے اشارے سے اس چھو کرے کو اپنی طرف متوجہ کیا جس کے کندھے بکائن کی چھتری کی طرح چوڑے اور جس کا بدن کھجور کے پیڑ کی طرح گھنگر یلا تھا۔ اس نے حسرت بھری چیخ مار کر کہا "کاش ہم تیری یہ آرزو پوری کر سکتے اور تجھے اس ٹیلے سے اٹھا کر ابھی اس پتھر پر بٹھا سکتے جو صرف بادشاہوں کے لیے بنا ہے اور نیم کے گھنے اور ٹھنڈے پیڑ کے نیچے اسی مقصد کے لیے رکھا گیا ہے، لیکن یہ بات ناممکن ہے۔"

لگے کیرے کو اس ان گھڑت چھو کرے کی یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے نفرت کی ایک عجیب آواز اپنے حلق سے نکالی اور ٹیلے سے نیچے کی طرف تھوک دیا۔ چھریرے بدن کے ایک خوبصورت سے جوان نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا "باوجود اس کے کہ ہمارا دل تجھی کو بادشاہ بنانے پر رضامند ہے اور ہم اندر سے تجھی کو اپنے ہر دے کا بادشاہ مانتے ہیں لیکن ہمارے دستور کی پہلی شق ہی اس اعلان سے کھلتی ہے کہ جو محنت کش، کارکنندہ کارگریا زحمت کش اپنی کسی ایچ سے یا اپنی کسی ایجاد سے لوگوں کی بنیادی ضرورت کا حل عملی صورت میں پیش کرے گا اور اس پر باقاعدگی سے عمل کرتا رہے گا، صرف اسی کو بادشاہ بننے کا حق حاصل ہوگا اور وہی لوگوں کے درمیان حکم ہوگا۔"

لگے کیرے نے کہا "میں ایسے دستور کو نہیں مانتا..... نہیں مانتا..... نہیں مانتا۔"

اپنے دستور کی پہلی ہی شق کے خلاف تین مرتبہ نفی کا اعلان سن کر سارے جوان اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے بیک زبان کہا "یہ صرف ہمارا ہی دستور نہیں، ساری دنیا کی ہر بستی اور ہر گروہ کا دستور ہے اور اس کے پری ایمبل کا پہلا فقرہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ہم اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں۔"

کاکیر اسفید و دودھیا چاندنی میں دونوں ہاتھ پھیلا کر ٹیلے پر مقدس کمر متے کی طرح کھڑا ہو گیا اور اس نے علم کی برتری اور ہاتھ کی کارکردگی، ہنردستی، کار جسمانی اور ضائع دستی کی بے وقعتی پر بھاشن دینا شروع کر دیا۔ یہ کہہ ارض کی وہ پہلی تقریر تھی جس میں غیر کارکن، بے حرف، بدون عمل اور نام تمام لیکن لسان انسانوں کو بلند و برتر اور رفیع و عالی بتایا گیا جبکہ کارآمد، کارشناس، پیشہ ور اہل حرفہ کو کمی کمین کا نام دیا گیا

جب چاندنی میں کھڑے انسانوں کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ سخن سازی، گل باتے، بیان بازی اور لفظ انڈیلنے دیوتاؤں کی اولاد ہیں اور ہاتھ بدن سے کام کرنے والے ملیچھوں اور راکشوں کے پھوسٹرے ہوتے ہیں تو وہ انقلاب کے نام پر اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سر کنڈوں کی مشعلیں جلا کر اپنے جولا ہے بادشاہ راڑا اور اپنے ڈور بٹیا وزیر دڑو کے خلاف بغاوت کردی۔

بہت سی جذباتی عورتیں اور معصوم بچے پہلے ہی حملے میں مارے گئے اور بہت سے بوڑھے جنہوں نے بلوائیوں سے یہ کہا کہ اس ہری بھری زمین پر فساد نہ پھیلاؤ، اس فقرے کی ادائی پر قتل کر دیے گئے۔ راڑا اور دڑو نیم تلے کا تخت چھوڑ کر بھاگے اور باغیوں کے آگے بھاگتے ہی گئے۔

صبح ہو چکی تھی۔ معزول بادشاہ راڑا اور اس کا وزیر دڑو دونوں ایک ساتھ جان کے خوف کے مارے سر کنڈے کی بیڑ میں چھپے بیٹھے تھے۔ جب باغیوں کے ڈوائیں ڈوائیں کرتے نیزے ان کے ارد گرد آ کر گرتے تو دونوں سہم کر ایک دوسرے سے چٹ جاتے۔ تلاش کرتے باغیوں کے کتے، لکڑ بگڑ اور پالتو بچو تخت چھوڑ کر بھاگنے والے بادشاہ اور وزیر کی کھوج میں اپنے مالکوں کا ساتھ دے رہے تھے، لیکن دونوں ہی ناکام تھے..... سو نگھنے والے پالتو جانور بھی اور ڈھونڈنے والے باغی بھی۔

جب دھوپ تیز ہو گئی اور باغی تھک ہار کر اپنی نئے بادشاہ لگے کیرے کے پاس چلے گئے تو سر کنڈے کے سمندر میں بے نام سی حرکت ہوئی۔ دڑو نے پھوس تلے چھپی ہوئی بیڑ کی طرح سر اٹھایا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے چمرخ ابوالہول راڑا سے پوچھا "ہماری حکومت گئی؟"

راڑا نے آنکھیں اور ہونٹ ہلائے بغیر کہا "گئی!"

تھوڑی دیر دڑو خاموش رہا۔ پھر بولا "کچھ عرصے بعد ہمارا تخت و تاج دوبارہ بھی تول سکتا ہے؟"

راڑا نے نفی میں سر ہلایا تو دڑو تیز پترے سے اس پر حملہ کرنے کو ابھرا۔ راڑا نے اس کی کلائی پکڑ کر مروڑی اور پتر اس کے ہات سے چھوٹ کر سر کنڈوں میں گر گیا۔

دڑو نے روتے ہوئے کہا "چلو اب نہ سہی، پھر کبھی سہی لیکن ہمارے حکومت ہمیں مل تو جائے گی..... واپس!"

راڑا نے پورے شاہی جاہ و جلال سے اسے جھڑک کر کہا "تخت و تاج کو دفع کرو! حق انسان اور اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔ اگر اس وقت یہ جان بھی بچ جائے تو غنیمت ہے۔"

دڑو نے ہاتھ جوڑ کر کہا "مالک! تمہارے پاس تو کشف کا علم ہے اور تم بڑی دور تک دیکھ سکتے ہو۔ اگر صرف یہ بتا دو کہ کتنے نئے چاند بعد ہماری حکومت ہم کو واپس مل جائے گی تو پھر میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گا؟"

راڑا نے زچ ہو کر کہا "میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ اب حکومت کبھی لوٹ کر ہمارے پاس نہیں آئے گی اور ہم وہاں ساری عمر اسی طرح ہی رہیں گے اور ساری جونیں اس طرح بکھرے رہیں گے، پر تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟"

دڑو نے دونوں خون آلود ہاتھ تیز دھار سر کنڈوں پر ڈال کر وہیں اپنا ہاتھ ٹیک دیا اور رو کر بولا "مجھے آخری بار بتا دو مالک! اپنے

کشف کی لوچن سے دیکھ کر بتاؤ، پھر چاہے اپنے ہاتھ سے مار کر آگے نکل جانا۔۔۔۔۔ پر دیکھو اور اسی پتھ کے زور پر جس نے تم کو ہلتر بنائے کارج سکھایا ہے۔"

تھوڑی دیر تو معزول بادشاہ خاموش رہا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں چندھی کر کے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں چنگی جتنا فرق کرھ کر آنے والی صدیوں کے اپنے سامنے لاکھڑا کیا۔ تھوڑا سا وقت اس نے صدیوں کی بھول بھلیاں میں گھوم پھر کر گزارا۔ پھر ہلکی سی جھری لے بولا "ناں بھائی! اپنا راج تو دور دور تک نظر نہیں آتا۔"

"کیوں نہیں آتا؟" درؤ نے خوف زدہ ہو کر کہا "اور پیچھے دیکھو۔ بالکل پیچھے چلے جاؤ۔ اس کے بعد میں بھی ڈھونڈو۔"

"وہاں بھی ان ہی لوگوں کے راج اور ان ہی کی راج دھانیاں ہیں۔" راڑا نے بالکل پیچھے دیکھ کر کہا۔

"اور ہم؟" ڈرو نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہم اسی طرح ہیں۔" راڈانے ذرا اسی آنکھیں اور میچ کر کہا "ہمارے دوسرے، بھیس اور کپڑے بدل گئے ہیں پر ہمارا آسمان وہی ہے

جوراج پاٹھ والوں نے طے کر دیا ہے۔ ہم ہنرمند، محنت کش، کارگر اور زحمت کش ہیں۔"

"ہم کو مار مار کر بھگا رہے ہیں سرکنڈوں کے جنگل میں سے؟" ڈرو نے پوچھا۔

"ناں ناناں "راڑا نے مسکرا کر کہا" مار نہیں رہے، ہم سے کام لے رہے ہیں اور ہم سے بڑے خوش ہیں۔"

"خوش ہیں؟" درؤ نے حیران ہو کر پوچھا "واقعی خوش ہیں؟"

"بہت خوش، بہت نہال، پرسن، دل شاد!"

"دل شاد؟" درؤا اپنی جگہ سے اچھلا۔

"ہم پر نظمیں لکھ رہے ہیں۔" راڈانے کہا، "ہمیں اپنے پیارے محنت کش، محبوب مزدور، دلارے دھاڑی دار، کڑے کسان اور قیمتی

کاشت کار کہہ کہہ کر بلا رہے ہیں اور ہم سے بہت ہی خوش ہیں۔"

"سچ کہہ رہے ہو بادشاہ؟"

"بالکل سچ، بالکل صحیح" راڑا نے کہا "ہمارے گیت بھی گارہے ہیں اور ہماری جے بھی بلارہے ہیں۔ ہمارے حقوق پر پوتھیاں،

پستکیں، کتابیں اور حکم نامے لکھ رہے ہیں۔ ہماری مورتیاں اور تصویریں بنارہے ہیں۔"

"اور ہمارے راج سنگھاسن اور تخت اور تاج؟" ڈرؤ نے پوچھا۔

"وہ ان ہی کے پاس ہیں اور ان ہی کے پاس رہیں گے۔" معزول بادشاہ نے کہا "اب تخت و تاج پر اور گدی سنگھاسن پر ہنر

مندوں، محنت کشوں، کاری گروں کا جلوہ نہ ہوگا۔"

"وہ کیوں؟" دڑو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو راڑا نے بہت دوراڑتے ہوئے غبار کو اپنی طرف آتے دیکھ کر آرام سے کہا "وہ

اسے لیے کے دستور بدل گیا ہے۔ اب حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بول بچن کے بادشاہوں اور اذکار گفتار اور بیان کلیان کے راجوں کے

پاس رہے گی..... ہنرمندوں کا، کاری گروں اور محنت کشوں کے پاس نہیں۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" راڈا نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "راج پاٹھ بول بھاشن والوں کے لیے ہوگا اور گیت سلامیاں راج مستری کے لیے ہوں گی۔ تخت اور تاج علم والوں کے پاس رہے گا جبکہ شاعری شالباشی ہنرمندوں، محنت کشوں کے لیے ہوگی۔ تخت اور تاج علم والوں کے پاس رہے گا جبکہ شاعری شالباشی ہنرمندوں، محنت کشوں کے لیے ہوگی۔ بادشاہی اور حکمرانی بے ہنر، بے محنت، بے تعلق، بے اعتبار گفتگو باز اور پھو کے اپدیشکوں کے پاس رہے گی جبکہ تھاپی تھاپڑا کسان کاشت کار کے لیے ہوگا۔ رائل فیملی ذکر اذکار اور باتیں کرنے والوں کی ہوگی اور پچکاری چکار کی رائلٹی ہنرمندوں کو ملے گی۔"

ابھی دڑو کچھ اور پوچھنے والا تھا کہ اس کے ارد گرد اندھیرا چھا گیا۔ راڈا نے دیکھا کہ سرکنڈے کے ساگر میں باغیوں کے جم غفیر نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور ان کی زندگیوں کا آخری لمحہ آن پہنچا ہے۔

جب فتح مند باغی بادشاہ اور وزیر کی لاشیں سرکنڈوں سے گھسیٹ رہے تھے تو گھسیٹنے والوں میں خوبرونو جوانوں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو بڑی خوش الحانی کے ساتھ طریقہ مرثیہ پڑھ رہا تھا..... اپنی فتح مندی اور گدی نشینی پر مسرور بھی تھا اور دونوں محنت کشوں کی موت پر نوحہ خوانی بھی کر رہا تھا!

Virtual Home
for Real People

شازیہ کی رخصتی

پھیل کے چندر مکھے، سیت کا پر پڑے
 دھن کڑے سلام کر
 بیم جاوی پھیل کر
 دھلیم تاڑے لاگ پھل
 لاگ تار سب سطور
 بڑیا لوگ میری اڑیا، لوگ سمندر کا سکا
 بڑے پھل کے دیا چام
 کرے است نام، اولیس کرے

میں کوئی ہر روز تو اس رقیہ کا اچارن نہیں کرتا۔ البتہ کبھی کبھی جب میری طبیعت پر بوجھ ہو اور میرا دل روز روز کی سیر سے اکتا کر ایک ہی جگہ قیام کرنے پر اصرار کرے تو میں اپنے پچھلے آنگن میں پرانے تخت پوش پر بیٹھ کر اس منت کا جاپ شروع کر دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد میرا اندر گونجنے لگتا ہے اور کوئی آدھ گھنٹے بعد میں سراپا گونج بن جاتا ہوں۔ پھر مجھے کسی چیز کی پرداہ نہیں رہتی اور میرے سامنے کے نظارے ٹھٹھک کر مجھے دیکھنے لگتے ہیں۔

در اصل یہ رقیہ حاکم وقت کو رام کرنے کا ہے اگر اس کی خدمت میں جانے سے پہلے دو مرتبہ بیٹی باندھتے ہوئے اس منتر کا جاپ کر لیا جائے اور ایک مرتبہ اس کے سامنے حاضر ہو کر دل ہی دل میں اسے روانی کے ساتھ پڑھ لیا جائے تو نہ صرف سامنے کا حاکم شیشے میں اتر آتا ہے بلکہ اس کا حاکم جس کے وہ اثر میں ہوتا ہے اور جس کی آشیر واد سے وہ حکمرانی کر رہا ہوتا ہے، وہ بھی مہربان ہو کر نئی پسندی کے باوجود تغیر کن قضا کر دیتا ہے۔ یہ عجیب وارتا ہے اور اس کے الفاظ کی مؤنی اس سے بھی عجیب ہے! اس عہد میں کہ امریکہ اور اس کے پانچ پیاروں نے عراق پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، کوئی بھی حاکم وقت کسی پر بھی ناراض ہو سکتا ہے اور موقع محل دیکھے بغیر، کبھی بھی کسی کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہے۔ یہ عہد بادشاہوں، مملوکوں اور آمروں کا نہیں..... یہ عہد آزادوں، آزاد منشوں اور حریت

پسندوں کا ہے۔ اب زمانہ اکیسویں صدی میں داخل ہو رہا ہے۔ اس لئے لوگ آزادی کی قدر و قیمت جان گئے ہیں اور رجعتوں کی وادیوں میں گھرے ہوئے بند نصیبوں کو آزاد کرانے کے لئے ان پر وقفے وقفے بعد میزائل بھیج رہے ہیں۔ ایسے دور میں ہر شخص کو یہ رقیہ یاد ہونا چاہیے اور حاکمان وقت کو مہربان رکھنے کے لئے اب کا جاپ کرتے رہنا چاہیے۔

چونکہ آپ نے کبھی میرا گھر نہیں دیکھا اس لئے آپ کو معلوم نہیں کہ میں صبح کہاں ہوتا ہوں اور شام کے وقت کہاں بیٹھتا ہوں۔ جن لوگوں کی ہارٹ بیٹ میں ایک دھڑکا لگا ہوتا ہے اور جن کو "بیٹا بلا کر" کی گولی کھا کر اس دھڑکے کے آگے کھٹکا لگا پڑتا ہے، وہ لوگ سردیوں میں بہت سویرے سیر پر نہیں جاتے۔ جب دوسرے لوگ یسر سے واپس آ کر دفتر جانے کی تیاری میں مصروف ہوتے ہیں، اس وقت "بیٹا بلا کر" والے زبان تلے گولی دبا کر سیر پر نکلتے ہیں اور ڈاکٹر کے دیئے ہوئے ٹارگٹ سے آدھا چکر پہلے آ جاتے ہیں۔ لیکن میں اس روز سیر پر گیا ہی نہیں۔ اپنے گھر کے پچھلے صحن میں جہاں کوئی نہیں آتا، وہاں غیر ضروری چیزوں کا ذخیرہ پڑا ہے اور کسی کو ان کی طلب نہیں۔ میں اپنے پرانے تخت پوش پر بیٹھا جاپ کر رہا ہوں۔ جاپ کی گھوم گھیری نے میرے من کے اندر ایسے لپیٹے دیئے شروع کر دیئے جیسے بل دار پر اٹھانے کے لئے پیڑے کو مروڑے دیئے جاتے ہیں۔ میں نے سوچا اب کچھ ہوگا۔ مگر کچھ نہ ہوا اور جب میری لپٹیں کھلنے پر آئیں اور اندر الٹا نکلا چلنے لگا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ اور اسی وقت یہ سب کچھ ہوا۔

ایک خوبصورت، سرو قد، بھری بھری، میدہ اور ہلدی لڑکی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بال بھورے اور آنکھیں بادامی تھیں۔ پاؤں میں کپڑے کے کڑھے ہوئے سینڈل اور کلائی پر سنہری زنجیر میں نقطہ بھر و پہلی گھڑی تھی۔

اس نے کہا "میرا نام شازیہ ہے اور میں اپنے دھیان میں چلی جا رہی تھی کہ مجھے تمہاری آواز نے گھیر لیا۔"

صبح صادق اس بے وقوف لڑکی کو اپنے سامنے ایسی لایعنی باتیں کرتے دیکھ کر میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تو اس نے ذرا

اونچی آواز میں کہا "میرا نام شازیہ ہے اور میں وادی سے آئی ہوں۔"

"لیکن وادی کے تو سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں اور وہاں سے کوئی نکل نہیں سکتا۔"

"مجھے دو سپاہیوں اور ایک سویلین نے ریپ کیا ہے اس لئے میں وہاں سے نکل آئی ہوں۔"

"تم ریپ ہو چکی ہو۔" میں نے اس کے چہرے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنے گھر سے صرف سو گز کے فاصلے پر!" پھر اس نے اپنی دائیں جانب اشارہ کر کے کہا "یہ میرے ہزبینڈ ہیں، عمران۔"

میں نے اس کے ہزبینڈ کو غور سے دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

کہنے لگی "تمہاری شادی کو ابھی پورے چھ ماہ بھی ہوئے تھے کہ سپاہیوں نے مجھے ایک چنار کے پیچھے لے جا کر ریپ کر دیا

۔"

"اور عمران کہاں تھا اس وقت؟" میں نے غیر مرئی عمران کو غصے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس کو انہوں نے گولی مار کر زخمی کر دیا تھا۔"

"لیکن انہوں نے اسے گولی کیوں ماری؟"

"مجھے ریپ کرنے کو۔"

"اور انہوں نے تمہیں ریپ کیوں کیا؟"

"وادی کی موجودہ وضع برقرار رکھنے کو۔"

"تم نے اپنا نام شازیہ بتایا ناں!"

"شازیہ عمران۔ لیکن اب میں آزاد ہو چکی ہوں اور میرا نام صرف شازیہ ہے۔"

"لیکن تم ادھر کیسے آ گئیں شازیہ، اس طرف؟"

"میں تو اپنے دھیان میں چلی جا رہی تھی انکل کہ آپ کے بول کی ایک سنگل نے مجھے پیچھے کھینچنا شروع کر دیا۔"

"میرے بول کی سنگلی نے؟"

"کچھ آپ آوازیں دے کر بلا نہیں رہے تھے، کسی کو منگا نہیں رہے تھے"

میں نے کہا "میں تو جا پ کر رہا تھا، اور جب میری طبیعت پر بوجھ ہو تو میں اسی طرح سے جا پ کیا کرتا ہوں۔ اسی وجہ سے میں آج

سیر پر بھی نہیں گیا۔"

شازیہ نے کہا "ہم پر بڑا ظلم ہو رہا ہے اشفاق صاحب، اور ہمارا کوئی پرسان حال نہیں۔"

میں نے کہا "کبھی تم مجھ کو انکل کہتی ہو، کبھی اشفاق صاحب۔ تمہارا کیا ہے؟"

اس نے کہا "میرا ارادہ ہے کہ آپ ادیب اور شاعر ہم پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں اور ظالم کو قراقری سزا دلوائیں!

"

میں نے کہا "تم چاہتی کیا ہو شازیہ؟"

"میں چاہتی ہوں کہ ہمارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کیا جائے۔ وہ وعدہ جو ساری دنیا کے سامنے، ساری دنیا کے فورم میں،

ساری زبانوں میں چھاپ کر کشمیریوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "ہم تو اس وعدے کے پابند ہیں اور اس پر کاربند ہیں۔ تمہارے مالک جس کے قبضہ قدرت میں تمہارا جان ہے، وہی

اس وعدے سے مکر گئے۔"

"مگر آپ بھی تو اس معاہدے کے ایک شریک ہیں۔" شازیہ نے کہا "اور آپ کی بھی تو کوئی ذمہ داری ہے۔ پھر آپ اپنی ذمہ

داری پوری کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے کہا "ہماری ذمہ داری مجبوری کی نذر ہو چکی ہے، اس لئے ہم معذور ہیں اور ہم سے یہ....."

اس نے میری بات کاٹ کر ذرا غصے سے کہا "انکل ہم مرتے رہیں گے، ریپ ہوتے رہیں گے، جلتے رہیں گے اور آپ اپنی

مجبوری کی وجہ سے خاموش بیٹھے رہیں گے۔ "پھر اس نے تیوری چڑھا کر کہا" میں ایک عام آدمی سے بات نہیں کر رہی، ایک ادیب سے ہمکلام ہوں۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور یوگا کا ایک چھوٹا آسن کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا وہ میرے اس لائق کے رویے سے تنگ آ کر چلی جائے گی، لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ میرا خیال ہے جو عورت ایک مرتبہ ریپ ہو جاتی ہے، وہ ڈھیٹ سی ہو جاتی ہے۔ اس کو مردوں پر، عورتوں پر، بچوں پر حتیٰ کہ جانوروں تک پر کوئی وشواس نہیں رہتا۔ وہ اپنی ماں سے بھی ڈرنے لگتی ہے..... جس نے اسے جنم دیا تھا، دودھ پلایا تھا، دھوپ میں لٹا کر کڑوے تیل کی مالش کی تھی، آنکھ میں سرمہ ڈالا تھا، بتی دی تھی، گرائپ واٹر پلایا تھا، رات کو دو مرتبہ جاگایا بدلا تھا، ہر بار سوکھے نہالے پر لٹایا تھا۔ وہ اپنی ماں سے اس لئے ڈرتی ہے کہ اس نے جان بوجھ کر اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا اور بڑ کر کے جوان کر دیا تھا۔ اور اسی جوانی کی وجہ سے وہ ریپ ہو گئی۔ وہ ڈرتی ہے۔

وہ اپنے باپ کے خلاف نفرت سے بھر جاتی ہے اور بلغم کی زیادتی کی وجہ سے بار بار تھوک اگلتی ہے۔ اس باپ کے خلاف ہو جاتی ہے جو اسے کندھے پر بٹھا کر بازار لے جاتا تھا، اماں کے روکنے کے باوجود اسے قلفی کھلاتا تھا، چرخ چونڈے میں بٹھا کر گول گول جھونٹے دلاتا تھا۔ جیسے جیسے ڈرتی تھی، باپ کے سینے سے چمٹی جاتی تھی۔ جس قدر تیز دل دھڑکتا تھا، اسی تیزی سے باپ کی بغل سے جھانکتی ہوئی آنکھیں جھپکتی تھیں۔ اس کو اپنا بابل زہر لگتا تھا..... کہ وہ اس کی منی سے تعلق رکھتا تھا جس نے اسے ریپ کیا۔ بھلا بابل کو کیا ضرورت تھی کہ ان لوگوں جیسا نظر آئے جو دھیوں بہنوں کو ریپ کر دیتے ہیں۔

شازیہ نے ہولے سے ایک مرتبہ پھر "انکل" کہا اور جب میں نے چہرہ اس کی طرف اٹھا کر پوچھا "کیا ہے؟ تو وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔ شرمندگی ٹالتے ہوئے بولی "آپ کا کیا خیال ہے ہمارا کشمیر آزاد ہو جائے گا کہ نہیں؟" میں نے کہا "مجھے کیا معلوم، میں کوئی جوتشی ہوں۔ ویسے میری آرزو تو ہے کہ آزاد ہو جائے کیونکہ آزادی سب سے بڑی نعمت ہے.... لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اس نے مسکرا کر میری طرف غور سے دیکھا اور ہنس کر کہنے لگی "انکل جی یہ کسی ادیب کے فقرے نہیں لگتے، کالم نویس کی ریکارڈنگ معلوم ہوتی ہے۔ میرے طرف دیکھ کر بات کیجئے۔"

میں نے اپنا چہرہ اوپر اٹھا کر کہا "دیکھو بی بی! اگر تم اپنا کشمیر آزاد کرانا چاہتی ہو تو بھارت کے ادیبوں اور دانشوروں سے بات کرو، ان کے ضمیر کو جگاؤ اور ان کی اخلاقی اقدار کو جھنجھوڑو۔ شاید ان میں کوئی رائٹر تم کو ایسا مل جائے جو تمہارا ساتھ دے۔" وہ سوچ میں پڑ گئی اور اپنی بیاہتا انگلی میں عروسی انگشتری گھمانے لگی۔ میں نے کہا "اگر وہاں تم کو ایک بھی با اصول اور حقیقت پسند ادیب مل گیا تو تمہاری ریغمال وادی پھر سے زندہ و سرسبز ہو جائے گی۔ لیکن مجھے اس کی امید نہیں۔"

شازیہ نے پرامید لہجے میں کہا "میں افسانہ نگار رام لال سے ملی تھی اور وہ میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے تھے لیکن انہوں نے معذرت کر لی کہ ان کا میدان افسانہ نگاری ہے، سیاست نہیں۔ وہ حالیہ لکھنوی تہذیب اور اس کی تیزی سے بدلتی ہوئی قدروں کے

بارے میں کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کو کشمیر کا کچھ پتہ نہیں۔"

میں نے کہا "رام لال بہت ہی پیارا انسان ہے۔ اس کو واقعی کشمیر کا کچھ پتہ نہیں ہوگا۔ وہ اس قدر معصوم آدمی ہے کہ اس نے آج تک سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کشمیر ابھی تک غلام ہے۔ بھارت آزاد ہو گیا، پاکستان معرض وجود میں آ گیا ہے لیکن کشمیر ابھی تک ہری سنگھ کی معنوی اولاد کے قبضے میں ہے۔"

شازیہ نے کہا "میں نے ان کی انسان دوستی اور فضائل آزادی کی کہانیوں کا حوالہ دے کر ان کی منت کی کہ وہ صرف قلم سے ہمارا ساتھ دیں اور اپنی حکومت کو اس کو وعدہ یاد دلائیں لیکن وہ مانے نہیں اور کہنے لگے..... بی بی میں جھگڑوں میں نہیں پڑتا۔ میری لائن انسان دوستی ہے، سیاست نہیں۔"

میں نے کہا "شازیہ بی بی! میں اس کی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ وہ بہت ہی بھلا انسان ہے، مگر مجبور ہے۔ اپنی اپنی گورنمنٹوں کے آگے سب ہی مجبور ہوتے ہیں۔ تمہیں اس پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔"

شازیہ کہنے لگی "میں نے ان پر بالکل بوجھ نہیں ڈالا۔ کبھی ملاقات ہو تو ان سے پوچھ لیجئے گا۔ بس چھوٹا سا تقاضا کر کے واپس آ گئی۔ البتہ گوپی چند نارنگ صاحب سے میں دو مرتبہ ملی۔ وہ چونکہ سرکار دربار میں ایک اونچا مقام رکھتے ہیں اور ہر طبقے کے لوگ انہیں اونچا مقام دیتے ہیں اس لئے میں ان سے ایک مرتبہ مایوس ہونے کے بعد بھی ملی اور بڑی دیر تک ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھی رہی۔"

"پھر کیا کہا انہوں نے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں انکل، کہنا کیا تھا۔ سر جھکا کر بیٹھے رہے اور بڑی دیر تک میری بات کا جواب نہ دیا۔ پھر سر اٹھا کر کہنے لے..... شازیہ میں اس معاملے میں تمہاری، تمہاری گھر والوں کی یا تمہارے کشمیر کی کچھ مدد نہیں کر سکتا۔ یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔ میں گرانٹر، عروض اور ساختیات کا سٹوڈنٹ ہوں۔ اس سلسلے میں اگر تم کچھ پوچھنا چاہو تو میں حاضر ہوں۔ اس کے علاوہ اور کسی بات کو میں نہیں جانتا..... میں نے کہا، سرفوجی ہم کشمیریوں کو چین چین کر مار رہے ہیں اور ہم سے ہمارے کشمیری ہونے کا بدلہ لے رہے ہیں کہ ہم نے ریفرنڈم کا ذکر کیوں کیا۔ آپ ادیب اور شاعر اور نقاد اور دوسرے دانشور اپنے قلم کو ہماری سہائیا اور رکھشا کے لئے استعمال کریں۔ اور ہمارا حق ہمیں دلوائیں۔"

میں نے کہا "شازیہ! نارنگ صاحب بڑے دردمند آدمی ہیں اور ان کا دل ہر دکھی انسانی کے لئے بڑی شدت سے دھڑکتا ہے۔ وہ کشمیر کے لئے کیوں اپنی آواز بلند نہیں کریں گے!"

شازیہ نے کہا "وہ فرما رہے تھے کہ وہ اپنی فیلڈ سے باہر نہیں جاسکتے۔ ان کی ساری علمی تربیت امریکہ میں ہوئی اور وہ ولسکنس یو نیورسٹی میں کئی سال تک پڑھاتے رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ مغربی ممالک کے سکالرز اس کو حد درجہ کی خیانت سمجھتے ہیں اگر کوئی سکالر اپنی فیلڈ چھوڑ کر ان پاپ شاپ باتیں کرنے لگے اور بزعم خود ہر فن مولابن جائے۔ میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ "اردو زبان کی ترویج و ترقی میں جموں اور کشمیر کا حصہ" پر ایک کتاب، ایک تھیسس یا ایک مضمون لکھ دو لیکن اس کی بیعت کذائی، موجودہ صورت اور حیثیت عربی میں کسی قسم کی تبدیلی کا

کوئی بھلاؤ نہیں دے سکتا۔"

میں نے کہا "تم بہت ہی ضدی سی لڑکی دکھائی دیتی ہو، اپنی من مانی کرنے والی۔"

شازیہ نے گردن گھما کر عمران سے پوچھا "کیوں، میں ضدی ہوں عمران؟" لیکن عمران وہاں موجود ہوتا تو اس کی بات کا جواب دیتا۔ وہ کھسیانی سی ہو کر میرے بازو کو کھنبا نوچنے لگی اور فقرے جھلا جھلا کر کہنے لگی "اٹھئے ناں انکل، ہمارا ساتھ دیجئے۔ ہماری مدد کیجئے۔ ہماری سروں پر ہاتھ رکھئے۔ ہم کو بھی اپنے جیسی آزادی لے کر دیجئے۔"

میں نے جھلا کر کہا "یہ کوئی آزادی ہے، کوئی فریڈم ہے۔ کوئی اظہار رائے کر سکتا ہے کھل کر۔ کوئی اپنے دل کی بات کر سکتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کا کوئی مقام ہے اس جگہ۔ کوئی ان کے لئے اچھی نوکریاں یا اچھے رتبے یا پلاٹ اور پینشنیں ہیں کہ معاشرے میں ان کا مقام ہو، ان کی بات سنی جائے، اس پر توجہ دی جائے۔ یہ سیٹھوں کا اور تاجروں کا اور جاگیرداروں کا ملک ہے۔ یہاں ہماری نہیں، افسر شاہی کی عزت زیادہ ہے.... بے ایمانوں، مکاروں اور چور بازو کی زیادہ وقعت ہے اور جب تک میری وقعت نہیں ہوگی، میں تمہارا کسی قسم کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جب تک میرا اپنا کوئی مقام نہیں ہوگا، تم کو اور تمہاری کمیونی کو کوئی مقام نہیں دلواسکتا۔ تم کو بھارت کے ادیبوں اور شاعروں، گلم سازوں، تھڑا اور تھیر والوں کا سہارا پکڑنا چاہیئے۔ ان سے مدد مانگنی چاہئے۔"

شازیہ نے کہا "ہم شام بیٹے گل سے بھی ملے تھے، میں اور عمران..... اور ستیہ جیت رے سے بھی۔ لیکن انہوں نے بھی معذرت کر لی کہ چونکہ وہ ناردرن انڈیا کے معاملات کو اچھی طرح سے نہیں سمجھتے اس لئے معذور ہیں۔ وہ بنگال کی حد تک لوگوں کے دکھ درد اور ان کی درگھٹنا سے واقف ہیں، اس سے باہر کچھ نہیں جانتے۔ پھر وہ یہ سارے دکھ درد صرف فلم کے فریم ورک میں پیش کر سکتے ہیں اور ان کو سینسر کی پابندی اور گورنمنٹ کی پالیسی کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو شازیہ تم اپنا مانی الضمیر ٹھیک سے ان کو سمجھا نہیں سکی ہو۔ تم نے وہاں بھی اپنے ریپ کا قصہ کر دیا ہوگا کہ چونکہ یہ فلم والے ہیں اس لئے ریپ میں زیادہ دلچسپی لیں گے۔"

شازیہ نے کہا "نہیں انکل، اس وقت تک تو میرا ریپ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس وقت تو ہم شادی کے فوراً بعد سارے ہندوستان کے ٹور پر نکلے ہوئے تھے۔" پھر س نے ہنستے ہوئے غیر مرئی عمران کی طرف دیکھ کر کہا "بھئی میں اچانک عمران کا اپنڈیکس کا آپریشن کرنا پڑا..... آنا فانا آدھی رات کے وقت۔ اباجی بذریعہ ٹیکس پانچ ہزار روپے بھیجے سری نگر سے۔"

میں نے کہا "ستیہ جیت رے کو تو سمجھ میں آئی طاہتے تھی تمہاری بات۔ وہ تو بڑا ہمدرد آدمی ہے۔"

"پہلے پہل تو آتی رہی انکل" شازیہ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "لیکن پھر وہ دونوں ہی انکاری ہو گئے کہ تمہاری اردو بہت مشکل ہے

اور ہم مشکل اردو نہیں سمجھ سکتے۔ پتہ نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔"

میں نے کہا "ایک وہ دوسرا بھی تو ہے گلزاری لال۔"

"گلزاری نہیں انکل" شازیہ نے بات کاٹ کر کہا "گلزار! اس کو میں تو نہیں ملی البتہ ہم کشمیریوں کا ایک اور وفد نہیں ملا تھا۔ انہوں

نے بھی ہماری بات آگے پہنچانے سے انکار کر دیا۔"

"کیوں، اس نے کیوں انکار کر دیا؟ اس نے تو غالب پر بڑی اچھی سیریز بنائی ہے۔"

"غالب پر اچھی سیریز بنانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آدمی بہتر انسان بن جائے۔ وہ تو میلہ لوٹنے کی بات ہوتی ہے۔ جو لوٹ گیا سو

لوٹ گیا" _____

"پھر کیا کہا انہوں نے؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے کہا، ہم تمہارے کشمیر میں آکر فلم شوٹنگ تو کر سکتے ہیں۔ اس شوٹنگ سے تم کو مالی فائدہ تو پہنچا سکتے ہیں، لیکن تمہاری آزادی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے کہ یہ ہماری پالیسی نہیں ہے۔ ہم جمہوریت پسند لوگ ہیں اور کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتے۔" میں نے اچانک ٹپ کر اپنے زانو پر زور کا ہاتھ مارا اور چیختی آواز میں کہ، شاز یہ اگر کہیں تم علی سردار جعفری اور ان کے گروپ سے مل لیتیں تو تمہارے دکھ دلہ رآن واحد میں دور ہا جاتے۔ تم کو تلنگانہ یاد ہے۔"

اس نے کہا "مجھے تو یاد نہیں، میرے بابا جی اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔"

میں نے کہا "اپنے بابا جی ایک مرتبہ ان کی خدمت میں بھیج کر دیکھو اور پھر مشاہدہ کرو کہ ادیب اور لیکھک کیا کچھ کر سکتے ہیں!"

اس نے کہا: "آپ اپنی بابت فرمائیں، علی سردار جعفری کو بعد میں دیکھ لیں گے۔"

"بعد پر بالکل نہیں چھوڑنا۔" میں نے زور دے کر کہا "یہ لوگ خالص انسان دکھ درد کا مداوا کرنے کے لئے اس دنیا میں آئے ہیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر واپس چلے جائیں گے۔ یہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گزر رہے ہیں اور دار و رسن کی کشمیر کے بے یار و مددگار لوگوں پر ظلم ہو رہا ہے تو یہ ظلم ہو رہا ہے تو یہ ظالموں کی رگوں سے خون کھینچ کر ان کے قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ تم ان کے ساتھ رابطہ کرو، اور فوری طور پر کرو۔ انہیں شاید ابھی تک کسی نے خبر نہیں دی کہ کشمیر پر کیا گزر رہی ہے اور وہاں کے لوگوں پر کیا ظلم ہو رہا ہے ہیں۔"

شاز یہ ایک تمسخر کے ساتھ ہنسی اور پھر مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر کہیں سے علی سردار جعفری صاحب کو پتہ چل گیا کہ کشمیر کے ایک معصوم شخص پر بھی ظلم ہوا ہے تو وہ ایسی دلدوز نظم لکھ کر ضمیر انسانیت کو بیدار کر دیں گے کہ ظالموں کی آنے والی سات پشتیں اس کے خوف سے کانپتی رہیں گی۔ تم ان کو اطلاع تو کر کے دیکھو۔ اور اگر کسی وجہ سے انہیں اطلاع نہیں بھجوا سکتی ہو تو اس وقت کا انتظار کرو کہ انہیں ادھر ادھر سے پتہ چل جائے اور ان کی غیرت جلال میں آجائے۔

شاز یہ نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر اپا ہاتھ بالکل اسی انداز میں رکھا جیسے میری پوتی مجھے اپنی محبت کا یقین دلانے کے لئے رکھا کرتی ہے۔ میں نے گردن گھما کر اس کے ہاتھ کو غور سے دیکھا تو اس کا نہ تو کوئی دباؤ تھا اور نہ ہی کسی لمس کا احساس تھا۔ آنکھیں نچا کر کہنے لگی "بابا جان آپ ان لوگوں کو چھوڑیں اور اپنی بتائیں۔ آپ ہماری کہاں تک مدد کر سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "تمہارے لئے میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ تم کو دو انیاں اور کمبل بچھوا سکتا ہوں۔ بے گھروں اور لاوارثوں کے لئے ٹینٹ اور پلاسٹک کے بڑے Containers.....

شازیہ نے کہا "ہمیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں، ہمیں آپ کی تحریری آشیر واد کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "میں اخباروں میں مضمون لکھ سکتا ہوں، آرٹیکل چھپوا سکتا ہوں..... کام مرتب کروادیتا ہوں۔"

اس نے کہا "اخباری رائٹر کی حیثیت سے نہیں، ادیب کی حیثیت سے لکھ کر دیجئے۔ ہمیں ادیب کی تحریر کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "تم کو یاد ہے ہم ادیبوں اور پروفیسروں نے ویت نام کی جنگ کے خلاف بہت بڑا جلوس نکالا تھا۔"

کہنے لگی "ایسے ہی ایک جلوس کے ہم کشمیری بھی متنی ہیں۔"

میں نے کہا "ویت نام کی جنگ کے خلاف ہم نے بھگیوں کی توپ سے جلوس نکالا تھا اور گورنر ہاؤس تک مارچ کرتے ہوئے گئے۔"

مال روڈ پر دونوں طرف لوگ سادھے کھڑے تھے۔ صرف تالیوں کی گونج ہمارا خیر مقدم کر رہی تھی۔"

شازیہ نے کہا "مجھے معلوم ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے خوف سے اس وقت کے گورنر نے اپنے اپنی پھاٹک بند کر لئے تھے۔"

کہنے لگی "ایسا ہی ایک جلوس کشمیر کے لئے بھی ہو..... پر امن، پر خلوص، نعروں کے بغیر، آنسوؤں کے ساتھ۔"

میں نے کہا "آج سے اٹھائیس برس پہلے جب منڈیلا قید ہوا تھا، اس وقت بھی ہم نے زبردست احتجاج کیا تھا۔"

کہنے لگی "کشمیر پر کوئی بڑا شاعر چھوٹی سی نظم لکھ کر کسی ادبی پرچے میں چھپوائے گا تو وادی کے لوگوں کے آنسوؤں کا نذرانہ لے گا،

خوشی کے آنسو بابا جان!"

میں نے کہا "ہم نے افریقہ کے کالے لوگوں پر بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ ہمارے دل میں درد ہے۔"

کہنے لگی "ہم سات پشت کے کشمیری اپنے ہی دیس میں بے گھر ہو گئے ہیں بابا جان!"

میں نے کہا "ہم نے فلسطین کے بے گھروں پر افسانے بھی لکھے ہیں اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ہم کسی سے ڈرتے نہیں۔"

کہنے لگی "ہم بڑی مشکل میں ہیں، ہمارا ساتھ دیں۔ ہمیں صرف آپ کی آواز کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "ہم نے جی گوریا، کاسٹر ولوما ہر ایک حریت پسند کا ساتھ دیا ہے۔ ہم کسی سے ڈرتے نہیں ہیں۔"

کہنے لگی "جس وقت آپ کھانا کھاتے ہیں، وی سی آر دیکھتے ہیں، گرم پانی سے نہاتے ہیں، دھوپ میں اخبار پڑھتے ہیں، اپنی

نواسیوں کے ساتھ "فالودی لیڈر" کھیل رہے ہوتے ہیں..... اس وقت ہمارے بچوں کے ہاتھ پیچھے باندھ کر انہیں شوٹ کرنے کے

لئے ٹرکوں میں بٹھایا جا رہا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "ہم نے ہر ظلم کے خلاف لوح و قلم کی پرورش کی ہے اور ہم ہر ظلم کے خلاف زبانی اور تحریری آواز اٹھاتے رہیں گے۔"

شازیہ نے کہا "اشفاق صاحب! پھر ہم پر بھی ایک لمبا سا افسانہ لکھئے۔ ایک لمبی سی بات کیجئے۔ ایک سچا سا ڈرامہ پروڈیوس کیجئے

-

میں نے غضب ناک آنکھوں سے شازیہ کی طرف دیکھا اور چڑکھا "تم میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔ اس ملک میں دوسرے رائٹر بھی تو ہیں اور ادیب ہیں، اور شاعر ہیں، اور قلم کار ہیں۔"

اس نے اپنی دونوں بینیاں میرے کندھوں پر رکھ کر محبت سے کہا "وہ اس لئے بابا جان کہ آپ سینئر رائٹر ہیں اور سینئر رائٹروں پر چھوٹوں کا حق فائق ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "قاسمی صاحب مجھ سے بھی سینئر ہیں۔ ضمیر مجھ سے دو سال بڑا ہے۔ شوکت صدیقی ڈیڑھ سال سینئر ہے۔ میرزا صاحب تین سال بڑے ہیں۔ تم ہاتھ دھو کر میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔ بیسیوں مجھ سے سینئر اور سارے ہی مجھ سے زیادہ نامور اور محبوب مصنف ہیں، پھر تم اکیلے مجھی پر کیوں بوجھ ڈالے جا رہی ہو؟"

کہنے لگی "کہہ تو رہی ہوں کہ آپ ہی سب سے بڑے ہیں اور آپ ہی سینئر ہیں، لیکن آپ نے خوف کے مارے دوسروں کی عمریں گنونا شروع کر دیں۔ اب آپ سے کیا کہو..... آپ نے تو دس سال تک ایک سطر بھی افغان مجاہدین پر نہ لکھی اور لاکھوں مجاہدین آپ کی نظروں کے سامنے آپ کے گھر کی دہلیز پر شہید ہو گئے۔"

میں نے کہا "وہ سطر تو ہم نے اس لئے نہ لکھی کہ ہوا مریت کا زمانہ تھا اور ہم لکھنے والوں کو آمریت سے، ڈکٹیٹر شپ سے اور مارشل لا سے شدید نفرت ہے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ گھٹن کے زمانے میں ہم اپنے الفاظ کی قدیلیں روشن کریں اور بد بخت تاریکیوں کو اپنا قیمتی اجالا عطا کریں۔"

شازیہ کے چہرے پر نفرت کی سبز کائی پھٹی تو شفاف پانی میں اس کے سرخ بھبھوکا چہرے کا عکس نمایاں ہوا۔ پھر دیکھتے دیکھتے اس پر ٹھنڈی سیت آسمانی رنگ کی ہوائیں چلنے لگیں۔ اس نے سب کچھ بھول بھال کر میری طرف غور سے دیکھا اور ماتا بھری شفقت کے ساتھ کہنے لگی "میں بہت ہی شرمندہ ہوں کہ میں نے یہاں آکر خواہ مخواہ آپ کو ڈسٹب کیا۔ آپ تو بہت ہی ڈرے ہوئے اور خوف کے مارے انسان ہیں۔"

"تم کو اس کرتی ہو۔" میں نے چیخ کر کہا "اور میرے ہی گھر آ کر میرا پیمان کر رہی ہو۔ جاؤ، میں نہیں لکھتا تم پر کوئی کہانی۔ کوئی دھونس ہے، کوئی زبردستی ہے!"

شازیہ نے کہا "آپ تو بہت ہی دہشت زدہ انسان ہیں انکل کہ سوائے پاپولر موضوعات کے اور داد دلانے والے عنوانات کے اور کسی موضوع پر قلم ہی نہیں اٹھا سکتے۔ دراصل آپ کو نامقبول ہو جانے کے خوف نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور آپ کوئی اصل، اور جینل اور طبع زاد بات کر ہی نہیں سکتے۔"

تھوڑی دیر وہ محبت کے جذبات سے سرشار اسی طرح کھڑی رہی اور پھر کہنے لگی "آپ کو اس بات کا خوف تو نہیں انکل کہ اگر آپ نے مظلوم کشمیریوں یا ستم رسیدہ افغانیوں کے حق میں کچھ لکھا تو لوگ آپ کو مذہب پسند سمجھنے لگیں گے؟ آپ کو تنگ نظر، کوتاہ بین، قدامت

پسند اور بنیاد پرست کہہ کر روشن خیال دائروں میں آپ کا داخلہ بند کر دیں گے؟ **High minded trend setter** سوسائٹی سے آپ پر رجعت پسند کا پکا اور پائیدار ٹھپہ لگو کر آپ کو ادب کی وراثت سے عاق کر دیں گے؟ آپ اس لئے خوف زدہ ہیں بابا جان کہ آپ کو اس عمر میں بھی مقبولیت کے ساتھ جوانی والا عشق ہے۔ میں نے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کیا اور ایسے ہی صبح سویرے آپ کے محبوب ورد سے نکالا۔"

پھر وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں شرمندگی، لجاجت اور ندامت کا اظہار کرنے لگی۔ میں نے اس بے باک و گستاخ اور دیدہ دلیر لڑکی سے منہ موڑ کر اپنا سر جھکا لیا اور ورد کی طرف پوری طرح توجہ کا دھارا چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بعد میرا سب سے چھوٹا بیٹا شیر ہانپتا کانپتا گھبراہٹ اور ہڑبڑایا اس متروکہ و منسوخ صحن میں داخل ہوا جہاں میرا تخت پوش رکھا ہے۔ اس نے خوف زدہ ہو کر مجھے کاندھے سے ہلا کر دیکھا کہ میری ٹھوڑی سینے میں بالکل پیوست ہو گئی تھی اور منکا گویا ڈھلک گیا تھا۔

میرے سر اٹھانے پر اس نے چیخ کر کہا "بابا جان! ابھی کون آپ سے مل کر گیا ہے؟"

"کون مجھ سے ملک کر گیا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"ابھی ابھی..... جب میں **Gymnasium** سے لوٹا ہوں تو ہمارے پھانک سے ایک نو جوان جوڑا نکل رہا تھا.....

خوبصورت، صحت مند، خوش طبع و خوش خرام _____ ان دونوں نے مجھے ایک ساتھ سلام کیا، لیکن میں ان کے سلام کا جواب نہ دے سکا۔"

پھر میرا بیٹا رک گیا _____ اور میں بھی اس کے انتظار میں رک رہا۔

اشیر نے کہا "ان دونوں کے بدن پر گولیوں کے بے شمار نشان تھے اور ان کے زخموں سے ابھی تک خون رواں تھا۔ یہ کون لوگ تھے بابا جان جو مرنے بھی جا رہے تھے اور آپس میں باتیں بھی کئے جا رہے تھے؟"

میں نے اپنے بیٹے کی بات کا کوئی جواب نہ دیا کہ وہ ان دونوں جنوں، بھوتوں، آسیب زدہ کہانیوں کے ویڈیو لاکر دیکھتا رہتا ہے اور سپرنیچرل پر اعتقاد کرنے لگا ہے۔ لیکن میں زیادہ پریشان نہیں ہوں کہ جب بنک میں اس کا آزمائشی پیریڈ ختم ہو جائے گا تو وہ ایک اچھا کامیاب اور حقیقت پسند بینکر ثابت ہوگا۔ اور اس کو اپنی حفاظت کرنے کے کئی طریقے خود بخود آ جائیں گے۔

Virtual Home
for Real People

بے غیرت مدت خان

www.HallaGulla.com

"تم کو معلوم نہیں اے باچا بیگم! اور اس راز کو میرے جیسی گہرائی سے اور کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اسباب سوال امت بس ایک ہی ہے اور وہ ہے علم سے دوری، علم سے بیگانگی، علم سے نفرت۔ جس قوم نے علم سے محبت کرنا چھوڑا باچا بیگم..... وہ غرق ہو گیا، تباہ ہو گیا۔ اس کا پھر ڈکا بھی نہ رہا اس دنیا میں۔ مسلمان کی تباہی کا راز ہی اس حقیقت میں چھپا ہوا ہے کہ مسلمان نے شروع دن سے علم سے محبت نہیں کیا۔ اس کو غیر ضروری سمجھا اور اس کو حاصل کرنے کے واسطے کوئی کوشش نہیں کیا۔ نہ آج نہ کل۔ نہ ہی آگے اس کے واسطے کوئی کوشش کا خیال ہے۔ اور یہ ہمارے پاکستان میں ہی نہیں باچا بیگم، کل مسلمان ملکوں میں اس کا یہی حال ہے۔ علم کا داخلہ ہر جگہ بند ہے۔ علم کے اوپر ہر مسلمان گھر میں ٹیکس لگا ہوا ہے۔"

باچا بیگم نے حیرانی سے خان کی طرف دیکھا۔ عینک اتار کر اپنی اوڑھنی سے صاف کی، کھاٹ کے پاس پڑی اپنی الٹی جوتی کو جھک کر سیدھا کیا اور پھر مسکرانے کے ارادے سے نگاہیں اوپر اٹھائیں تو جلال خان نے کہا:

"صرف عینک کے شیشے صاف کرنا علم نہیں اے باچا بیگم! اس کے لیے جان دینا پڑتی ہے، کوشش کرنا پڑتی ہے، دن رات ایک کرنا ہوتی ہے، علم کوئی مذاق نہیں اے۔"

ان کی کوٹھی سے باہر، بڑے لان میں جلال خان اور باچا بیگم کا بیٹا پنی سیاہ ترکی دنیوں کو نہلا کر ان کی چکیوں پر تین قسم کے گٹھکوں سے برش کر رہا تھا۔ مدت خات بابا جلال خان کی شادی کے پورے چودہ برس بعد پیدا ہوا تھا، اور ایف اے تک تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد آگے پڑھنے سے انکاری ہو گیا تھا۔ اس کے پاس خوبصورت چکوروں کا جوڑا تھا۔ سات دنبے دنییاں تھیں۔ چاچا جنیر کا نگر کوٹ سے بھجوا یا ہوا ایک مور تھا اور لال رنگ کی ایک جیپ تھی۔ درے کی رانفل کے علاوہ اس کے پاس ایک کلاشکوف بھی تھی۔ ڈچل گھڑی، کیرے اور سرخ رنگ کے ایک آسٹرین ٹینٹ کے علاوہ ایک دور مار ٹارچ بھی تھی جس کی بلٹ ان بیٹری، ٹارچ کی سپرنگ لوڈ ڈکمر دوسو سے دوسو بیس مرتبہ دبانے پر فل چارج ہو جاتی تھی۔

مدت خان کے پاس سوائے علم کے اللہ کا دیا اور سب کچھ تھا۔ محبت، شفقت، جواں مردی، اطاعت، مسکراہٹ، غریب پروری، جفا کشی یہ سب چیزیں مدت خان کے پاس وافر مقدار میں موجود تھیں۔ لیکن علم کے معاملے میں اس کا خانہ خالی تھا۔ اس نے ایف اے اچھی سیکنڈ ڈویژن میں کرنے کے بعد آگے پڑھنے سے جواب دے دیا تھا اور جلال خان کی زندگی بڑھاپے کی آمد سے پہلے ہی برف پوش ہو گئی

تھی۔

مہذب ملکوں میں علم حاصل کرنے کی لگن صرف روس اور امریکہ ہی کو نہیں بلکہ یورپ کے بے شمار چھوٹے چھوٹے ملک بھی اس لگن میں دیوانہ وار تڑپ رہے ہیں اور انہوں نے علم کی کمی پوری کرنے کے لیے اپنی ہر شے داؤ پر لگا دی ہے۔ لیکن بابا جلال خاں کا اکلوتا بیٹا مدن خان اپنی ساتوں سیاہ دنیوں کو برش کر کر کے ان کی سیاہ فر کو ایسے چمکاتا ہے کہ وہ روشنی جذب کرنے کے بجائے رخشندگی منعکس کرنے لگتی ہیں۔ اس کا کیا بنے گا!

اس وقت آسٹریئن ٹائی رول سے ایک، کوپن ہیگن سے دو، ایٹل برک لکمرگ سے ایک، زیورچ سے دو اور ہالینڈ سے بھی دو سکار پاکستان کے تین بڑے شہروں میں دیوانہ وار گھوم رہے تھے اور ان سب کا مرکز اسلام آباد تھا۔ جیسے کنوئیں کی ٹنڈیں بڑی لمبی ماہل پر ایسے ہی بیکار اور خالی خالی گھومنے کے بعد پانی کے مرکز میں ضرور غوطہ لگاتی ہیں۔ اسی طرح یہ سکا کٹر بھی اپنے اپنے وقت پر اسلام آباد کا چکر ضرور لگاتے تھے۔

زیورچ: بڑی حیرانی کی بات ہے برناب گل..... کہ تم ٹارگٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہی نہیں ہو سکے۔
 برناب: نہیں صاحب! یہ بات نہیں ہے۔ ہم ٹارگٹ پر پہنچا اور برابر پہنچا لیکن اس وقت کابل کا آدھا علاقہ مجاہدین کے قبضے میں تھا۔
 زیورچ: مجاہدین کا قبضہ تو تمہارے فائدے کی بات ہی برناب گل!
 برناب: نہیں سر! فیدے کی نہیں، خطرے کی بات تھی۔ پورے چھ گھنٹے وہ علاقہ مجاہدین کے کنٹرول میں رہا۔ اس وقت آپریشن مشکل تھا۔

زیورچ: پھر جب مجاہدین کا کنٹرول ختم ہوا.....؟

برناب: اس وقت دوسرا کنٹرول شروع ہو گیا صاحب! سرکاری اور روسی۔ اس وقت بھی آپریشن مشکل تھا۔

زیورچ: پھر تم کدھر روپوش ہوا؟

برناب: روپوش ہونے کی کیا ضرورت تھی صاحب! ہم بس کے اڈے پر بیٹھا چائے پیتا رہا۔

زیورچ: کسی کو تم پر شک تو نہیں ہوا؟

برناب: نہیں صاحب! شک کیسے ہو سکتا تھا، ہم چائے پی رہا تھا اور پیالہ خالص کا بلی تھا۔ چائے خالص کڑک تھا۔ ہمارے کپڑوں کا بدبو لاری کے اڈے کے بدبو سے ملتا جلتا تھا۔ شک کدھر سے ہونا تھا!

زیورچ: لیکن اب مشکل یہ ہے برناب گل.....

برناب: آپ فکر نہیں کرو صاحب! ہم اسی رقم میں ایک اور ایک کرے گا۔

زیورچ: رقم کی بات نہیں ہے برناب گل! یہ وقت کی اور موقع کی بات ہے۔ اس وقت ہم وقت کے خلاف چل رہے ہیں.....

برناب: توبہ توبہ سر! وقت کے خلاف کون چلا سکتا ہے۔ اللہ پاک جب انسان کے بچے کو پیدا کرتا ہے تو اس کو وقت کے اندر ڈال کر وقت

کے ساتھ ساتھ چلاتا ہے۔ ایک سال، دو سال، تین سال..... وقت کے برخلاف کوئی نہیں چل سکتا..... جو چیز ایک مرتبہ وقت میں داخل ہو گیا وہ باہر نہیں نکل سکتا۔

زیورچ: دیکھو یہ بحث کا وقت نہیں ہے، سوچنے کا وقت ہے۔

برناب: یہ کام تمہارا ہے، سوچنے کا۔ یہ تم کرو۔ اٹیک کرنا ہمارا کام اے، وہ ہم کرے گا۔ ویسے ایسا خیال دل سے نکال دو صاخ کہ انسان کا بچہ وقت کے خلاف چل سکتا۔ کوئی نہیں چل سکتا۔ بڑا بڑا پیر پیغمبر اپنے آخری وقت پر آخرت میں چلا گیا، خلاف نہیں چلا۔ وقت نہیں ٹل سکتا صاحب! وقت کے خلاف کدھر سے چل سکتا ہے انسان کا بچہ!

زیورچ: ٹھیک اے ٹھیک اے ٹھیک اے۔ اب بولنا نہیں ہے۔ مجھے سوچنے دو۔ شاباش!

برناب: ٹھیک ہے سر! سوچو۔ سوچو۔ شوق سے سوچو۔

ڈیر سر! جب میں ڈین ہاگ سے چلا تھا تو میں نے گیارہ صفحے کی ایک سمری صاحب ثقافت کی خدمت میں بھجوائی تھی جس میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی تھی کہ یہ آپریشن کچھ ایسا آسان نہیں۔ چیکو سلواکیہ والوں کو یہ سہولت ہے کہ وہ فاتح ملک کے ساتھ وابستہ ہیں اور انہیں افغانستان کے اندر باہر جانے کی پوری پوری آزادی ہے۔ ہم کو ہر کام مجاہدین کی مدد سے کرنا پڑتا ہے اور مجاہدین پرس سلسلے میں بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے سامنے اپنا ہی اتنا بڑا مشن ہے کہ وہ ہماری اس لگن کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن ہم اپنے جذبے سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ ہم کچھ نہ کچھ تو ضرور حاصل کر کے رہیں گے خواہ اس کے لیے ہمیں سال بھر یہاں بیڑھ کر انتظار کرنا پڑے۔ ایک برق انداز کو ایک نئی کوشش پر روانہ کر دیا گیا ہے لیکن مشرقی ممالک میں چونکہ تعلیم عام نہیں اور علم سے محبت نہیں اس لیے برق انداز اس مرتبہ بھی اس مشن کو ادھورا چھوڑ کر آجائے گا۔ ہم نے روپے کا لالچ بڑھا دیا ہے اور معرکہ مارنے کی فیس دگنی کر دی ہے۔ امید ہے کہ اب وہ روپے کی لالچ میں آکر ضرور ہمارا ساتھ دیں گے لیکن اس عارضے کا کیا علاج کہ دوسرے یورپی ممالک ہمارے حریف بنے بیٹھے ہیں اور ہر معاملے میں ہم سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ بہر کیف آپ خاطر جمع رکھیں تمام مشکلات کے باوصف ہم سیدھی اور صحیح لائن پر جا رہے ہیں۔

اس وقت زیورچ کے دوسرا لڑ ہمارے مقابلے میں تیزی سے کام کر رہے ہیں اور ان کو فارن ایجیکس کی کوئی مشکل نہیں۔ مشکل تو ہمیں بھی نہیں لیکن ان کے پاس زر مبادلہ کے فاضل ذخیرے ہیں جو وہ ٹارگٹ پر بے دریغ لگا رہے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہمارا ایک مشن کیرئیر ان کے ساتھ بھی ملا ہوا ہے اور ان کو بھی اتنا ہی مان دیتا ہے جتنا ہم کو۔ جب مشن پورا ہو جائے گا تو وہ یقیناً سودے بازی کرے گا۔ مشرق کے لوگ علم فروخت کر دیتے ہیں۔

ہمارے مقابلے میں لکمبرگ نے بہت حد تک ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ان کا نمائندہ ان دنوں دیپال پور میں مقیم ہے اور پرانے

آثار کے فوٹو اتار رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس مہم سے بہت حد تک کنارہ کش ہو چکا ہے لیکن پھر بھی ہم کو چوکس رہنا چاہیے۔ اب میں اس رپورٹ کو یہیں ختم کرتا ہوں لیکن اسے روانہ نہیں کروں گا۔ کل اور پرسوں کے حالات دیکھ کر پھر ایک نوٹ لکھوں گا اور اسی رپورٹ کے ساتھ منسلک کر کے بھجواؤں گا۔

خصوصی یادداشت: پاکستان اور پاکستان کے لوگ اور پاکستانی حکومت ہماری کارروائیوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ ہم کو گھومنے پھرنے، یاری دوستی لگانے اور کارروائیاں کرنے کی پوری پوری آزادی ہے۔ پاکستان کا اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ طبقہ جو مشکل سے دو یا سوادو یا حد ڈھائی فیصد تک ہے، بالکل ہماری طرح کی سوچ رکھتا ہے اور ہماری طرز زندگی کو اپنائے ہوئے ہے۔ یہی اس ملک کا رائے گربطہ ہے اور اسی کی یہاں پر حکمرانی ہے۔ یہی طبقہ Trend Setter ہے اور ہر جگہ اسی کا سکھ چلتا ہے۔ گویا اس عہد کی ایسٹ انڈیا کمپنی یہی ہے۔ باقی سارے لوگ عہد مغلیہ کے آخری شہزادے ہیں..... ذہنی طور پر بودے، جسمانی طور پر تودے اور ہر ایک کے لیے بکاؤ سودے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہمارے ساتھ ہے اور ہم کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دیتا۔ اپنے وطن میں ہمیں ہزار مشکلات ہوتی ہیں لیکن یہاں ایک بھی مشکل نہیں سوائے مشن کی تکمیل کے۔

اب میں اس رپورٹ کو پھر بند کرتا ہوں اور کل صبح تک کا انتظار کرتا ہوں۔ خون ڈانٹ!

ایکٹ دوسرا — سین پہلا

صبح کا وقت۔ وہی لکڑی کا کیمبن اور وہی اس کے باہر ذرا سے فاصلے پر فولادی رے سے کا پل۔

دریائے کنہارا اپنی پوری تیزی کے ساتھ رواں ہے اور اس کا شور پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہو گیا ہے۔ گوجر لوگوں کے کافلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر واپس جا رہے ہیں۔ ان کی فٹار میں تیزی اور ان کے چلن میں خوشی ہے۔ قدم راستوں سے مانوس اور چہرے فضاؤں سے آشنا ہیں۔ گرمیوں کا یہ سارا موسم گوجر لوگ اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر گزاریں گے اور پھر اکتوبر کے اواخر میں میدانوں کی طرف لوٹنا شروع کر دیں گے۔

ان کے شاٹ لیتے وقت کا خیال رکھا جائے کہ جاتے ہوئے قافلوں کے پہلو سے شاٹ لیے جائیں، چہروں کو یا قدموں کو ایکسپوز کرنے سے حتی الامکان احتراز کیا جائے اور جاتے ہوئے قافلوں کو ان کی بیک سے ایکسپوز کیا جائے۔ ہر مرد عورت بچے بوڑھے کا چہرہ دکھائے بغیر ان کی پشتوں، ان کے سرینوں سے اس حقیقت کو گرفت میں لیا جائے کہ وہ اپنے مسکنوں کی طرف جانے کے لیے کیسے کیسے بے قرار ہیں اور ان کا شوق ان کی پشتوں میں کس کس طرح سے گھمن گھیریاں ڈال رہا ہے۔

نوٹ: یہاں تیز تیز اٹھتے قدموں کے کلوز شاٹس ہرگز نہ لیے جائیں نہ ہی مویشیوں کے کھروں کو ایکسپوز کیا جائے۔ ہر جانور اور ہر مویشی کی دم کے کٹ ٹوکٹ شاٹس لیے جائیں جس کی جھٹک اور پھٹک سے جانوروں کے شوق و طن کا بھجاؤ دیا جائے۔ اس وقت وہی بوڑھا گورانیلی نیکر پہنے اسی بڑے پتھر پر بیٹھا ہے، لیکن آج اس کے ہاتھ میں ایک دوسری پیپر بیک ہے جس کا ٹائٹل

نیلا ہے۔ گورے کی پشاوری چپلوں کے دونوں سٹریپ کھلے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ اپنے پاؤں ان چپلوں سے باہر کھینچ رہا ہے۔ دریائے کنہار کے دوسرے کنارے، پہاڑوں کے تنگ درے سے ایک انسانی دھبہ نمودار ہوتا ہے جو آگے بڑھ کر فولادی رے کے پل کے پھندے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ بوڑھا گورا نگاہیں اٹھا کر اس طرف دیکھتا ہے اور کتاب پتھر پر رکھ کر اپنے چپل کے سٹریپ باندھنے لگتا ہے۔ آدمی سٹیل روپ کے لوپ میں ایک پاؤں رکھ کر دوسرے ہاتھ سے رسہ کھینچتا جاتا ہے اور اس کی بہنگی کی پھر کی تیزی سے چلنے لگتی ہے۔

بڈھا گورا اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے اور بے چینی سے لٹکتے ہوئے مسافر کو دیکھ رہا ہے۔ بڈھے گورے کے چہرے کا کلوز اپ اور اس کی آنکھوں کا ٹائٹ کلوز اپ لیا جائے۔ رے کے پل پر آتے ہوئے آدمی کو بدستور لانگ میں رکھا جائے۔ (یہاں اچھے اچھے ڈائریکٹر زوم ان کرنے کی غلطی کر جاتے ہیں لیکن اس سے احتراز کیا جائے)

آدمی اس کنارے پر پہنچ کر فولادی رے کے لوپ میں سے نکلتا ہے اور اپنے گلے میں لٹکائے ہوئے تھیلے کو ٹھیک کرتا ہے۔ (زوم ان ایم سی یو) آدمی اپنے گلے سے جزوان اتارتا ہے اور اسے ہاتھ میں لٹکا کر آگے بڑھتا ہے۔ بڈھا انگریز اس کی طرف بڑھتا ہے۔ بیک گراؤنڈ میں فن فرم جتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کٹ ٹو کٹ گورا اوپر سے نیچے کو ڈھلک رہا ہے، آدمی نیچے سے اوپر کو لپک رہا ہے۔ دونوں ملتے ہیں۔ مصافحہ کرتے ہیں۔ آدمی جزوان گورے کے حوالے کرتا ہے۔ گورا اس کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے۔ خوشی سے آدمی کا کندھا تھپتھپاتا ہے۔ آدمی اس کے ساتھ گرم جوشی میں بغلگیر ہو جاتا ہے۔ دونوں خوش ہیں۔ بڑی گھٹ کے چٹھی ڈالی ہوئی ہے۔ ان کے جڑے ہوئے کندھوں کے پوائنٹ آف دیو سے دریائے کنہار کی تیزی، بے قراری اور تڑپ کا شاٹ لیا جاتا ہے۔

ڈزالو

جب ایٹل برک اپنی کٹھارہ جیب پھاٹک کے قریب چھوڑ کر جلال خان کی کوٹھی کے پورچ میں داخل ہوا، تو جلال بابا اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے پرانی جامع اللغات کو بڑبڑا کر چسپاں لگا رہے تھے۔ یہ لغت بابا جلال خان کے والد نے خریدی تھی جو ہر شام باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ان کو اس لغت کی ضرب الامثال والا حصہ بہت ہی پسند تھا۔ انہوں نے کئی مرتبہ اس بات کی کوشش کی کہ جلال خان بھی اس لغت کا مطالعہ کیا کرے۔ لیکن جلال خان کو مطالعے کا کچھ ایسا شوق نہیں تھا۔ وہ ہر بات کو وقت وقت کی بات کہا کرتا تھا۔ یہی بات کہنے والا جلال خان اب اپنے مرحوم باپ کو چھوڑی ہوئی بوسیدہ ڈکشنری کو چمکتے کاغذ کی چسپاں لگا کر اس کی مرمت کر رہا تھا۔ ایٹل برک کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر جلال خان اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مصافحے کا ہاتھ آگے بڑھا دیا لیکن ایٹل برک کا اس طرح بے وقت آنا جلال خان کو اچھا نہیں لگا۔

ایٹل برک نے صوفے پر بیٹھ کر اپنے دونوں پاؤں کو زور سے قالین پر مارا اور اس کی نیلی جینز سے تھوڑی سی گرد نمودار ہو کر پھر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ وہ کئی مہینوں سے جلال خان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جلال خان اسے سوائے اپنی مہمان نوازی کے اور

کچھ بھی فراہم نہیں کرتا تھا۔ ایٹل برک نے کہا: "کابل میوزیم سے میں دونوں مسودے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں لیکن اس پر روپیہ بہت خرچ ہو گیا۔"

جلال خان نے کہا: "خیر اے یارا، علم حاصل کرنے میں اگر زندگی بھی خرچ ہو جائے تو کم ہے۔"

"زندگی بھی خرچ ہی ہے ناں جلال خان!" ایٹل برک نے سنہری مونچھوں کے نیچے پھونک بھر کر اسے ذرا سی دیر کے لیے روکا اور پھر پھک سے ہوا نکلا کر بولا "راستے کے تین بھاری پتھروں کا اٹھا کر گہری وادی میں پھینکنا پڑا۔ ایک چوکیدار، ایک کلرک اور تیسرا نامعلوم شخص جو اس وقت کابل میوزیم میں موجود تھا۔ "تینوں کو قتل کروادیا؟" جلال خان نے بے تعلقی سے پوچھا، تو ایٹل برک تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر اپنے سیاہ پشاور چیلوں پر چھڑی مارے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا کہ "یوں تو ایک معمولی سا اور بے معنی سا کام ہے لیکن اس کے ساتھ قوموں کی زندگی وابستہ ہے۔ یہ ایک ایسی جرات مندانہ، عاقبت اندیش اور مصلحت کوش پیش قدمی ہے جس سے کارگزاری کرنے والی قوم کا پلڑا بہت اوپر اٹھ جاتا ہے۔"

"اور جب ایک طرف کا پلڑا اوپر اٹھ جائے" جلال خان نے کہا "تو دوسرا پلڑا خود بخود نیچے چلا جاتا ہے۔"

ایٹل برک نے کہا "گو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے..... لیکن پھر بھی....." اس نے بات بچ ہی میں چھوڑ دی اور پشیمان سا ہو کر مسکرانے لگا۔

جلال خان اس معرکے کے بعد اور بہت کچھ جاننے کا خواہش مند تھا، لیکن اس کے چہرے پر بے تابی کے آثار نہیں تھے۔ وہ ایٹل برک سے بی زیادہ مگبیر انسان تھا اور تجسس کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ کچھ دیر تک ایٹل برک اس کے پاس چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر وہ اٹھا، مسکرایا اور ہاتھ آگے بڑھا کر مصافحے کا طلب کا طلب گار ہوا۔ جلال خان اس کو اس کی جیب تک چھوڑنے گیا اور پھر واپس آ کر اپنی لغت میں چسپاں لگانے لگا۔

جب ایٹل برک کی کھٹارہ جیب کوٹھی کے پھانک سے باہر نکل گئی تو باچا بیگم اندر ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر جلال خان کے سامنے بیٹھ گئی۔ بابا جلال خان نے اپنی بیوی کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں سارے زمانے کا دکھ بھرا ہوا تھا۔ انسانوں کی اس دنیا میں سب سے تکلیف دہ لمحہ وہ ہوتا ہے جب کوئی کسی ایسے بوڑھے پٹھان کے سامنے آجائے جو شدتِ ندامت سے رونے کے قریب ہو۔ اس کی آنکھوں پر روغنی نمی کی ہلکی ہلکی تہچہ چکی ہو لیکن وہ رونے سے معذور ہو۔ جلال خان نے رندھے ہوئے گلے سے باچا بیگم کو بتایا کہ ایٹل برک کابل میوزیم سے اپنی پسند کے دونوں مسودے اٹھوانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے یہ کام ایک دبلے تلے برق انداز کے سپرد کیا تھا، جس نے مغرب کے وقت تین آدمیوں کو ختم کر کے مسودے الماری سے نکالے اور انہیں پلاسٹک کی باریک جھلی میں لپیٹ کر یہاں بھجوا دیا۔

"یہاں کیسے بھجوا دیا؟" باچا بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہاں ایٹل برک کے پاس بابا!" جلال خان نے جھلا کر کہا "ابھی آیا تھا ایٹل برک۔"

"میں نے کس کے پاس نہیں پوچھا!" باچا بیگم نے چڑ کر کہا "میں نے یہ پوچھا ہے کہ کس طرح..... کیسے.....؟"

"پلاسٹک کی باریک تھیلی میں لپیٹ کر سندر خانی انگوروں کی پٹی کے نیچے رکھ کر۔"

"اور جب تین آدمیوں کو ختم کیا، مغرب کے وقت تو کھٹا کا نہیں ہوا؟" باچا بیگم نے پوچھا۔

"اوائے نہیں بابا! اب کھٹا کا کدھر ہوتا ہے۔ اب تو پستولوں کے آگے سیلنسر لگا ہوتا ہے سیلنسر، کھٹا کا مٹا کا نہیں ہوتا ہے۔ انسان

بیٹھا بیٹھا اپنے کمبل میں فوت ہو جاتا ہے۔ ارد گرد کے لوگ سمجھتے ہیں سو گیا ہے کمبل کی گرمائی ہے، نیند آ گئی ہے۔"

"لیکن ایک ناکارہ اور پرانے کاغذ کے بدلے لوگوں کو قتل کرنا انسانوں کا اس میں کیا فید ہے؟"

"اوائے بابا! یہ فرنگی علم کا دیوانہ ہے۔ علم کا شوقین ہے۔ کل دنیا کا گوراء علم کی خاطر لاکھوں ہزاروں انسانوں کو قتل کر سکتا ہے۔ سیلنسر

کے بغیر یا سیلنسر کے ساتھ جیسے اس کا دل چاہے۔"

باچا بیگم تھوڑی دیر تک اسی طرح حیران بیٹھی رہی پھر پوچھنے لگی: "دنیا میں اتنی کتابیں بکتی ہیں اتنا علم بکتا ہے..... گوراء اس کو خرید

کر اپنی کمی پوری کیوں نہیں کر لیتا؟"

بابا جلال خان نے تین مرتبہ اپنے ماتھے پر زور دے ہاتھ مارا اور پھر خاموش ہو گیا۔ باچا بیگم کو اس کا اس طرح خاموش ہو جانا

اچھا نہ لگا۔ اس نے اپنے علم کی کمی کا اظہار ایسی معذرت سے کیا کہ جلال خان کو اس کی حماقت پر پیار آ گیا۔ اس نے اپنی کم علم اور جاہل بیوی

کو معاف کرتے ہوئے کہا "کانوں کو ہاتھ لگانے اور توبہ کرنے سے علم کی دولت نہیں مل سکتی۔ اس دولت پر صرف گوری قوموں کا حق ہے

اور یہ دولت انہی لوگوں کے تصرف میں ہے۔ لیکن اس کے لیے وہ محنت بھی ایسی کرتے ہیں باچا بیگم کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس وقت

سارے افغانستان میں جہاں لوگوں کو زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں گوری قوموں کے دانشور اور علم اکٹھا کرنے والے پرانی اور تاریخی

چیزوں اور آثاروں کو اور مسودوں اور مخطوطوں کو وہاں سے نکال نکال کر اپنے محفوظ ملکوں میں لے جا رہے ہیں۔ وہ زندہ لوگ ہیں باچا

بیگم! طاقت ور لوگ _____ غیرت مند لوگ۔"

باچا بیگم نے ڈرتے ڈرتے کہا: "خان!" اور جلال خان نے پوری آنکھیں کھول کر زبان ہلائے بغیر کہا "بول"

باچا بیگم ہچکچاتے ہوئے بولی: "ان کتابوں میں اور پرانی چیزوں میں کیا ہوتا ہے جو وہ یہاں سے اٹھا کر لے جاتے ہیں؟"

"ان میں علم ہوتا ہے..... علم..... تاریخی علم، زمینی علم، آسمانی علم! لاکھوں کروڑوں ڈالر کا ہوتا ہے ایک ایک مسودہ،

لاکھوں پاؤنڈوں کا۔ ہم لوگ ان کی قدر نہیں جانتے۔ گورا جانتا ہے، گورا۔ ان کو علم سے محبت ہے۔ علم کی قدر شناسی ہے۔ وہ ایک کتاب کے

بعد لے پورے ملک کو تباہ کر سکتا ہے، پوری بستی کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔ وہ قدر دان اے....." باچا بیگم یہ سن کر جی ہی میں بہت

شرمندہ ہوئی کیونکہ جب وہ تخت بھائی مل سکول میں پڑھتی تھی تو اس کو نہ علم کی کوئی قدر تھی نہ کتاب کی۔ وہ بس ایسے ہی پڑھنے چلی جاتی تھی

اور ایسے ہی پڑھ کر چلی آتی تھی۔

جلال خان نے کہا "باچا بیگم! علم کے ترازو کا تول دوسرے تول سے الٹ ہے..... جس پلڑے میں علم زیادہ ہوتا ہے، وہ اوپر

اٹھ جاتا ہے۔ ساری دنیا کا عالم اس کو دیکھتا ہے۔ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہے۔ اور جس پلڑے سے علم نکلتا جاتا ہے وہ نیچے ہوتا جاتا ہے،

چھپتا جاتا ہے، خالی ہوتا جاتا ہے، اندھیرے میں چلا جاتا ہے..... پس ماندگی میں۔"

باچا بیگم نے کہا: "خان! تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟"

"پہلے اس لیے نہیں بتائی" جلال خان نے کہا "کہ تم نے میری بات پر کبھی توجہ نہیں دی۔"

"توبہ، توبہ!" باچا بیگم نے ایک مرتبہ پھر کانوں کو ہاتھ لگا لیا اور سر جھکا کر بولی "اللہ رسول کے بعد میں تمہاری بات ہی سنی خان، اور تمہارے حکم کی ہی تعمیل کی۔"

"گوراجب ہمارے یہاں سے علم لے جاتا ہے" جلال خان بولا "تو وہ طاقتور ہو جاتا ہے اور وہ جتنا طاقتور ہو جاتا ہے اتن ہی ہم کمزور ہو جاتا ہے۔"

"کمزور تو ہانا ہی ہوا خان!" باچا بیگم نے کہا "ہمارا علم جو اس کے ہاتھ آ جاتا ہے، اتنا قیمتی علم لاکھوں کروڑوں پونڈوں والا۔"

"یہ بات نہیں ہے باچا بیگم! ہمارے علم میں کوئی خاص بات نہیں اے۔ کوئی سرخاب کا پر نہیں اے ہمارے مسودوں مخطوطوں میں۔

لیکن ان کے لے جانے سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے....."

"وہ کیا؟" باچا بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

جلال خان تھوڑی دیر تک خاموش رہا اور یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ یہ بات بتائے یا نہ بتائے لیکن پھر خود ہی سر جھٹک کر کہنے لگا: "کوئی لعل نہیں لگے ہوتے ہمارے علم میں۔ کوئی سائنس کا، ہوائی جہاز کا، ایٹم بم کا علم نہیں ہوتا اس میں..... بس اس میں صرف ایک خوبی ہوتی ہے باچا بیگم!..... اس کو اٹھا کر لے جانے میں کہ جس ملک سے وہ علم اٹھایا گیا ہوتا ہے..... ایشیا سے، افریقہ سے، جنوبی امریکہ سے، کسی جزیرے سے..... اس کی آنے والی نسلوں کو اپنا بڑوں کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں رہتا۔"

باچا بیگم نے حیرانی سے پوری آنکھیں کھول دیں۔

"ہر آنے والی نسل اپنے سے اگلی نسل کو طعنہ دیتی رہتی ہے کہ تم اپنے علم کی حفاظت نہ کر سکے، اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور گورے کو دیکھو جو کافر، یہودی، نصرانی ہوتے ہوئے بھی ہمارے علم کو کس طرح سینے سے لگائے بیٹھا ہے اور کس طرح اس کی حفاظت کر رہا ہے، کس طرح اس کا کیٹلاگ بناتا ہے، کس طرح اس کی فیوٹی گیشن کرتا ہے، کیسے کیسے اس کی لیمی نیشن کرتا ہے۔" باچا بیگم کو ان الفاظ کی وجہ سے جلال خان کی بات خاک بھی سمجھ نہ آئی لیکن جلال خان اپنی لہر میں بولتا گی کہ "جس طرح بیوی سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے نوجوان کو اپنے ماں باپ کے بجائے بیوی کے والدین اور اس کے گھر والے اچھے لگنے لگتے ہیں اسی طرح پس ماندہ قوموں میں علم سے مہبت کرنے والی نسل کو گورا اور اس کے گھر والے اور ان کے ملک اور ان کے انداز اور ان کی ادائیں اچھی لگنے لگتی ہیں..... اپنے ملک، اپنے ملک کے لوگ، اپنے گھر، اپنی مائیں بری لگنے لگتی ہیں۔"

"کیوں؟" باچا بیگم نے زور سے پوچھا۔

"اپنا علم گنوا بیٹھنے کی وجہ سے!"

"گنوا بیٹھنے یا چوری کرو بیٹھنے کی وجہ سے؟"

جلال خان نے غصے سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، جس نے ڈرتے ڈرتے کہا: "یا اپنی کمزوری کی وجہ سے چھنوا بیٹھنے کی وجہ سے؟ آخر قوموں کو شکستیں بھی تو ہو جاتی ہیں۔"

"شکستوں اور فتحوں کا مجھے کچھ علم نہیں۔" جلال خان نے کڑک کر کہا "مجھے تو صرف علم سے محبت ہے۔ گو میں خود علم حاصل نہیں کر سکا لیکن علم سے محبت میرے بابا جان سے میرے خون میں منتقل ہوئی ہے۔ میں تو اتنی عمر گزارنے کے بعد بس ایک ہی بات سمجھ سکا ہوں کہ جس ملک کے مسودے، مخطوطے، مورثیاں اور میاں گورا اٹھا کر اپنے ملک میں لے گیا، اس ملک کی چھوٹی نسل اپنی بزرگ نسل سے نالاں اور ناراض رہ کر ہی پروان چڑھی اور پھر اپنے بڑے ہونے پر آنے والی چھوٹی نسل کی لعنت ملامت کا ہد بن گئی کہ جاؤ جاہلو، علم کے دشمنو، تم سے تو اپنے علم کی حفاظت بھی نہ ہو سکی۔"

"اس سے گورے کو کیا فائدہ پہنچا، خان؟" باچا بیگم نے حیرانی سے پوچھا تو جلال خان جوش میں آ کر بولا: "گورا اب لڑ نہیں سکتا ہے باچا بیگم! اس میں اب پہلے والی قوت اور طاقت باقی نہیں رہی ہے۔ اب وہ ساری دنیا کی بے گوری قوموں کو ذلیل و خوار کر کے اور شرمندہ کر کے اور ان کو علم سے بے بہرہ قرار دے کر ہی حکمرانی کر سکتا ہے۔ اس کو احساس کمتری میں مبتلا کر کے ہی ان کے جسموں اور روحوں پر قبضہ قائم رکھ سکتا ہے۔" پھر وہ رکاوٹ اور بڑھے عقاب کی طرح گردن ہلا ہلا کر کہنے لگا: "لیکن علم سے محبت صرف گورے کو ہے۔ اس وقت چودہ ملکوں کے بائیس گماشتے افغانستان کے اندر اور باہر گھوم کر قیمتی مسودے اور مخطوطے اپنے اپنے ملک لے جا رہے ہیں اور ایک ایک مسودے کی کاٹر چاہے انہیں سو سولوگوں کو بھی ختم کرنا پڑے، وہ گریز نہیں کرتے۔ وہ مرد لوگ میں باچا بیگم! علم دوست لوگ ہیں۔"

باچا بیگم کو حقیقت میں پہلی مرتبہ اپنے وفا شعار، سخی دل اور صاف باطن شوہر پر پیار آیا جس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوڑھا ہو رہا ہے اور اس کی باتوں میں اب پہلے والی منطق اور ربط باقی نہیں رہا۔ جب وہ بہت چھوٹی تھی تو ہشت نگر کے ایک مولوی صاحب کا دماغ بھی اسی طرح چل گیا تھا اور وہ بھی جلال خان جیسی باتیں کرنے لگے تھے۔

مدت کان کی لال سوز کی ڈرائنگ روم کے عین سامنے آ کر رکی اور اس میں سے سات سیاہ دنیاہ کو دیکھ کر چھلانگیں مار کر باہر آ گئیں۔ مدت خان انہیں دیکھ کر باغ باغ ہو رہا تھا اور بڑی بے چینی سے سوز کی کی چابیوں کا چھلا اپنی انگلی میں گھما رہا تھا۔

بابا جلال خان نے کھلے دروازے میں سے اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھا جس کے پاس سوائے محبت، شفقت، جواں مردی، مسکراہٹ اور غریب پروری کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے بغیر آواز نکالے اپنے جبرے بھینچ کر دل ہی دل میں کہا "اوئے بد بختا! تیرے پاس کلاشکوف ہے۔ کیا تو بھی گورے کی طرح کوئی مسودہ مخطوطہ اٹھا کر نہیں لاسکتا؟ لیکن تو علم سے محبت نہیں کرتا ناں بے غیرتا، اس لیے بد نصیب ہے۔" جب اس نے دل ہی دل میں اپنے بیٹے کو بے غیرت کہا تو بابا جلال خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انے انہیں چھپانے کی غرض سے منہ اوپر اٹھا کر اونچی آواز میں کہا: "ڈرائنگ روم میں سفیدی ہونی چاہیے باچا بیگم! سارا چھت سے پٹری اتر گیا ہے۔"

بندر لوگ

شملہ کے ساتھ میری بڑی گہری یادیں وابستہ ہیں۔ میں نے اس کو خالہ کی زبانی اپنے کانوں سے سنا تھا اور اپنی خالہ زاد بہنوں کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ چونکہ میں شخصیتوں سے فوراً مرعوب ہو جاتا ہوں اس لیے مجھے لوگوں کی زبانی اچھے اچھے شہروں کے سننے کا بڑا شوق ہے..... اچھے اچھے شہروں کے اچھے اچھے باسیوں کو دوسروں کی آنکھ سے دیکھنے کا بڑا چاؤ ہے۔

جب میں نے پہلی مرتبہ شملہ دیکھا تو میں جوان ہو رہا تھا بلکہ مجھے پہلے دن شملہ جا کر ہی پتہ چلا کہ میں جوان ہو گیا ہو۔ یہ نویں جماعت کی گرمیوں کی چھٹیوں کا ذخیرہ ہے!

شملہ میں کھٹل بھی تھے اور ٹین کی چھتوں والے مکان بھی، رکشا بھی اور کمروں کے اندر گھس آنے والے بادل بھی لیکن وہاں کی جو مخلوق میرے ہوش اڑا کر لے گئی، اس کا ذکر میں پھر کیچھ کروں گا۔ اس وقت فقط اتنا جان لیجئے کہ میرے بڑے بھائی جو اس زمانے میں بی اے میں پڑھتے تھے، میرے ساتھ گئے تھے اور خالہ کے گھر میں ایک الگ کمرے میں رہا کرتے تھے۔ وہ ہمارے خاندان کے سب سے لائق اور حسین نوجوان تھے اور انہوں نے اپنی محنت کے بل بوتے پر کبھی کسی کو اپنی کلاس میں فرسٹ نہیں آنے دیا تھا۔ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنے ذہین نہیں تھے کیونکہ وہ ایک دن میں دو دو غزلیں لکھ لیا کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے ان کی کتابت کر کے دوستوں کو بھیجا کرتے تھے۔ ہمارا سارا خاندان ان پر فخر کرتا تھا اور اپنے خاندان میں بھی شامل تھا۔

ایک شام یہی کوئی چار پانچ بجے کا وقت ہو گا کہ بھائی جان کے کمرے میں زور کا پٹاخہ چلا اور ایک دلدوز چیخ کی آواز سنائی دی۔ میری خالہ اور ان کی صاحب زادہ مال روڈ کی سیر کو گئی ہوئی تھیں اور گھر پر سوائے میرے اور میرے بھائی جان کے اور کوئی نہیں تھا۔ پٹاخہ اس زور سے چلا تھا اور چیخ ایسی بلبلا کر نکلتی تھی کہ مجھے ان کے کمرے میں جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ سامنے شکیلہ اور شوکی کے گھر میں دو کالے کالے بادل گھسنے کی کوشش کر رہے تھے اور انہوں نے دروازے بھیڑ رکھے تھے۔ بارش ہو رہی تھی، بجلی چمک رہی تھی۔ کسی گھر کے سامنے گھپ اندھیرا تھا، کوئی کوئی گھر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے حوصلہ کر کے چار پائی سے پہلے ایک پھر دوسرا قدم اتارا اور سیلے فرش پر ایستادہ ہو گیا۔ پھر میں نے خوف دور کرنے کے لئے انگڑائی لی اور بھائی جان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ بھائی جان اپنی کرسی سے گر کر فرش پر پڑے تھے۔ ان کا چہرہ سرخ اور سوجا ہوا تھا، گردن میں تشنچ کی کیفیت تھی اور دونوں ٹانگیں ایک دوسری کے ساتھ اڑنگا ڈالے ہوئے تھیں۔

ایک موٹا سالد ہا باندر کھڑکی میں بیٹھا بے ہوش بھائی جان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرافت اور ہمدردی کے آثار تھے لیکن چونکہ وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا اس لئے کھڑکی میں آرام سے بیٹھا تھا۔ بارش کی پھوار سے اس کے سینے بال نمناک تھے۔ وہ اپنا ایک ہاتھ کھلی ران پر اور دوسرا کھڑے زانو پر ٹکائے کھڑکی میں بالکل ننگا بیٹھا تھا۔ جب میں بھائی جان کو فرش پر سے اٹھانے کے لئے جھکا تو وہ کھڑکی سے چھلانگ لگا کر چھجے پر اور چھجے پر سے اوپر مٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایسا بڑا لدھا باندر میں نے شملے میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جاکھوں کی پہاڑ پر بندروں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور یہاں لوگ دور دراز سے آکر بندروں کو کھیلیں ڈالتے تھے اور دور کھڑے ہو کر ان کا نظارہ کرتے تھے۔ ان بندروں کا لیڈر ایک بہت بھورے بھالو جیا، بوڑھا باندر تھا جس کے رخسارے ضعیفی کی وجہ سے ڈھل گئے تھے اور جس کی پوستیں چھدری ہو کر نیچے سے اس کا بدن دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے پیٹ کا استر بستر ایک جھلی میں بند تھا اور اس کی ناف کے گرد ایک بڑا سا گر مڑا تھا۔ ہندو مرد اور عورتیں اس بندر کے سامنے ہاتھ باندھ کر دور سے پرنام کرتے تھے اور وائسرائے کے دفتر کے مسلمان منشی کلرک اور افسر کو لھوں پر ہاتھ رکھ کر دور سے اس کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ جاکھو پہاڑی پر موجود سب لوگوں کو یہی امپریشن دیا کرتے کہ ہم ان بندروں سے ڈرتے نہیں اس لیے ہم نے کو لھوں پر ہاتھ دھرے ہوئے ہیں۔ لیکن اندر سے وہ بھی ڈر رہے ہوتے کیونکہ انہوں نے کو لھوں پر ہاتھ دھرے ہوتے۔

میں نے بڑی مشکل سے بے ہوش بھائی جان کو گھسیٹ گھساٹ کر چار پائی پر ڈالا۔ ان کی تاگوں اور پیٹ کے گرد کمبل لپیٹا اور دوسرے کمرے سے چائے کی تھر موس اٹھانے چلا گیا۔ دوسرے کمرے میں ایک چھدرے بادل کا دھواں بھرا تھا۔ میز پر تھر موس، اس کے قریب جاز کا ٹائم پیس اور ان دونوں کے پیچھے خالہ کی کارمینتھ مکسچری کی بڑی بوتل پڑی تھی۔ یہ سب چیزیں ایک لمحہ کے لیے مجھے ضرور آئیں لیکن دھندلی سی دکھائی دیں۔ بجلی کا ایک چھ سات انچ کوکوندا این زیڈ کی شکل بناتا کھلی کھڑکی سے بڑھک مار کر اندر تڑپا اور میں بے ہوش ہو کر فرش پر گر گیا۔ تیسرے دن ہماری خالہ نے ہم دونوں بھائیوں کو واپس گھر پہنچا دیا اور شملہ ہمارے لیے خواب بن کر رہ گیا۔

اس واقعے کو کئی برس گزر گئے۔ ہماری زندگیوں میں بڑے بڑے انقلاب آئے۔ کچھ لوگ قریب آئے، کچھ دور ہو گئے۔ دور ہونے والوں میں کچھ مرد تھے کچھ عورتیں۔ کنیوں کی شادیاں ہو گئیں، کئی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ کچھ ہمارے طبقے سے نکل کر نیچے کوڑھک گئے۔ چند ایک شہر بدل گئے۔ ایک نے نیلا تھو تھا کھا کر خود کشی کر لی۔ ایک فیروز پور چھاؤنی میں گوروں کے کلب میں مجرا کرنے لگی۔ ایک مذہب تبدیل کر کے لدھیانہ مشن میں پادر بن گیا۔ ایک مہاراجہ گائیکواڈ کے چھوٹے بھائی کی بیوی بن کر ہمیشہ کے لیے راج محل میں چلی گئی۔ لیکن ان سب انقلابوں سے بڑا انقلاب چودہ اگست 47ء کا انقلاب تھا جب ہم کو بخوشی اپنے گھروں کو چھوڑنا پڑا، بخوشی اپنی جائیدادوں کو ترک کرنا پڑا اور بخوشی اپنے عزیز واقارب کو قتل کروانا پڑا۔ ان تمام نفیسوں کے بدلے ہمیں ایک بہت بڑی مثبت مل گئی تھی اور ہم ہر روز لاہور کے ڈاک خانے میں جا کر پوچھا کرتے تھے کہ لفظ "پاکستان" کے حامل ٹکٹ کب چھپیں گے اور جارج ششم کے نوٹوں کے بدلے قائد اعظم کے نوٹ کب جاری ہوں گے۔ میرے نزدیک ابھی آدھا پاکستان بنا تھا۔ چودہ اگست رات کے بارہ بج کر ایک منٹ پر آل انڈیا ریڈیو لاہور سے اناؤنسمنٹ ہوئی تھی "پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس، لاہور"۔ لیکن باقی کا آدھا ٹکٹ اور نوٹ کے چھپنے کے بعد

وجود میں آنے والا تھا۔

ہم سب بھنگیوں کے چبوترے پر بیٹھے چھوٹے درجے کی عالمانہ باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے رخ عجائب گھر کی طرف تھے اور عجائب گھر کے اوپر سفید بادل کا ایک بڑا تودہ اپنی ہیئت تبدیل کر رہا تھا۔ میں ان دنوں افسانے لکھ کر ادیب بننا سا جا رہا تھا کہ مظفر نے چبوترے کے پاس سائیکل روک کر کہا "پاکستان کا ایک آنے کا، دو آنے کا اور چار آنے کا ٹکٹ چھپ گیا ہے۔" پھر اس نے اپنی جیب سے چرمی بوٹہ نکالا۔ اس میں سے سفید کاغذ کی تہہ کی ہوئی ایک چوکور پڑیا نکالی اور اسے کھول کر کہنے لگا "سنو آٹھ آنے، بارہ آنے اور ایک روپے کے ٹکٹ اٹھارہ تاریخ کو اشوع ہوں گے۔" پھر اس نے وہ کاغذ اسی طرح تہہ کر کے بوٹے میں بند کیا اور بوٹہ جیب میں ڈال کر نیو ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ حرام زادے سے اتنا نہ ہو سکتا کہ ڈاک خانے سے ٹکٹ خرید ہی لیتا۔ اپنی ماں کی خالی انفرمیشن لے کر زمزمے پر چڑھ دوڑا تھا۔

یہ 51ء کی سردیوں کا ذکر ہے۔ میں آزاد کشمیر جانے کے لیے مری کے پہلو سے گزرا تو سڑک پر جا بجا سفید برف کے گولے پڑے تھے جیسے تھکا ہوا ڈھگانہ سے جھاگ گراتا جاتا ہے۔ جھیر کا گلی کے پاس میں نے سڑک کے دونوں طرف اور ٹین کی چھتوں پر پہلی مرتبہ برف کو اور دوسرے مرتبہ بندروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کو دیکھا جو بڑی خاموشی کے ساتھ یا تریوں کی طرح ترائی سے نیچے اتر رہا تھا۔ یہاں لاری پندرہ بیس منٹ کے لیے رکی۔ ہم نے سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چائے پی، پیشاب کیا اور سگریٹ خریدے، ہوٹل کے باہر سے چیل اور دیودار کی خوشبو آرہی تھی اور ہوٹل کے اندر سے ٹھنڈک، پرانے مٹکے کی کائی، نئے سبز وارنش اور پتھر کے کونیلوں کی ملی جلی باس آرہی تھی۔ مجھے بخوشی یہ ٹھنڈک اچھی لگی، بخوشی یہ سفر پسند آیا اور بخوشی سارا پاکستان اچھا لگا۔ بندر لوگ ترائی پر تھوڑی دیر کے لیے رک گئے تھے اور وہ پلٹ کر ہماری لاری کو دیکھ رہے تھے۔ ان کو اس علاقے کے چیرہ، اس علاقے کے پتھر، یہاں کی طرف اور رنگ دار لاری بخوشی ناپسند تھے اور ان کے ماتھے کی تیوریاں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر باریک پلاسٹک کے گلابی پیوٹے بتا رہے تھے کہ وہ خوش نہیں ہیں اور ہم سب کو چوتے سمجھ رہے ہیں۔

قرون وسطیٰ کی تحریروں میں جہاں اس کائنات کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم موجود ہے وہاں بندروں اور بوزنوں کی ابتدا کے ضمن میں بھی بہت سی کہانیوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ جب حوا کو باغ عدن سے نکال کر زمین پر پھینک دیا گیا تو خدا اس کا حال احوال پوچھنے کے لیے اکثر اس سے ملتا رہا۔ حوا کی آل اولاد اس قدر تھی کہ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ خدا ان کے بارے میں پوچھ نہ لے۔ کیونکہ اگر خدا کو معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے نودر یافت جسمانی شعور سے متمتع ہو رہی ہے تو لا محالہ اس کی سزا تبدیل کر دی جائے گی اور اس کی کوکھ بند کر دی جائے گی۔ چنانچہ ایک روز استفسار پر اس نے سامنے کھینے والے چند ایک بچوں کو دکھا کر کہہ دیا "حضور بس یہی پان سات چھترے سے ہیں جو اس وقت آپ کے سامنے الٹ بازیاں لگا رہے ہیں۔" باقی کے بچوں کو وہ عتاب کے خوف سے چھپا گئی اور ان کا ذکر صاف بچا گئی۔ لیکن عالم الغیب سے کون سا راز پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ نہ گنوائے جانے والے بچوں پر عذاب الہی نازل ہوا اور ان کو بندروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ بندروں کو جاننے اور سمجھنے کے لیے آپ کو پہاڑوں اور وادیوں سے محبت کرنا ضروری ہے۔ کوہ ہمالیہ اور

کوہ ہندوکش کے سلسلوں کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ ہمارے شمال میں جہاں ہندوستان، پاکستان، کشمیر، روس اور افغانستان کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ کندھے جوڑے پڑی ہیں، ان کے کندھوں اور ابھاروں کو محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔

جب گھروں میں شادیاں ہوتی ہیں اور جوان لڑکیاں ایک کمرے میں اکٹھی ہو کر قالین پر اپنا ڈیرا جمالیتی ہیں تو وہ کمرہ بڑی نگاہوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ نو جوان اور نو خیز نگاہوں کا مرکز ہی نہیں، بڑی نگاہوں کا مرکز بھی۔ اس کمرے کے پہلو میں ایک کوٹھڑی ہوتی جہاں کپڑے تبدیل کئے جاتے ہیں، پرانے کپڑے ٹانگے جاتے ہیں، میک اپ کیا جاتا ہے۔ جمعدارنی کو بلا کر بار بار غسل خانہ صاف کرایا جاتا ہے۔ چھوٹے بلبوں کی جگہ بڑے بلب لگائے جاتے ہیں۔ بلب تبدیل کرنے اور بجیل کے پوائنٹ دیکھنے کے لیے مردوں کو بار بار ادھر آنا پڑتا ہے، بار بار سٹول لانے اور لے جانے پڑتے ہیں، بار بار جھٹکے کھانے پڑتے ہیں۔ ایسا ہی ہمارے شمال میں ہوتا ہے جہاں اتنی ساری سرحدوں کے کندھے ملتے ہیں اور سرحدیں ایک قالین پر لیٹی ہوتی ہیں اور ان کے کندھے بڑے صحت مند ہوتے ہیں۔ ان کے طلائی لاکٹ سینوں کے اندر سے لپک کر باہر گردنوں پر یا قالین کے حاشیوں پر لٹکے ہوتے ہیں۔ سارا کمرہ نینا رچی، کر سچیں ڈائر اور دیسی عطری خوشبو میں رچا ہوتا ہے اور اس میں کندھوں کی، سائن کی، ڈیکرون کی اور تازہ دھلے ہوئے بالوں کی باس بھی شامل ہوتی ہے اور منتظمین بار بار دروازہ بجا کر کہتے ہیں "بھئی ذرا اندر سے بالٹی لیتی ہے، باہر نائی لوگ مانگ رہے ہیں۔ بالٹی چلی بھی جاتی ہے پھر بھی لوگ بار بار بالٹی لینے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں واقعی بالٹی لانے کا کام سونپا گیا تھا لیکن راستے میں پکڑے گئے۔ چلم دھرنے لگے۔ ستلی سے بوری کا منہ باندھنے لگے۔ چھوڑوں کی گھڑی اندر رکھنے گئے۔ ٹھنڈا پانی پلانے لگے۔ اور جب انہیں اپنا اصل کام یاد آیا تو بالٹی لینے چلے گئے۔ اس میں خد بالٹی کا یا بار بار بالٹی مانگنے والوں کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ کسی کی نیت کا فتور بھی نہیں

ہوتا۔ ٹھکر بھی نہیں ہوتی۔ بس اک طلسم سا ہوتا ہے جس سے لوگ اندر کو کبھی چلے آتے ہیں۔ کہتے ہیں جس جگہ پر بہت سے ملکوں کی سرحدیں ملیں یا جس جگہ پر لیٹی ہوئی لڑکیوں کے کندھے ملیں ان کے نیچے یا سونا ہوتا ہے یا تیل کے کنوئیں..... یا آئل ہوتا ہے یا ٹرمال! ریڈیو تڑا کھیل کی چوٹی پر بیٹھ کر بڑائی لڑائی کی۔ بڑے بڑے طعنے سہنے، کوسنے، گالیاں ایک دوسرے کو دیں۔ گونجے، گرجے، خویائے۔ ہم بھی ضدی تھے دشمن بھی ضدی۔ سال سال ڈیڑھ ڈیڑھ سال بعد اعصاب جواب دینے لگتے۔ دشمن اپنے سینکوں کو شملہ، نینی تال، دھرم سالہ بھیج دیتا۔ ہم انتہی گلی، سوات اور چھانگلا گلی کی طرف نکل جاتے۔ ٹھنڈی ہوائیں، اونچے درخت، نیلا آسمان، سفید بادل، پڑھنے کے لیے صرف ایک اخبار، آرام کرنے کے لیے سارا دن، سونے کے لئے ساری رات، باتیں کرنے کے لیے خانسامے باورچی گڈورے پہاڑی کسان۔ ایسی فراغت اور ایسی آسودگی اس کے بعد پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔

بھور بن کے بندر تعداد میں کم ہیں لیکن ان کی عادتیں اور خصائل شملے کے بندروں سے ملتی جلتی بھی ہیں اور مختلف بھی ہیں۔ اس علاقے کے بندر اپنی شخصیت اور فردیت کے اعتبار سے زیادہ باوقار اور زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ ان کے جسم مضبوط اور قد درمیانے ہیں۔ دیں چھوٹی اور پٹھے گول ہیں۔ آنکھیں قدرے بڑی اور ٹھوڑیاں نوک دار ہیں۔ کان بڑے، سر چھوٹا اور ماتھا تنگ ہے۔ یہ راہ چلتے لوگوں کو تنگ نہیں کرتے۔ سڑک پر کم اترتے ہیں ہوٹلوں اور ہوٹلوں اور گولف کلب کی طرف کم آتے ہیں۔ گھروں پر پورش نہیں کرتے۔ جس سر

سبز تو دے پر میں نے ایک یکہ و تنہا کوٹھڑی کرائے پر لے رکھی تھی، اس کے عین نیچے ایک گہرے لیکن وسیع و عریض کھڈ میں بندر لوگ آباد تھے۔ میں نے انہیں اور انہوں نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی تھے اور ایک دوسرے کے لیے اجنبی بھی تھے۔ جب کبھی ان کو مجھ سے ملنے کی ضرورت محسوس ہوتی، وہ میری کھڑکی کے نیچے دو بڑی چٹانوں کے درمیان آ جاتے اور میں ان کی خدمت میں باسی ڈبل روٹی، سبز اخروٹ اور ڈاگ بسکٹوں کا پیکٹ اچھال دیتا۔ اور جب کبھی مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق ہوتا تو میں سوٹ کیس سے آرمی اوپی والی دور بین نکال کر اور کھڑکی میں آرام کرسی کھینچ کر ان کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا۔

بندر لوگ، بادشاہ لوگ ہیں۔ ان کی سب باتیں، آپ سے، ہمارے عزیز واقارب سے ملتی ہیں۔ وہ عالمی سیاست دانوں کی طرح ایک دوسرے کو ہٹھکیاں بھی دیتے ہیں اور مقامی سیاست دانوں کی طرح کی ٹانگ بھی کھینچتے ہیں۔ بیورو کریٹ بن کر ساتھی بندروں کا کام بھی نہیں ہونے دیتے اور کمزور کلوں کی طرح بڑے بندروں کی خوشامد بھی کرتے ہیں۔ زبردست پر قربان ہو ہو جاتے ہیں اور زیر دست کی کھال ادھیڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ بندر لوگ بڑے بادشاہ لوگ ہیں، بالکل ہماری طرح سے _____ فرق صرف اس قدر ہے کہ ہم ہمیشہ عمو دُا چلتے ہیں اور وہ کبھی کبھی یہ شغل اختیار کرتے ہیں۔

بھور بن کے بندر جا کھو اور شملے کے بندروں کی طرح گروہوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ شملے اور جا کھو کے بندروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور بھور بن کے بندروں کی کم۔ جس گروہ کو میں جانتا ہوں اور جس سے میری قریبادو مہینے مسلسل ملاقات رہی ہے، وہ بھور بن کے سب سے بڑی عمر کے باندرا گروہ تھا۔ اس کے گروہ میں تیس پینتیس بندر شامل تھے اور عمر اور تہ کے لحاظ سے اچھے عہدوں پر سرفراز دکھائی دیتے تھے۔ اس گروہ کی باندریاں صحت جسمانی کے اعتبار سے ان گروہوں کی بندریوں سے اچھی تھیں جن کو میں نے ڈوہنگا گلی اور چھانگا گلی کے گروہوں میں دیکھا تھا۔ میں موخر الذکر گروہوں کے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرے علاقے کے اس گروہ کی بندریاں اپنی جنسی رعنائی کو زبندروں کی جنسی آسودگی کے لیے بھی استعمال میں لاتی تھیں اور اپنی ترغیب جنسی یا سیکس اپیل سے دوسرے کام بھی نکلواتی تھیں۔ بہار پر آئی ہوئی ایک بندریاں زبندروں میں بڑی مقبول ہوتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ اٹھیکلیاں بھی کرتی تھی، جعتی بھی کرتی تھی اور ان سے اپنے بدن کی "جوسیں" بھی نکلواتی تھی۔ ان دنوں اس سوشل سٹیٹس بہت بڑھ جاتا تھا۔ وہ ہر دوسری بندریاں کو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ اس کے دو ہٹڑ مارتی، پرچینڈوں سے ان کی تھوتھنیاں نوچتی اور اگر وہ گروہ کے بڑے لدھے باندرا یعنی لیڈر کے ساتھ ہم صحبتی کرتی تو پھر جوان اور لونڈے قسم کے زبندروں کو سزا بھی دلواتی۔ کمزور اور دبو بندر بڑے اور جابر بندر کے سامنے آنے سے ہمیشہ کتراتا ہے۔ گو سارے ایک ہی گروہ میں رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آنکھ بچا کر وقت گزارتے ہیں۔ کمزوروں کو ہر گھڑی یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ زبردست آئے گا اور مجھے خواہ مخواہ دھونسے گا، ریکائے گا اور میری جان عذاب میں ڈالے گا۔ اس لیے اگر بڑے درختوں پر ہوں تو چھوٹے زمین پر رہتے ہیں اور اگر بڑے درختوں سے نیچے اتر آئیں تو چھوٹے بڑی شرافت سے کھسک کر درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔

دوسرے جانوروں میں نر اور مادہ اس وقت جھتی کھاتے ہیں جب مادہ جنسی خواہش رکھتی ہو اور جوڑے کو جبلی طور پر اپنی نسل

بڑھانے کی لگن ہو، لیکن بندروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہ تولید کے لئے بھی جستی کھاتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی یہ کام کرتے ہیں، لیکن اس میں بندر یا کامل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی ترغیب جنسی کو غیر جنسی مقاصد کے لئے بھی استعمال لاتی ہے۔ جب کوئی بندر غصے سے لال بھبھوکا، جذبات سے بے قابو مارنے کوٹنے پر اتار آتا ہے تو بندر یا بڑی آہستگی سے آگے بڑھتی ہے اور اس کے غصیل چہرے سے ذرا دور اپنا پیچھا اس کے سامنے اٹھا دیتی ہے، کہنیاں زمین پر نکا دیتی ہے اور سر ایک طرف موڑ کر زمین پر رکھ دیتی ہے۔ پھر اپنی تیزی سے جھپکتی ہوئی آنکھوں سے مسلسل بندر کی طرف دیکھے جاتی ہے اور اپنے اندام نہانی کو عین بندر کی نگاہوں کی شست میں کر دیتی ہے۔ غصیل بندر اسی طرح سنجیدگی سے اٹھ کر اس پر سواری کرتا ہے، دخول کرتا ہے اور پھر پیڑوں کے تیرہ چودہ تیز تیز ٹھونسے لگا کر انزال کے بعد اوپر سے اتر آتا ہے۔ مادہ کا اس کے سامنے لیٹنا اور اپنا پیچھا اٹھا کر اس کو پیش کرنا اس کا غصہ فرو کرنے کے لیے اور اس کی انا کی تسکین کے لیے کافی ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ صرف مادہ ہی ایسا نہیں کرتی بلکہ کمزور نیز بھی اپنی جان بچانے کو اور حملہ آور سے مخلصی پانے کو اپنا پیچھا اٹھا کر اس کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور اپنی جان بچاتے ہیں۔ کمزور مادائیں بھی شہ زور ماداؤں کے سامنے اپنا پیچھا اٹھا دیتی ہیں اور خراب صورت حال سے اپنی جان بچا لیتی ہیں۔ ان جان بچانے والے اور اپنا پیچھا پیش کرنے والے مظلوموں پر ظالم اور جارح سواری نہیں کرتے بلکہ انہیں کافی دیر اپنے سامنے اس ذلت آمیز اور شرم ناک آسن میں کھڑا رکھتے ہیں اور پھر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ بھور بن کے گروہ میں ادھیڑ عمر کا ایک بندر ایسا بھی تھا جو اپنے لیڈر لدھے باند رسے آنکھ بچا کر کمزور بندروں کو تنگ کیا کرتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی راحت دوسرے زربندروں کے سامنے ذلیل کرتا تھا اور حریفوں کو یہ ذلت اور شرم عطا کرنے کے لیے اس نے ایک انوکھا طریقہ وضع کر رکھا تھا۔ وہ اپنا قصب ایستادہ کر کے اور پوری طرح اکڑا کے کمزور بندر کے سامنے جا کھڑا ہوتا، اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے قصب سے اس کے سر اور چہرے پر ضربیں لگاتا اور اپنے پیڑ وکے ٹھونسے مارتا۔ کمزور بندر اپنا چہرہ کبھی دائیں کبھی بائیں موڑتا۔ اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرتا، اس کی دستبرد سے نکلنے کی سعی کرتا لیکن یہ غنڈا اس کو اس وقت تک نہ چھوڑتا جب تک کہ کمزور بندر کہنیاں ٹکا کر اپنا پیچھا اور نہ اٹھا دیتا۔ غنڈا علامتی طور پر اس پر چڑھتا اور پھر فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا کسی اور بندر کے سرہانے جا کھڑا ہوتا۔

وہ بڑے عجیب ایام تھے..... فراغت، تنہائی، آزادی، سردی، دھند، ہم جنسوں سے دوری، بندروں کی صحبت، دور بین کے ذریعے جنسی رعل سے قربت جبکہ حقیقت میں دوری، سبز ٹھنڈی گھاس، گاف کورس کے دور دور تک پھیلے ہوئے گرین۔۔۔۔۔ جی چاہتا تھا چھٹیاں جلد ختم ہوں، بندر لوگوں سے ناطہ ٹوٹے اور میں اپنی دنیا میں واپس جاؤں۔ تراڑ کھیل کے گنبد سے اپنی آواز کا جادو جگاؤں اور دور بین کا مشغلہ چھوڑوں۔ لیکن زندگی پر، اپنے شب و روز پر، اپنے آپ پر اور اپنے گرد و پیش پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ ویسے دوسرے سب کاموں میں انسان مختار کل ہے اور اپنی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ملنے دیتا۔۔۔۔۔ یہی کوئی چار بجے شام کا عمل ہوگا۔ میں پیٹ پر گرم چادر تکیے کی طرح رکھے سگریٹ پی رہا تھا اور چائے کا انتظار کر رہا تھا کہ ترائی میں ایک خوف ناک شورا اٹھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر تھی جو مجھ جیسی کمزور یاں رکھتے تھے اور میرے بہت قریب ہو گئے تھے۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا۔ چھانگلا گلی کا لیڈراپنے گروہ کے بندروں کو ساتھ لے کر ہمارے گروہ پر حملہ آور ہو گیا تھا اور دونوں لیڈر آمنے سامنے کے درختوں پر چڑھے بڑے خوف ناک طریقے پر خونخوار تھے۔ ان کے

ساتھ اپنی اپنی نکلڑی کے دوسرے بندر بھی شاخوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ دونوں لیڈر اور ان کے ساتھی اس خوف ناک طریق پر درختوں کو ہلا رہے تھے۔ کہ تند سے تند آندھی یا جھکڑ بھی ٹہنیوں کو اس طرح جھٹکایا لپکا نہیں سکتا۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کو شدید بھبکیاں دی جا رہی تھیں۔ ہر بندر اپنے پھیپڑوں کا پورا زور لگا کر خوشیاں ہاتھ اور چرچہ کی آوازیں نکال رہا تھا۔ بڑے بندروں کی گھرکیاں بھدی، اونچی اور کثرت تھیں اور دونوں لیڈروں کی آوازیں دہشت ناک تھیں۔ دونوں اپنی اپنی ڈال جھولے کی طرح جھلا کر ایک دوسرے کے قریب لاتے اور گالیاں دے کر چلے جاتے۔ بندروں کی لڑائی ہمیشہ ابلاغ کی ہوتی ہے۔ وہ جسمانی طور پر ایک دوسرے پر حملہ آور نہیں ہوتے۔ طعنوں، الہنوں گھرکیوں اور آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے ایک دوسرے کو خوف زدہ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پر جعلی عکس ڈالتے ہیں، برکاتے ہیں، دہشت پیدا کرتے ہیں۔ اس لفظی جنگ میں جس کی قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے، وہ جیت جاتا ہے اور دوسرا بھاگ جاتا ہے۔

میرے خدا نے میری عزت رکھ لی۔ شام کے سواچھ بجے ہمارے گروہ کے لیڈر نے تین زبردست ہلارے شاخ پر لے کر تین مہیب آوازیں نکالیں تو حملہ آور گروہ کے چھکے چھوٹ گئے۔ ان کا لیڈر ایک ہی جست میں درخت سے نیچے کودا اور اپنے چیلے چانٹوں کو شٹم پشٹم لے کر بھاگا۔ میں نے خوشی کا ایک نعرہ مارا اور میرے اس نعرے میں لدھے باندہ کی مہیب آواز گم ہو گئی۔

اب ابراہیم چائے لے آیا تھا اور اندر کی خنکی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور ابلاغ کی جنگ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں بھی اسی جنگ کا ایک صوبیدار میجر تھا اور میرا گلہ بارود ہر وقت میرے پاس میرے ذہن میں اور میری آواز میں محفوظ رہتا تھا۔ بندر کی گروہی زندگی کے تضادات بہت کچھ میری گروہی زندگی سے ملتے تھے۔ بندر لوگ اپنے لیڈر سے بڑا خوف کھاتے ہیں اور اس کی جارحانہ قوت سے دب کر رہتے ہیں۔ جب کبھی خطرہ رونما ہوتا ہے، وہ سب بھاگ کر اپنے لیڈر کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس سے مدد اور ہدایت کے طالب ہوتے ہیں اور خطرے اور حملے کی صورت میں اس کا دامن نہیں چھوڑتے۔ اپنے تحفظ کی اس جبلت کے پیش نظر ان کی اجتماعی زندگی میں ایک عجیب واقعہ اکثر رونما ہوتا ہے۔ جب کبھی بندروں کا کوئی نوجوان جوڑا اپنے لیڈر کی مرضی کے خلاف لیڈر سے آنکھ بچا کر اختلاط میں مصروف ہوتا ہے، ایک دوسرے کو داد عیش دیتا ہے اور عشرت کے لمحات کپکپی کی صورت میں گزارتا ہے..... اگر نہیں پکڑا جاتا تو دن پشوری کر لیتا ہے اور اگر لیڈر کے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تو نرکی شامت آ جاتی ہے۔ لیڈر اسے کھلے ہاتھوں سے زد و کوب کرتا ہے اور اس کی پوسٹین اپنے دانتوں سے ادھیڑتا ہے۔ اس اثنا میں مظلوم و مقہور بندر چیختا ہے، چلاتا ہے، بلبلاتا ہے اور اس خطرے اور جارحانہ حملے سے بچاؤ کے لئے جبلی طور پر اپنے لیڈر کے تحفظ میں آنے کے لئے اس کی طرف بھاگتا ہے۔ اس وقت لیڈر کے دورول ہوتے ہیں: جارح، ظالم، حملہ آور اور محافظ سرپرست۔ کمزور بندر اس کو صرف محافظ اور سرپرست سمجھتا ہے اور ظالم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اسی میں گھسا چلا آتا ہے اور یوں اس کی خوب پٹائی ہوتی ہے۔ اگر ایسے موقع پر کمزور اور دست نگر بھاگ جائے تو وہ لیڈر کے عتاب سے بہ آسانی بچ سکتا ہے لیکن کمزور اور زبردست بندر کی یہی نفسیات ہوتی ہے کہ وہ علاقے کے زور آور لدھے بندر (جس نے ظالم کا روپ اختیار کر رکھا ہے) خدمت میں سر جھکائے جاتا ہے، پیچھا اٹھائے جاتا ہے۔

اس واقعے کو کئی سال گزر چکے ہیں کہ میں بندروں کے ساتھ تھا اور اس یاد کو اس سے بھی زیادہ مدت بیت چکی ہے جب شملے کے نمناک کمرے میں زور کا پٹا نہ چلا تھا اور میرا بڑا بھائی بے ہوش ہو کر فرش پر گر گیا تھا۔ ان کے کمرے سے ایک بڑا سالدھا باند رکھڑکی سے چھلانگ مار کر چھجے پر سے مٹی کی طرف روانہ ہو گیا تھا، لیکن اب یہ ساری باتیں اور سارے واقعات مجھے کل کا قصہ معلوم ہوتے ہیں۔ میرا چھوٹا بیٹا بیمار ہے اور کمرے کے درمیان قالین پر سویا ہوا ہے۔ وہ چھوٹا بھی ہے، کمزور بھی اور بیمار بھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے بہت چھوٹا ہو گیا ہے اور اس کی ناک پہلے سے پتلی ہو گئی ہے۔ جس قالین پر آج سے چند ماہ پہلے بہت سی نوجوان لڑکیاں کندھے جوڑ کر سوئی ہوئی تھیں، وہاں اب ایک چھوٹا سا بیمار لڑکا لیٹا ہے..... ایک چھوٹی سی کمزور سی سرحد پڑی ہے۔ اس سرحد کے نیچے نہ آئل ہے نہ ٹرائل۔ یہ کمزوری، بے بسی اور ناتوانی کی علامت ہے۔ میں اسے آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ کمزور بندروں کی نفسیات کا مطالعہ بھی کیا دلچسپ مطالعہ بھی ہے۔ لیکن اس مطالعے کے لیے آپ کو پہاڑوں اور وادیوں سے محبت کرنا ضروری ہے، کوہ ہمالیہ اور کوہ ہندو کش کے سلسلوں کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ ہمارے شمال میں جہاں ہندوستان، افغانستان، روس، کشمیر اور چین کی سرحدیں ملتی ہیں، وہاں اسی علاقے کا لدھا باند رکھڑکی دار درختوں پر چڑھ کر اپنی طرح کے دوسرے بڑے بندر لیڈروں کو ڈرا رہا ہے۔ بھھکیاں دے رہا ہے، خوخیار ہا ہے۔ ابلاغ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بڑوں کے ساتھ ابلاغ کی جنگ لڑنے والے اس لدھے باند نے کمزور پاکستان پر حملہ کیا، اس کی ریڑھ کو اپنے جبرے میں دبا لیا اور ایک ہی جھٹکے سے اس کے دو ٹوٹے کر دیے۔ اب دونوں ٹوٹے اسی جارح، اسی حملہ آور، اسی محافظ اور اسی سرپرست سے امداد اور انصاف کے طالب ہیں۔

ذرا ٹھہریے۔۔۔ میرے بچے نے سوتے میں پانی مانگا ہے، میں اس کو پانی پلا لوں!

Virtual Home
for Real People

ڈھور ڈنگر کی واپسی

ذرا دیکھئے انسان کی کایا کُلپ کیسے ہوتی ہے: اس کا اصلی اور حقیقی نام تو سلیمان تھا مگر جونہی وہ نائیلہ کی محبت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنا نام سلیمان بتانا شروع کر دیا۔ وہ جو اس کے مضبوط اور کرتی بدن کے ساتھ ساتھ اس کے نام کی وجہ سے دیہاتی پن کا شائبہ تھا تو اس نے اپنی ڈگریوں اور سرٹیفکیٹوں میں سلیمان کے "یو" کو سلیمان کے "اے" کی طرح بلانا شروع کر دیا۔

پرانے دوستوں نے کہا "تم تو سلیمان تھے" تو سلیمان نے کہا "ہمارے دیہات میں چونکہ یہی نام کامن ہے اس لئے مجھے بہ امر مجبوری یہی تلفظ استعمال کرنا پڑا اور نہ میں تو سلیمان ہوں۔"

نائیلہ کا تعلق اپر مڈل کلاس سے تھا۔ جب وہ ایف اے میں تھی تو اس کا گھرانہ سمن آباد میں رہتا تھا لیکن جب اس نے آرٹس کالج میں داخلہ لیا تو وہ لوگ لوئر مال کے ایک ایسے گھر میں آ گئے جس کی وضع قطع پرانے انگریزی بنگلے کی سی تھی۔ اس بنگلے کے تین حصے تھے۔ بائیں ہاتھ کا حصہ ان کو لالٹ ہو گیا تھا اور انہوں نے گے رنگ کی ایک فوکسی بھی لے لی تھی۔

لیکن سلیمان نائیلہ سے ان کی فوکسی یا اس کے ایک تہائی بنگلے یا اس کے ستواں حسن سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے کھلے ڈلے پن، اس کے بے حجابی، اس کی جرات اور اس کی آسان گیری سے اس قدر متاثر ہو گیا تھا جس قدر اس کے بڑے اپنے اپنے زمانوں میں شہر آ کر کسی ایک گھرانے کی دہلیز پر منہ میں انگلی ڈال کے کھڑے ہو جاتے تھے۔

نائیلہ کمال کی آرٹسٹ تھی۔ اس کو واٹر، پینل اور آئل پرایک سی دسترس حاصل تھی۔ اس کے محبوب موضوع دو تھے: شل لائف اور نیو

ڈ!

پاکستان میں شل لائف کا مواد تو کہیں سے بھی حاصل کیا جاسکتا تھا اور کسی وقت بھی کیا جاسکتا تھا لیکن نیوڈسٹڈی کے لئے ماڈل دستیاب نہ تھے۔ صرف مالی بابے، چوکیدار، فقیر اور نا کام پہلوان مل جاتے تھے جنہیں لنگوٹے بندھوا کر نیوڈسٹڈیاں کی جاسکتی تھیں۔ لیکن وہ اصل نیوڈسٹڈی تھے۔ نیوڈسٹڈی کے کمزور، بے مزا اور خوش اخلاق سے قائم مقام سہارے تھے جن کو ڈرا کرنے میں کوئی لطف نہیں تھا، بس ایک نیابتی سی لذت تھی۔ لذت بھی کیا تھی، لذت کی جانشین سی کوئی چیز تھی جس نے نائیلہ کو رنجیدہ اور بے زار کر رکھا تھا۔

سلیمان بڑا دلیر اور جی دارنوجوان تھا۔ اس کو دلیر اور بہادر لوگ پسند تھے۔ نائیلہ کو وہ اس کی فن کاری، خوش نمائی یا دلبری کی وجہ سے

پسند کرتا تھا بلکہ وہ اس کے بے باکی اور دلاوری کا دل دادہ تھا۔ نائیلہ لاہور کے نہایت ہی جدید اور امروزی اثرائیہ کی وہ رنگ ماسٹر تھی جس کے سامنے بحث مباحثے، ڈائلاگ اور دلیل و حجت کے خون خوار باگھ بھگیرے اپنی نمناک تھو تھنیاں بچوں پر رکھ کر آرام سے بیٹھ جاتے تھے اور اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے جب تک وہ انہیں اپنا سناٹا ٹٹخ کر اٹھ جانے یا جھومر ڈالنے کا اذن نہیں دیتی تھی۔ نائیلہ ایک لڑکی نہیں تھی، ایک قوت تھی جس نے سارے شہر کی حرکت عطا کر کے کمزور لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا اور ہر محفل ہر لحظہ اسے اپنی شمع بنانے کی آرزو مند رہتی تھی۔ اگر آپ کبھی نائیلہ سے ملے ہوتے تو اس وقت یہ افسانہ نہ پڑھ رہے ہوتے بلکہ اس کی طلب میں مختلف پرگھوم کر اس کا نشان پا چکے ہوتے اور اس کی موٹی کے سامنے مسحور بیٹھے ہوتے۔

سلیمان کے اپنے خاندان سے باہر، اپنے علاقے میں اور علاقے کے علاوہ پورے پاکستان میں اور پاکستان سے پرے مغربی ممالک میں ایسے ایسے قریبی تعلقات تھے کہ وہ جہاں چاہتا، آسانی کے ساتھ دل لگا سکتا تھا اور دل لگانے کے بعد شادی کر سکتا تھا اور شادی نہ کرنے کی صورت میں لگایا ہوا دل واپس بھی لے سکتا تھا۔ وہ ایک سیاسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے قبیلے کے لوگ مضبوط سیاسی جماعتوں میں اس طرح سے پھیلے ہوئے تھے کہ ہر آنے والی حکومت میں ان کا طے شدہ حصہ پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ اس کی کوئی کمی نہیں تھی! اتنی آسانیاں ہونے کے باوجود سلیمان کو نائیلہ کی جرات بد اخلاقی اس قدر پسند آگئی تھی کہ اس نے صرف اسی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنے بڑوں کو بھی اس فیصلے سے بہت حد تک آگاہ کر دیا تھا۔ اصل میں نائیلہ مذہب کے بارے میں ایسی آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتی تھی کہ کسی اور کو بھری محفل میں ایسا کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ اس کے پاس خدا کے نہ ہونے کی سترہ ایسی طاقت ور دلیلیں تو اس نے غٹھے، ساتر، مارکس وغیرہ سے مستعار لی تھیں لیکن دوس کی اپنی ذاتی تھیں۔ وہ ان کو سب سے آخر میں پیش کیا کرتی تھی اور پھر آرام سے سگریٹ سلگا کر جواب کے انتظار میں بیٹھ جاتی تھی۔

سلیمان نے اس کے ساتھ اپنے گہرے روابط انہی طاقت ور دلیلیوں کے زور پر قائم کئے تھے۔ وہ ہر دوسرے چوتھے روز کسی ایک دلیل یا چند دلیلیوں کے مدلل جواب لے کر اس کے پاس آتا اور منہ کی کھا کر اپنی تھوٹی نائیلہ کے بچوں پر رکھ کر بیٹھ جاتا۔ ان دونوں کو اور ان کے ملنے والوں کو ان علمی مباحث میں بڑا لطف آتا تھا اور وہ مباحث کی ایسی ایک منی نشست میں اس قدر سیکھ جاتے تھے کہ کوئی انٹرنیشنل سیمینار انہیں اتنا کچھ عطا نہیں کر سکتا تھا۔

نائیلہ کی ڈرائنگ کا سائل گوکیں سے ملتا تھا۔ بھاری لائن، موٹا زمینہ بوجھل حاشیہ، فرہ کردار، بھاری کندھے، بھاری کولہے، موٹی رانیں، بھر کم پنڈلیاں، کالے سیاہ بال، موٹے نقوش، ڈھپو عورتیں، مجرب بچے، جسم بڑھائیں، کپے برتن اور ہٹی کٹی سائل لائف۔ ان سب میں طاقت کا اظہار، من مانی کا دعویٰ اور انکار کا اعلان کہ اگر میں نہ ہوں تو یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے اور اگر میں نہ چاہوں تو ان کا وجود عدم ہے۔ یہ میرا اختیار چیلنج نہیں کیا جاسکتا کہ میں انسان ہوں۔ اور انسان عظیم ہے خدایا۔ اور میں لافنا ہوں کہ میرا فن امر ہے۔ اور فن زندگی ہے، فن حیات ہے، فن شکستی ہے۔ اور اس ساری کائنات کا مدافن ہے۔ ساری تخلیق فن کی لیلا ہے! اور فن آرٹسٹ کے ہاتھ کا مرہون منت ہے، انسان کے ہاتھ کا دست نگر ہے۔ اور انسان بہت بڑا ہے..... اس پوری کائنات سے بڑا اور اس ہر لمحہ پھیلتی ہوئی

کائنات سے اور بھی بڑا۔

نائیلہ اس قدر پاک صاف، دھلی دھلائی، پاک بدن اور پاک نفس لڑکی تھی کہ نہ اس کو کسی سے محبت تھی اور نہ وہ کسی اور کی محبت تھی۔ وہ نارمیلی کے نقطہ عروج پر زندگی بسر کر رہی تھی جہاں وجود محبت و نفرت، مدح و ذم اور توجہ و بے توجہی سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ محبت کرنے والے اور کروانے والے عام طور پر کمزور، نحیف، ماڑے اور بودے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی ایسی کمی اور کمی ہوتی ہے جسے وہ کسی دوسرے کی ذات سے پورا کر کے ہی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جو بادام صحت مند اور مضبوط ہوتا ہے، اس کی ایک ہی بھری بھری گری اندر اپنی نشوونما میں مصروف ہوتی ہے۔ جو گریاں ٹیڑھی، کمزور اور خمیدہ ہوتی ہیں وہ ہمیشہ ایک دوسری کی کمی میں سرچھپائے جڑوں صورت میں زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نائیلہ کا ایمان تھا کہ جو جنین کمزور، بودا اور ڈرپوک ہوتا ہے وہ اپنے حصے کا خون، اپنے حصے کی جگہ اور اپنی صفوں کو ترازو کے تول آفر کر کے اپنے ساتھ ایک اور جنین تیار کر لیتا ہے تاکہ اس کا دل لگا رہے اور اندھیرے میں اسے خوف نہ آئے۔ پیدائش کے بعد بھی یہ دونوں توام بچے ایک دوسرے کا سہارا بن کر زندگی گزارتے ہیں اور ان کے وجود کے کیسٹ پر زندگی کا بس ایک ہی فیتہ ہوتا ہے۔ چاہے فارورڈ چلے چاہے ری وائنڈ ہو لیکن ہوتا ایک ہی ہے۔ ایک ہی پگڑی ہوتی ہے جسے دونوں نے بیک وقت پوچ سنوار کے باندھا ہوتا ہے۔

وہ اس قدر انڈی پیڈنٹ، بے نیاز، پاک باز اور مبرا قسم کی لڑکی تھی کہ اس نے کوئی تعصبات نہیں پالے تھے۔ وہ رندوں کے ساتھ بھی خوش تھی اور قلندروں کے ساتھ بھی مسرور و دلشاد۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک خود برپا انداز رکھنے والی لڑکی تھی جو ایکسلیئر یٹر پر اپنا ننگا پاؤں رکھ کر فو کسی جیسی کار سے بھی جتنیں لگوا سکتی تھی۔ اگر آپ یہ سمجھنے لگے ہوں کہ نائیلہ ایک متکبر، گھمنڈی اور مغرور لڑکی تھی اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی تو آپ غلطی پر ہیں۔ نائیلہ خود پسند نہیں تھی، خود مختار اور اپنے آپ سے آشنا تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کر سکتی تھی۔ دونوں ہاتھ سے سیکچ بنا لیتی تھی۔ دونوں پاؤں پر بیٹھ کر سادھی لگا لیتی تھی۔ دونوں قوتوں سے طاقت حاصل کر لیتی تھی۔ اپوزیشن اور حکومتی حلقوں میں ایک ساتھ جلوہ نما تھی۔ اے سی، ڈی سی دونوں کرنٹ اس کے اپنے تھے لیکن وہ یزداں کے مقابلے میں اہرمن کو زیادہ نمبر دیتی تھی۔ جلال دین کے مقابلے میں گنگارام کو زیادہ آسانی سے سیکچ کر لیتی تھی۔ اپنے گھر والوں کے مقابلے میں اپنے گھر آنے کے مخالفوں کو اچھا سمجھتی تھی۔ ہرگز متعصب نہیں تھی، آزاد خیال تھی اور اپنی آزاد خیالی کے اظہار کے لئے اسے بہ امر مجبوری اپنے اور اپنے پن کے خلاف جھکنا پڑتا تھا۔ زیادہ نہیں جھکتی تھی اور بار بار نہیں جھکتی تھی، بس جھکی ہی رہتی تھی۔ اس کے اباجی اپنی بیٹی کے لبرل آئیڈیاز کو بہت ہی پسند کرتے تھے۔ اب آپ بیچ کی گفت و شنید کو چھوڑیں اور ان لمبی میٹنگوں میں جانے سے احتراز کریں جو نائیلہ اور سلیمان کے درمیان پورے سوا سال تک چلتی رہیں۔ آخر ایک روز بدھ کے دن انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا اور جمعرات کو ان کی شادی ہو گئی۔

سلیمان کے اپنے گاؤں میں اور گاؤں سے ملحقہ دوسرے گاؤں میں اور برادری اور ساکاداری کے تیسرے گاؤں میں کوئی مہینہ بھر ان کا ولیمہ چلتا رہا اور نائیلہ ان سب کے ویڈیو خود تیار کرتی رہی۔ جن سرداروں کو کچھ ولیموں میں نہیں بھی شریک ہونا تھا کہ ان کی آپس میں پرانی اڑپس تھی، وہ بھی ہر ولیمے میں شریک ہوئے۔ نوجوان قبیلہ سردار سلیمان کی وجہ سے نہیں، نئی سرداری کی وجہ سے جس کے کپڑے بھی

عجیب ہوتے تھے اور جن کی فٹنگ بھی ٹھیک ٹھیک جگہوں پر ٹھیک ہوتی تھی بلکہ بہت ہی تھیک ہوتی تھی!

گاؤں کی عورتیں کیا بڑی بوڑھیاں، کیا جوان لڑکیاں اور کیا نوخیز چھوکریاں سبھی نائیلہ کی عاشق ہو گئی تھیں۔ جن باتوں کا اظہار مردوں کے منہ پر کرنے سے وہ ڈرتی تھیں اور جن باتوں کے ایک مرتبہ کر دینے کی حسرت لے کر ان کی مائیں، ماسیاں اور دادی نانیاں قبروں میں چلی گئی تھیں، وہ باتیں نائیلہ پھٹاک دے کے بڑے بزرگوں کے منہ پر دے مارتی تھی اور ارد گرد دور دور تک پھیلی عورتوں کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی تھی۔ ان کے ہر دے دیر تک تالیاں بجاتے رہتے تھے اور ان کی کوکھیں ہر ہر جنبش کے ساتھ نعرے مارتی چلتی جاتی تھیں۔

نائیلہ نے اپنے علاقے کی بہت سی عورتوں کو چڑھاوے چڑھانے، درگاہوں پر جانے، پیروں کے پیردا بنے اور خاوندوں کی ہر بات ماننے سے توڑ لیا تھا۔ ان ساری باتوں میں سب اچھی بات یہ تھی کہ جب خاوند پیار سے بلائے تو اس کے قریب نہیں جانا، اس کی نیت بد ہوتی ہے! عورتوں نے اس مسئلے پر اپنے تجربے کی اتنی بڑی بڑی گھڑیاں کھولی تھیں کہ حویلی کے بڑے صحن میں دور دور تک یہی چرچے چیتھڑوں کی طرح پھیل گئے تھے۔

ایک مرتبہ جب سلیمان نے نائیلہ کو کوئی **Obscene** لطیفہ سنانے کے لئے دارو، حکمی، نینی، صغریٰ اور شاد کو اتھا دیا تو نائیلہ نے سخت اعتراض کیا اور لطیفہ سننے سے انکار کر دیا۔ جب سلیمان نے اپنے کلچرل پیٹرن کی وجہ سے مجبوری کا اظہار کیا تو نائیلہ نے اسے اور اس کے کلچرل پیٹرن کو مادر..... والی گالی دے کر خاموش کر دیا۔ پھر جب تک صغریٰ، شادو، نینی اور دارو کے سامنے اس لطیفے کو بلا کم و کاست سنوا نہیں دیا، نائیلہ نے اپنا احتجاج جاری رکھا۔ دراصل وہ گاؤں کی عورتوں کے ذہن سے وہ جالے دور کرنا چاہتی تھی جو فیوڈل نظام اور ملا کے کلام نے متفقہ سازش کے ذریعے ان کے ذہنوں میں تانے تھے۔ وہ شفاف ذہن، شفاف الیکشن اور شفاف سودے کی قائل تھی۔ وہ ایسی غلط ملط غلطیان قسم کی زندگی کے بے حد خلاف تھی جس میں انسان ساری زندگی ٹوٹا ٹپتا ہی رہے اور تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔

بل کھاتے چناب سے تھوڑے دور اس گاؤں میں نائیلہ کا ایسا دل لگا تھا کہ وہ اپنے میکے کو بھولتی سی جا رہی تھی۔ شہر میں تو اس کے اباجی نے اپنی ناطقتی اور کم دولتی کی وجہ سے اپنی گری ہوئی ساکھ کو ماڈرنزم کے کیسی غباروں سے اٹھایا ہوا تھا اور اپنی لڑکیوں کو **Permissive** بنا کر امیر حلقوں میں داخلہ لے رکھا تھا لیکن یہاں تو سچ مچ کی دولت تھی۔ حویلی کے اندر اور باہر جگہ جگہ فراوانی کے ڈھیر تھے۔ دیواروں سے پرانے تمول کے کھڑ پٹیرا تر رہے تھے اور حویلی کی امارت نے سارے گاؤں کو چندھیا کر رکھ دیا تھا۔ لوگ آنکھوں کے آگے ہاتھ کر کے اور دیواریں پکڑ پکڑ کر چلتے تھے۔ نئی گاڑیوں کا باڑہ حویلی کے عین سامنے تھا اور پرانی موٹروں کا قبرستان نہر پار نیائیوں میں تھا۔ جس مکان میں شکاری کتے رہتے تھے، اسی کے بالا خانے میں بازو، شکروں اور ترمیوں کے پنجرے تھے۔

نائیلہ صرف ایک لفظ کی ادائی سے اس ساری دولت، ساری عزت، ساری نیک نامی میں برابر کی شریک ہو گئی تھی۔ لفظ کے کھل سم سم مین بھی کیا جادو ہے! صحیح بولا جائے اور بروقت بولا جائے اور سوچ سمجھ کر بولا جائے تو اس میں فائدے ہی فائدے ہیں، بھاگ ہی

بھاگ ہں، لو بھ ہی لو بھ ہے۔ نائیله ہیومن رائٹس کی لیڈر ہونے کے باوجود ہمیشہ فائدے کا سودا کرتی تھی..... جان بوجھ کر نہیں، بے ارادہ و بے اختیار۔ تدبیر و تفکر سے نہیں، بھول پنے اور الہڑ پن میں۔

لیکن _____ ایک شام!

ایک شام جب نائیله حویلی کے مدھرے پردوں والی چھت پر اپنا ایزل لگا کر ہو کو مصلن کا نیوڈ سکیچ کر رہی تھی تو چار کول اس کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ ہا کو کے کندھے، اس کا گلا، گلے سے نیچے کا گات، مضبوط کمر، گہری ریڑھ، چلو بھر پیٹ اور سیدھی سطر ٹانگیں _____ نائیله شرم سے ڈوب مری کہ مجھے بھی اپنی Figure پر بڑا ناز تھا لیکن اصل Figure تو کسی انجانے مقام سے آتی ہے، ڈائننگ کر کے نہیں ملتی۔ اس کا سر چشمہ کہیں اور ہی ہے۔

وہ چوکی پر بیٹھی ہوئی ہا کو کے کالے سیاہ بدن اور کھلے ہوئے گھنیرے بالوں کو دیکھتی دیکھتی ٹرانس میں چلی گئی۔ اس کا سکیچ اچھا بنا تھا لیکن ہا کو کے بدن جیسا نہیں۔ اس کی آؤٹ لائن بڑی زوردار تھی لیکن ہا کو کی جلد جیسی نہیں تھی۔ اس کے چہرے کے سارے خدو خال ہو کو کے تھے اور مشابہت سو فیصد تھی لیکن وہ ہا کو نہیں تھی۔ چوکی پر بیٹھی ہوئی ہو کو اور ایزل پر لٹکی ہوئی ہا کو میں وہی فرق تھا جو لاسٹ سپر پر بیٹھے ہوئے آدمی اور صلیب پر لٹکے ہوئے انسان میں ہوتا ہے۔

ہا کو نے گردن گھما کر پہلے بی بی کو اور پھر اتنے بڑے چوکھٹے میں اپنے آپ کو دیکھا تو اپنے مقابلے میں اس کو بی بی چھوٹی چھوٹی سی لگی۔ اس نے ترس بھرے انداز میں کہا "شہدی اتنی امیر ہو کر بھی ہولی ہولی سی ہے اور اتنے کپڑے پہن کر بھی نگلی بچی لگتی ہے۔ پتہ نہیں اس کے ماپے کماپے کون ہیں اور اس کا تھوہ ٹھکانہ کدھر ہے۔" پھر اس نے نائیله کی طرف دیکھ کر کہا "کپڑے پہن لوں بی بی جی؟"

نائیلہ نے اثبات میں سر ہلایا تو پہلے ہا کو نے اپنی کالی سیاہ دھوتی باندھی اور پھر کالی ملل کا کرتہ پہن کر بٹن بند کرنے لگی۔

سارے میں ڈوبتے ہوئے سورج کی خوشبو پھیلنے لگی تھی اور پردوں کی اپنی گھروں کو واپسی شروع ہو گئی تھی۔ ڈھلتے سورج کی رو

پہلی کرنوں میں ہر پرندہ اپنی اپنی کرن کے ساتھ روشن ہوتا تھا۔ اپنی اڑان میں، اپنی بڑھت میں، پھر اتران میں اور آخر میں تیز پرواز کو کھڑے پروں سے روکتے ہوئے ہر پرندہ اپنی اپنی کرن میں، اپنی اپنی سپاٹ لائٹ میں وی وی آئی کی طرح لینڈ کر رہا تھا۔ نائیله نے سر کے اشارے سے ہا کو کو چلے جانے کے لئے کہا اور وہ اپنے چھتر گھسیٹتی ہوئی کوٹھے سے نیچے اتر گئی۔

نائیلہ نے اس سے پہلے نہ ایسے رنگ کا آسمان دیکھا تھا نہ کبھی ڈوبتے سورج کا نظارہ کیا تھا۔ شہروں میں چڑھتے اترتے سورج کو کوئی نہیں دیکھتا، نصف النہار والے سورج سے سبھی واقف ہوتے ہیں۔ لیکن ٹاپ لائٹ والا سورج کس کام کا! نہ شیڈ نہ سلہوٹ، نہ کیارونہ سکورو!

نائیلہ اپنی دونوں بیچیاں پردے کی دیوار پر ڈال کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنی ٹھوڑی ہاتھوں کے روے پر جمالی۔ ٹاھلیوں، شہتوتوں اور دھریکوں کے پیچھے ایک کھلا میدان تھا اور میدان کے پیچھے دور تک پھیلا ہوا ایک سیلا سیلا کنارہ۔ اس کے پیچھے سورج کا ایک تھال اور تھال سے گرے اور براؤن روشنی کا خراج۔ نائیله نے دو چار بار آنکھیں جھپکیں، سر کو ایک جھٹکا دیا لیکن وہ رنگ اپنی جگہ اسی طرح

قائم رہے۔ ہم کو تو ڈوبتا ہوا سورج سرخ نارنجی اور پیلا پیلا نظر آتا ہے اور ہم سونے کے اس تھال کو ہمیشہ اسی رنگ میں دیکھتے ہیں، ہم نائیلہ تو نہیں ناں۔ نہ ہم نے کبھی پیٹ کیا، نہ سچ کیا، نہ کلرنگ کی۔ ہم کو کیا پتہ رنگ کے خاندانوں میں کیسی کسی رشتہ داریاں اور کس کس قسم کی دشمنائیاں ہوتی ہن۔ کون کون چوری چھپے ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں اور کس کس قسم کی دشمنائیاں ہوتی ہیں۔ کون کون چوری چھپے ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں اور کس کس نے ایک دوسرے کے خلاف خفیہ عرضیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ ہم کو تو ہر شیڈ بس ایک بنیادی رنگ ہی نظر آتا ہے۔ ہم سب بنیاد پرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے ملکوں کے جھنڈے بنیادی رنگوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کسی میں کوئی شیڈ، سایہ، رنگ یا پھیکا لون نہیں ہوتا۔

پھر نائیلہ کے دیکھتے دیکھتے سورج کی اس گرے اور براؤں روشنی کے سامنے باریک گرد کا ایک پردہ اٹھا اور دیکھتے دیکھتے فرش سے عرش تک سپیٹاٹون کا ایک شامیانہ ساتن گیا۔ یہ رنگ سورج کی گرے اور براؤں روشنی سے باہر نکل کر اپنے پاؤں پر کھڑا تھا اور اس کی گہرائی اور گیرائی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا نائیلہ نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا لیکن دریائے نیل کے منبع کی طرح اس رنگ کا کوئی سرچشمہ اسے نظر نہ آیا۔ پھر اس نے اپنی ٹھوڑی ہاتھوں کے ردے سے اٹھالی اور پردے کے ساتھ تن کر کھڑی ہو گئی۔ سپیٹاٹون کے اس مہین پردے کے پیچھے کروم اور اوکر کلر کے ملے جلے ذرات استر بن کر کھڑے ہو گئے تھے اور اس ویستاڈن پر موشیوں کے ہیولے ابھرنے لگے تھے۔ بڑے بڑے بدنوں والی بھینسیں، اونچے اونچے سینگوں والے ناگوری بیل، دھنی کے چتکبرے داند اور بھیڑوں اور بکریوں کے الگ الگ بیوڑ، ان کے پیچھے پانچ اونٹ اور ساتھ جواں سال گائیوں کا ایک بے نیاز گلہ۔

لیکن یہ تو غبار کے پردے پر ان موشیوں کے تصویر ہے، موشی کہاں ہیں؟ وہ جانور کدھر ہیں جن کا یہ امیج ہے؟ اصل کہاں ہے جس کی یہ نقل ہے؟ پھر تھوڑی دیر بعد نائیلہ نے گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی آواز اور بھیڑوں کے میانے کی صدائیں سنیں۔ سورج اور نیچے ہو گیا تھا اور غبار کا سپیٹا پردہ الٹرا میرائن رنگ کی جھلک دینے لگا تھا۔ "اف میرے خدا، یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے!" نائیلہ نے پردے پر مکامارتے ہوئے کہا "یہ تو کمپلی منٹی کلر ہیں ہی نہیں، پھر یہ ایک دوسرے کے قریب کس طرح آسکتے ہیں؟" کسی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اچانک اس نے دیکھا کہ بھیڑوں کے تین ریوڑ پیش منظر پر ابھر آئے ہیں اور ان تینوں ٹکٹیوں کے درمیان سات ساتھ آٹھ آٹھ فٹ کا فاصلہ ہے۔ لیکن غبار کی سکرین پری تینوں ریوڑ ایک دوسرے میں مدغم چلے آتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ بھیڑیں اپنی چھ انچیا رفتار کے ساتھ بڑی مستعدی سے آگے بڑھ رہی تھیں اور سکرین پر نارنجی رنگ کا ایک بہت بڑا فلیش شرقا غبار پھیل گیا تھا۔ ان کے پیچھے دھیل کالی بھینسیں تھیں جن میں سے بیشتر کے سینگ نیچے کی طرف ڈھکے ہوئے تھے۔ جو جوان تھیں، ان کے سینگ کنڈل دار تھے اور ان میں دریا کنارے کی چکنی مٹی اور گھاس کے سبز تنکے پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دائیں پہلو پر ایک کالا سیاہ چمک دار ارنابھینسا چلا آ رہا تھا جس کا پٹھا کولڈ سٹارٹ ڈیزل انجن کے وجود کی طرح تیل سے سنا ہوا اور اسی طرح کا مضبوط تھا! ان کے پیچھے بیاہی ہوئی گایوں اور کنواری بچھیاؤں کا غول تھا جو سیلو اور کرنگ میں نہایا ہوا تھا اور اب "پرپل کلر" سے گزر کر سبزی مائل سا ہو گیا تھا۔ ان کے

پیچھے بکریاں تھیں..... براؤن، سفید، کالی، چتکبری، سینگوں والی، گھونی، گابھن، سوکھی اور تھنوں کے بوجھ سے بمشکل چلنے والی۔ ایسی بھی جس کے کان بہت لمبے تھے اور ایسی بھی جن کے گلے کے نیچے دونکلیاں سے لٹکی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ اونٹوں کے قدم لمبے تھے مگر چال دھیمی تھی۔ ان کے گلوں سے بندھے ہوئے لوہے کے ڈھیلے ڈھیلے گجر اندر لٹکی ہوئی لکڑی کی گلیوں سے بچ رہے تھے اور ان کی مہاریں ان کی گردنوں کے گرد گلوبندوں کی طرح لپٹ ہوئی تھیں۔

پیچھے تین چرواہے تھے..... دو بڑی عمر کے گڈریے اور ایک نوجوان گلہ بان۔ ڈوبتے ہوئے سورجن ان تینوں کو جو گیارنگ میں لپیٹ رکھا تھا اور ان کی دن بھر کی تھکاوٹ اور کھچل نے ان کے سارے وجود کو پاکیزگی کے غسل سے نکھارا ہوا تھا۔ دریا کے اس پار ٹھنڈی میٹھی زمین میں دن چرنے چکنے کے بعد گاؤں کی دولت واپس گاؤں آرہی تھی۔ ڈھلا ہوا اور پگھلا ہوا سونا واپس اپنی کانوں میں پہنچ رہا تھا۔ سورج اس قیمتی سرمائے کو گاؤں کی راہ دکھا کر آخری ڈبکی مارتے ہوئے کہہ رہا تھا "اے گاؤں کے لوگو! جب شام کو تم اپنے مویشی جنگل سے لاتے ہو اور صبح چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت و شان ہے۔ میں گواہ ہوں تم عزت و شان والے ہو کہ تم کو ان کی وجہ سے عزت و شان عطا کر دی گئی ہے۔"

گاؤں کا ان پڑھ مولوی نیم پختہ مسجد کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں کے درمیان کھڑا اپنی بے رس اور خشک آواز میں مغرب کی اذان دے رہا تھا اور نائیلہ چھت پر کھڑی بھیں بھیں رو رہی تھی۔ اس نے اپنے منہ پر پورے ہاتھ کا دباؤ دے کر اپنی آواز روکنا چاہی تو اس کی گھگھی بند گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کا سارا بدن سسکیوں سے ملنے لگا اور اس کی ناک اور حلق سے ایسی آواز آنے لگی جیسے سردیوں کی رات میں غیر محفوظ بھٹ کے اندر بے ماں کا پلار رویا کرتا ہے۔

پھر اچانک نیچے گلی میں آدمیوں کا شور بلند ہوا اور لوگ تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے اور نیا بائیسکوپ دیکھنے پر اکسار ہے تھے۔ نائیلہ نے پردے اوپر سے آگے کو ہو کر دیکھا تو اماں طالعاں کی تندوری پر پانچ چھ جوان، بوڑھے اور کڑے بڑے مرد جمع تھے اور تالیاں بجا بجا کر اونچے اونچے ہنس رہے تھے۔

سندر میو کی جوان بچھیا تائی خورشید کا گلے سے بچھڑا ہوا لیلیا جنگل سے لے کر آرہی تھی اور اسے اپنے بے سینگ گھونے سر کی ڈھڈیں مار مار کر سیدھے راستے پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان دونوں کو مومیشیوں کے قافلے سے بچھڑے پہلے ہی بڑی دیر ہو گئی تھی اور یہ احمق اماں طالعاں کی تندوری تک پہنچ کے پھر گڑ بڑا گیا تھا۔ بچھیا اس کا پیچھے کا راستہ رو کے کھڑی تھی اور اسے آگے چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لوگ ہنس رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔

جوان جہان سفید براق بچھیا..... سفید ستواں دم، کالی سیاہ آنکھیں، ماتھے پر شاہی بھنور، تھو تھنی کے اوپر بڑی تتلی جتنا براؤن دھبہ، شام کا وقت، گاؤں کے مرکز سے دور، اکیلی ذات اور بے ہودہ مردوں کی ہنسی..... شرما بھی رہی تھی اور اپنی ذمہ داری کو نبھانا بھی چاہتی تھی۔ اور ظلم کی بات یہ کہ اس کی ذمہ داری ایک احمق ترین مخلوق کے روپ میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

پھر جب بھٹکے ہوئے بدھومیاں کو سامنے میرا شیوں کے پرنا لے میں پپیل کا پیڑ نظر آیا تو اسے اپنا کھویا ہوا روٹ مل گیا۔ اتنی تیزی

سے سے اپنے باڑے کی طرف بھاگا کہ اس کے پیچھے سندر کی بچھیا کا بھاگتے بھاگتے سانس پھول گیا۔

ناٹیلہ نے سوچا، کیا میں سلیمان سے جا کر یہ نہ کہوں کہ میں بھی تائی خورشید کا بھٹکا ہوا لیلیا ہوں اور مجھے بھی اپنے باڑے تک پہنچنا ہے اور مجھ سے بھی میرا راستہ گم ہو گیا ہے۔ کیا تم میرے لئے سندر کی بچھیا بن کر بغیر سینگ مارے باڑے تک پہنچا دو گے؟ لیکن اسے معلوم تھا کہ سلیمان ایسا نہیں کر سکے گا۔ وہ نیچے حویلی میں اپنی رانفلوں، بندوقوں اور پستولوں کو گریس لگا رہا تھا اور اپنا وقت بے ہودہ کاموں میں صرف کرنے کا روادار نہیں تھا۔

[illegible]

رازدان

www.HallaGulla.com

ابھی پانچ بجنے میں پورے پانچ منٹ تھے اور سٹیشن پر چار پانچ آدمی ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ یہ کوئی اتنا بڑا سٹیشن نہ تھا، لیکن جنکشن ہونے کی وجہ سے بہت بڑا دکھائی دیتا تھا۔ میل اور ایکسپریس دونوں گاڑیاں یہاں سے گزرتی تھیں، لیکن ان کا قیام بہت مختصر ہوتا تھا۔ براؤنچ لائن کا ایک سرائیہاں تھا تو دوسرا ادھر بارڈر کے پار۔ پہلے اس لائن پر بہت بھیڑ رہتی تھی لیکن جب سے آدھی کت کر دوسرے دیس میں رہ گئی تھی، سٹیشن سونا ہو گیا تھا۔ پہلے اخبار رسالوں کا شال بند ہوا، پھر چائے والے نے اپنا ڈبہ بند کیا اور شدہ شدہ چھا بڑی والے بھی سد ہار گئے۔ صبح ایک گاڑ براؤنچ لائن پر جاتی اور سورج ڈوبنے سے پہلے لوٹ آتی۔

پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اس نے عطیہ کا خط پرس میں بند کیا اور ویننگ روم سے باہر نکل آئی۔ پلیٹ فارم پر ایک قلی ٹرالی دھکیلتا ہوا جا رہا تھا اور دوسرا اسی ٹرالی کے کنارے بیٹھا اپنی پگڑی باندھ رہا تھا۔... دور نیم اور شیشم کے درختوں میں گولائی پر گھومتی ہوئی لائن کے پاس سگنل اپنا پنکھ جھکائے کھڑا تھا۔ سرکنڈوں کی اوٹ سے دھوئیں کا بادل بلند ہو رہا تھا اور گاڑی ادھر لپک رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سفید کوٹ کی جیبوں میں ڈال لئے اور سگنل کی جانب منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ سیاہ چرمی پرس اس کے سفید کوٹ کی آستین اور جیب کے درمیان سفید کلائی پر لٹک رہا تھا اور وہ پلیٹ فارم پر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار سست ہوتی جا رہی تھی اور ایک لمحے کے لئے اسے یوں لگا جیسے وہ سگنل کے پاس رکی، سفید دھوئیں کا بادل چھوڑا اور ہولے ہولے پلٹنے لگی۔ وہ پلیٹ فارم پر اپنی سیاہ اونچی ایڑی ٹک ٹک کرتی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ٹرالی پر بیٹھا ہوا قلی زور سے چلایا "بیگم صاحب گاڑی آرہی ہے، ایک طرف ہو جاؤ"..... اور اس نے ایک طرف ہونے سے پہلے دیکھا کہ گاڑی کو بریکیں لگ رہی تھیں اور مسافر اپنا سامان اٹھائے کھلے دروازوں میں کھڑے تھے۔

اونچی ایڑی کو پلیٹ فارم سے جو بھرا دیا تھا اس نے دیکھا۔ فرازا اپنی بانس کی چھڑی کا سہارا لے کر قلی سے سامان اٹھوا رہا تھا۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ گھڑی والے بابا کے ساتھ کبڑی ہو کر سٹیشن سے باہر نکل جائے، لیکن اس سے پلٹا نہ گیا۔ شاید بابا دور نکل گیا تھا!

جیبوں سے دونوں ہاتھ نکال کر اور سیاہ پرس کو درمیانی انگلی کی آخری پور پر لٹکا کر وہ جلدی سے آگے بڑھی اور فرازا کے پیچھے جا کر

ہولے سے بولی: "فرزی" اور فراز کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے اخبار کے گرد لپٹی ہوئی مٹھی اس کے سفید کوٹ سے ڈھکے ہوئے سفید کندھے پر رکھ دی اور شرارت بھرے دیدے گھما کر بولا..... لیکن انجن نے اس زور سے سٹیٹم چھوڑی کہ کسی کو کسی کی بات سمجھ میں نہ آ سکی۔

وہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شیشم کی قوی ہیکل گول میز پر سٹیشن سے باہر کے نانوائی کی چائے روغنی پیالیوں میں پڑی تھی۔ فراز دونوں ٹانگیں کرسی کے بازو پر سے گزر کر بیٹھا تھا اور اپنے بوٹوں کی نوکوی پر باری باری بانس کی چھڑی مار رہا تھا۔ اس نے سر پیچھے لٹکا کر کہا:

"آپ کو اس علاقے میں میری تعیناتی کا اور خاص طور پر آج کی آمد کا پتہ کیسے چلا؟"

رعنا نے کہا: "ہمیں تمہاری کس بات کا علم نہیں ہوتا۔ اظہار نہیں کرتے تو تم سمجھتے ہو کہ ہم بے خبر ہیں۔" پھر اس نے نظریں اٹھا کر فرازی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا اور جڑوں پر بڑھتی ہوئی شیوکا سرگیں غبار چھا رہا تھا۔

رعنا نے چائے کا پیالہ اٹھا کر اپنے خشک ہونٹوں سے لگا لیا اور پیالے کے سبز کنارے پر سے فراز کی سانولی چھب دیکھتے لگی۔ فراز اسی طرح سر گرائے اور پیر جھلاتے ہوئے بولا "آپ کی سہیلی ناراض تو نہیں ہوئی؟"

رعنا نے پیالہ ہونٹوں سے پرے ہٹا لیا اور متعجب ہو کر بولی "ایسی باتیں پوچھنے کی ہمت باقی ہے کیا؟"

"کیوں؟" فراز نے بڑے تحمل سے کہا: "اس میں ہمت کی کیا بات ہے؟"

"دل پر ہاتھ رکھ کے کہتے ہو" رعنا نے مسکرا کر پوچھا "یا اوپر رے جی سے کہہ رہے ہو؟"

فراز سنبھل کر بیٹھ گیا اور سنجیدہ صورت بنا کر بولا "آپی! ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گی....." لیکن رعنا نے بات بیچ میں ہی

کاٹ دی اور سنجیدہ ہو کر بولی "اب مجھے آپ کیوں کہتے ہو..... جب عطیہ کا رشتہ ہی بیچ میں نہ رہا تو آپ کیسے رہ گئی؟"

فراز نے کہا "ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گی رعنی کو عطیہ میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس پر بے اختیار پیارا جایا کرتا ہے۔ یہ بات

الگ ہے کہ مجھے اس سے محبت تھی۔"

"اور اب وہ محبت نہیں رہی؟" رعنا نے سوال کیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" فراز بولا۔ "جیسے بلائنگ پر پلاسٹک کی ہلکی سی تہہ چڑھادی جائے۔ بلائنگ بھی رہے اور واٹر پروف بھی ہو

جائے۔"

"اور عطیہ کے وہ سارے خط جو اس نے تمہیں لکھے تھے؟" رعنا کو بلائنگ پیپر سے خط یاد آ گئے۔

"میرے پاس محفوظ ہیں۔"

"اور اگر انہیں تمہاری بیگم دیکھ لیں.....؟"

"میں نے کہا ناں کہ محفوظ ہیں۔"

"وہ خط بھی جو اس نے تمہیں ایبٹ آباد سے لکھا تھا؟"

"وہ بھی۔ لیکن آپ کو کیسے معلوم ہے؟"

"اس نے تمہیں کون سا خط لکھا جو مجھے نہیں دکھایا۔ تمہارا کون سا خط تھا جو مجھے نہیں پڑھایا!"

"گویا ہماری محبت میں آپ کا بھی ہاتھ تھا!"

رعنا مسکراتے لگی، لیکن اس کی مسکراہٹ میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی جس کی اسے توقع تھی۔ فراز کو یوں لگا جیسے اس نے عطیہ سے شادی نہ کر کے بڑی بھول کی ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب وہ ساری ساری رات بیٹھ کر عطیہ کو طول و طویل خط لکھا کرتا تھا اور پھر بھی اس کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ ایک یہ زمانہ ہے..... لیکن یہ کیسا مانہ ہے! فراز سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بھی تو اچھا خاصا زمانہ ہے، کوئی ایسی بات نہیں جس کے متعلق.....

رعنا نے کہا "جب ہم ایبٹ آباد میں تھے تو رات رات بھر تمہاری باتیں کیا کرتے تھے۔ عطیہ مجھے وہ سب کچھ بتایا کرتی تھی جو تم اس سے کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تم نے شعر کہنے بھی تو شروع کر دیئے تھے۔"

فراز مسکرایا اور کرسی کی پشت پر سر ڈال کر بالو "ہاں، اس زمانے میں آزاد نظم کا بڑا رواج چل نکلتا تھا اور میں بھی دوسروں کی تقلید میں مبہم قسم کی شاعری کیا کرتا تھا۔" پھر وہ مسکراتے لگا اور اپنی ٹانگ ذرا اور زور سے جھلانا شروع کر دی۔ رعنا نے روغنی پیالے کے کنارے پر انگلی پھیری اور اپنی سرخ سرخ پور کو دیکھتے ہوئے بولی "تم نے لکھا تھا..... جاگ اے جان شہستان تیری تاریکی میں، قافلے منزل جاناں....."

فراز سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا "میں نے یہ نظم تو کسی کو بھی نہیں دکھائی، پھر تم نے کہاں سے سنی؟"

رعنا کا رنگ ذرا پیلا پڑ گیا اور وہ مسکرا کر بولی "جب تم گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے پنڈی آئے تھے تو یہ نظم لکھ کر ساتھ نہیں لائے

تھے.....؟"

"لایا تو ضرور تھا" فراز وثوق سے بولا "لیکن میں نے کسی کو سنائی تو نہ تھی۔"

"ضرور سنائی ہوگی۔" رعنا نے کہا۔ "ذرا یاد تو کرو جب ہم شہر سے چلتے چلتے چھاؤنی کے راستے پر نکل گئے تھے اور تم ریڑھی والے

سے ٹھنڈی ٹھنڈی گنڈیریاں خرید کر لائے تھے۔"

فراز کے ذہن میں اس واقعے کی ہلکی سی تصویر ابھری اور پھر دھندلانے لگی۔ وہ تینوں ___ عطیہ، رعنا اور وہ خود شام کی سیر کو نکلے تھے۔ مری کی ٹھنڈی ہوا میلوں کی مسافت سے کر کے پنڈی کی شاہراہوں میں داخل ہو رہی تھی اور بڑے بڑے اوور کوٹوں کے اندران کے جسم کانپ رہے تھے۔ دور ریلوے سٹیشن کی مدھم بتیوں کے اوپر ایک چمکدار ستارہ جگمگا رہا تھا اور رعنا آنکھوں پر ہاتھ کرھے جی ہی جی میں کوئی دعا مانگ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک دم ہاتھ چہرے سے اٹھا کر پہلے فراز کو اور پھر عطیہ کو دیکھا تھا اور بڑی آہستہ آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہا تھا "خدا کرے تمہارا چہرہ ہمیشہ ہمیشہ میرے ذہن میں یونہی جگمگاتا رہے۔" اس پر فراز کو اپنا ہم جماعت احسن یاد آ گیا تھا، جو ہمیشہ ایسی جذباتی حرکتیں کیا کرتا تھا۔

کوٹھی کے سامنے چھوٹا سالان تھا، جیسا کہ عام طور پر کوٹھیوں کے سامنے ہوا کرتا ہے۔ عام کوٹھیوں کے برعکس اس کا ایک گیٹ تھا۔ سامنے والے برآمدے کے ایک کونے میں گول کمرہ تھا اور دوسرے میں چوکور۔ فراز اسی گول کمرے میں آ کر ٹھہرا تھا اور چوکور کمرے میں عطیہ اور رعنا رہتی تھیں۔ اب کی بار رعنا گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے گھر نہ گئی تھی بلکہ سہیلی کے پاس پنڈی چلی آئی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ ان چھٹیوں میں فراز پنڈی آ رہا ہے اور شاید انہی چھٹیوں میں ان دونوں کی مگنی ہونے والی تھی۔ اس نے عطیہ سے فراز کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا مگر ابھی تک اسے دیکھا نہ تھا۔ فراز نے بھی رعنا کی باتیں سنی تھیں مگر اس سے ملا نہ تھا۔ جب خالد اماں اور عطیہ فراز کو سٹیشن پر لینے گئیں تو ان کے ساتھ رعنا بھی تھی اور یوں پنڈی ریلوے سٹیشن کے بڑے برآمدے میں ان کا تعارف ہوا۔

عطیہ بڑی متلون مزاج اور مغرور قسم کی لڑکی تھی، جیسا کہ عام طور پر خوبصورت لڑکیاں ہوا کرتا ہیں۔ بات بات پر روٹھ جاتی تھی، جیسے نوجوان لڑکیاں چچیرے اور خلیرے بھائیوں سے روٹھ کرتی ہیں۔ اسے فراز اچھا لگتا تھا، بہت ہی اچھا لیکن وہ ہر لمحہ اس معاملے کی جانچ میں لگی رہتی تھی کہ وہ اسے کس قدر چاہتا ہے، کتنا پیار کرتا ہے، کیسے کیسے خیرے برداشت کر سکتا ہے، ایک دن میں کتنی بار مناسکتا ہے۔ رعنا کو اس کا یہ رویہ پسند نہ تھا لیکن وہ اسے کس طرح سمجھاتی اور کیسے کہتی کہ فراز سے یوں نہ روٹھا کرو، وہ تو بہت ہی پیارا بچہ ہے! کیرم کھیلتے، تاش بانٹتے، ریکارڈ بجاتے وہ خواہ مخواہ فراز سے الجھ پڑتی اور پھر منہ سجا کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ فراز اور رعنا گول کمرے میں اکیلے رہ جاتے، ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور سارا سامان قالین پر چھوڑ کر باہر نکل آتے..... فراز لان میں اور رعنا برآمدے میں سے ہو کر چوکور کمرے میں۔ پھر رعنا کے پاؤں میں ایک چکر آ جاتا..... چوکور کمرے سے لان تک اور لان سے پھر واپس چوکور کمرے تک صلح کی شرائط طے ہوتیں۔ معاہدے کے ضوابط مقرر ہوتے۔ دونوں فریقوں پر دبی زبان میں زور ڈالا جاتا۔ نسوانیت کا خیال رکھا جاتا۔ مردانگی سے اپیل کی جاتی۔ فراز لان سے اٹھ کر چوکور کمرے میں آتا، معافی مانگتا اور پھر عطیہ اسی طرح منہ سجائے مان جاتی..... اس ناراضگی کی مدت میں رعنا کو فراز کے ذرا سا قریب ہونے کا موقع ملتا۔ وہ عطیہ کے خلاف جو کچھ کہتا، رعنا کو حقیقت معلوم ہوتی۔ وہ جی ہی جی میں اس کی ہاں سے ہاں ملائے جاتی لیکن فرض کے طور پر اپنی سہیلی کی خاطر وہ سب کچھ سہ جاتی اور بس اسی قدر کہہ سکتی "یقیناً مانو وہ اس قدر برا نہیں۔" اور جب اپنی سہیلی کے بگڑے ہوئے تیور دیکھتی تو جھٹ کہتی "اگر ہے بھی تو نہیں رہے گا۔ تم اسے ایک موقع تو اور دو۔" اور جب دونوں کی صلح ہو جاتی تو رعنا کو یوں لگتا جیسے وہ پنڈی میں ہوتے ہوئے بھی واپس اپنے گاؤں پہنچ چکی ہے۔

ایک دن خالہ نے رعنا کو علیحدگی میں بلا کر عطیہ اور فراز کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ وہ فراز کی والدہ کو خط لکھنا چاہتی تھیں، لیکن انہیں ابھی تک عطیہ کے رویے کا ٹھیک سے اندازہ نہ ہوا تھا۔ رعنا کا جی چاہا کہ تعریف و توصیف کے وہ جملے جو اس نے وقتاً فوقتاً کبھی پڑھے تھے، سارے کے سارے فراز کی ذات سے منسوب کر دے۔ مگر وہ اپنی سہیلی کی وکیل تھی اس لئے اس نے خالہ کو یقین دلادیا کہ عطیہ میں لاکھ خامیاں سہی، فراز کو اس سے اچھا رشتہ نہ مل سکے گا۔ خالہ کا بھی یہی خیال تھا، لیکن وہ کسی اور کے منہ سے اپنی بچی کی تعریف سننا چاہتی تھیں۔ انہوں نے راز دارانہ لہجے میں پوچھا "ڈاکٹری پاس کر لینے کے بعد فراز کو اچھی سی نوکری تو مل جائے گی نا؟" رعنا نے مسکرا کر کہا "خالہ جان! یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ہمارے یہاں ڈاکٹروں کی جس قدر قلت ہے، آپ کے سامنے ہے۔ فراز کو تو امتحان

پاس کئے بغیر اچھی سے اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ "خالہ جان کو اسی جواب کی امید تھی، لیکن انہوں نے منہ بنا کر کر کہا" کیا کروں رعنا، کئی چیزیں سوچنا پڑتے ہیں۔ عطیہ کے لئے اتنے رشتے آرہے ہیں کہ فراز کا نمبر بہت دور جاپتا ہے، لیکن اپنے اپنے ہوتے ہیں اور غیر غیر!"

"بے شک!" رعنا نے ہولے سے کہا۔ "آپ کو ساری باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس معاملے میں ٹھیک سے کوئی رائے نہیں دے سکتی۔" پھر وہ خاموش ہو گئی اور اس کے سامنے کسی قصبے کا ایک چھوٹا سا سکول ابھر آیا جس کی چار دیواری کچی اینٹوں سے بنی تھی، اندر چنبیلی اور موٹیے کے پودے تھے، صحن میں شیشم کے پیڑوں کا چھوٹا سا جھنڈ تھا، پی ڈبلیو ڈی کے تعمیر کردہ چار پانچ کمرے تھے اور ان کے ساتھ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں ہو ہیڈ مسٹرس کی زندگی گزار رہی تھی۔ چند مقامی استانیات تھیں، ایک بوڑھا سا چوکیدار تھا اور دھوپ میں بیٹھی رہنے والی موٹی سی "بلاوی" تھی..... عطیہ اور فراز کسی بڑے شہر کی ایک بڑی سی کوٹھی میں رہتے تھے اور صبح صبح ایک مہذب پیرا چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا ان کے کمرے میں ناشتہ لایا کرتا تھا۔ ان کے یہاں بچہ ہونے والا تھا اور عطیہ نے اپنے خط میں یہ بات بڑے پوشیدہ طریق پر کافی وضاحت سے رعنا کو لکھی تھی۔

"ہاں تو پھر؟" خالہ نے پوچھا اور رعنا اپنے خواب سے چونک اٹھی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور ہولے سے کہا "آپ بسم اللہ کر کے لکھ ہی دیں خالہ جان!" خالہ اماں نے ہامی بھر لی اور رعنا لان میں آ کر کیرم کا مقابلہ دیکھنے لگی۔

اس سے ایک دن پہلے کی بات ہے..... فراز اور عطیہ کے درمیان بڑا جھگڑا ہوا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے سے کبھی نہ بولنے کا عہد کر لیا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ وہ تینوں گول کمرے میں بیٹھے ریڈیوں پر ڈرامہ سن رہے تھے۔ یہ کسی انگریزی ڈرامے کا ترجمہ تھا۔ فراز اس میں گہری دلچسپی لے رہا تھا اور عطیہ بار بار اسے بند کر دینے کو کہہ رہی تھی۔ رعنا معاملے کو تشویش ناک صورت سے بچانے کے لئے آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی "کوئی بات نہیں، بیس منٹ باقی ہیں۔ ڈرامہ ختم ہو جائے گا۔" لیکن عطیہ اسی بات پر تلی ہوئی تھی کہ ریڈیو ہر حال میں ڈرامہ ختم ہونے سے پہلے بند ہونا چاہیے۔ فراز عطیہ کی باتوں کی پرواہ کئے بغیر مزے سے ریڈیو سناتا رہا اور بیچ بیچ میں مسکراتا بھی رہا۔ عطیہ سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ چپکے سے اٹھی اور برآمدے میں جا کر مین سوئچ آف کر دیا۔ ساری کوٹھی کی بتیاں بجھ گئیں۔ اند سے خالہ جان کی آواز آئی "یہ بجلی آج پھر چلی گئی۔" فراز نے کمرے سے کوئی جواب دینا چاہا تو رعنا نے اندھیرے میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی "خالہ جان سے کچھ نہ کہنے گا، وہ خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔ میں باہر جا کر عطیہ کو سمجھاتی ہوں۔" اپنا یہ فقرہ ختم ہونے کے کافی دیر بعد تک بھی رعنا نے وہ ہاتھ یونہی فراز کے منہ پر رہنے دیا اور پھر ٹٹولتی ہوئی باہر برآمدے میں نکل گئی۔

ایک لمحے میں کوٹھی کی بتیاں پھر جگمگا اٹھیں۔ عطیہ جا کر اپنے کمرے میں لیٹ گئی اور رعنا سٹول کھینچ کر اس کے سر ہانے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے مناتی سمجھاتی رہی، پھر مایوس ہو کر اٹھی اور فراز کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا اور میز کی ساری چیزیں سمیٹ چکا تھا۔ رعنا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی فولاد سے بچنے کے تیز ناخن اس کے کلیجے میں گھسے جا رہے ہیں اور وہ گوشت چرنے کی آواز سن رہی ہے۔ اس نے کواڑ کے ساتھ لگ کر ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا "یہ کیا کر رہے ہو فرزی؟"

فراز نے سر اوپر اٹھائے بغیر جواب دیا "کچھ نہیں۔ یونہی بس سامان ٹھیک کر رہا ہوں۔"

رعنا نے کہا "سامان اس طرح تو ٹھیک نہیں کیا کرتے۔"

فراز نے کہا "ہمارے یہاں ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔ جب کسی کو اشاروں ہی اشاروں میں بستر گول کرنے کی تجویزیں ملنے لگیں تو وہ سخت احمق ہوگا اگر....."

"تم غلط سمجھتے ہو۔" رعنا نے بات کاٹ کر کہا "عطیہ کا دل برا نہیں ہے، اس کا یہ مطلب تو نہ تھا۔"

"یہ عجب بات ہے۔" فراز نے مڑ کر کہا۔ "جب بھی کوئی کسی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے، اس کے حمایتی مظلوم کو یہی کہنے آ جاتے ہیں کہ اس کا دل برا نہیں ہے۔"

رعنا نے کہا "میں اس کی حمایتی تو نہیں ہوں فرزی!"

"اور کیا میری ہیں؟" فراز نے چڑ کر کہا اور رعنا خاموش ہو گئی۔

پھر وہ دبے پاؤں عطیہ کے کمرے کی طرف لپکی، لیکن راستے ہی میں رک گئی۔ اس کا دل چاہا کہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر رونے لگ جائے اور اس وقت تک روتی رہے جب تک اس کا جسم سیڑھیوں کی طرح سرد نہ ہو جائے۔ اس نے اندر جا کر لیٹی ہوئی عطیہ کا شانہ جھنجھوڑا اور خوف زدہ آواز میں کہا:

"فراز جا رہے ہیں عطیہ!"

عطیہ نے جھنجھلا کر شانہ چھڑوا لیا اور تنگ کر بولی "جانے دو، اس کے بغیر شہر اجڑ جائے گا کیا؟" اور رعنا کو یوں لگا جیسے کسی نے کہا ہو "جانے دو، سورج نہ چڑھے گا تو شہر میں اندھیرا ہو جائے گا کیا!" فراز چلا جائے اور پنڈ کادیں بستا رہے، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے بھلا۔ اس نے سماجت بھرے لہجے میں عطیہ سے کہا "اٹھو تو وہی، ایک بار اس کے کمرے تک تو چلو۔"

لیکن عطیہ نے چڑ کر رضائی سے سر ڈھانپ لیا اور نیند بھری آواز میں منمنائی "رہنے دو رعنا۔ آؤ سو جاؤ۔"

تھوڑی دیر تک رعنا چارپائی کے پائے پر پاؤں رکھے کھڑی رہی۔ پھر شمال کو کندھوں کے گرد لپیٹ کر گول کمرے کی طرف چلی۔ فراز اپنی چپلیاں اخبار کے کاغذ میں لپیٹ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر رعنا کی طرف دیکھا اور پھر پیکٹ کے گرد رسی لپیٹنے لگا۔

رعنا کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی اور دردناک لہجہ میں بولی "تم واقعی جا رہے ہو فراز؟"

فراز نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا "جی" اور اپنا اٹیچی کیس کھول کر پیکٹ اس میں ڈال دیا۔

"خالہ جان پوچھیں گی تو کیا جواب دو گے؟" رعنا نے پوچھا۔

"کہہ دو گا گھر سے تارا آ گیا ہے، کوئی ضروری کام ہے۔"

"اور اگر انہوں نے کہا تار مجھے دکھاؤ؟"

"تو میں کہوں گا میں نے پھاڑ ڈالا ہے۔"

"اگر وہ نہ مانیں تو؟"

"تو بھی میں چلا جاؤں گا۔"

رعنا نے ہولے سے کہا "عطیہ کا قصور ایسا سنگین تو نہیں کہ معافی ہی نہ دی جاسکے۔"

فراز نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "یہاں معافی مانگنے ہی کون آیا ہے جو دینے کا سوال پیدا ہوتا۔"

"میں جو مانگنے آئی ہوں اس کی جگہ!"

"کوئی کسی کی جگہ معافی کیوں مانگے رُنی آپ..... اور پھر آپ کو کیا ضرورت پڑی ہے؟"

"مجھے ضرورت پڑی ہے ناں۔" رعنا نے روکھی آواز میں کہا "بس اسے معاف کر دو۔ وہ بے وقوف ضرور ہے، بری نہیں۔"

فراز سوچ میں پڑ گیا تو رعنا کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آکھڑ ہوئی۔ اس نے دیکھا فراز کی سیدھی مانگ کافی چوڑی تھی اور اس کے دونوں کناروں پر تین چار سفید بال برقی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی کنگھی جھولی میں ڈالی ہوئی تھی اور وہ بڑ ریزی کے ساتھ کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک رعنا اس کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ فراز نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھیں دھند کی راتوں میں پنڈ کے سنسان کو بچے نظر آئیں۔ اسے ابھی اس بات کا احساس نہیں ہے۔ "فراز نے بڑی محبت سے رعنا کا کندھا تھپتھپایا اور آہستہ سے کہا "کاش ہمیں بھی زندگی میں ایسا ہی کوئی دوست میسر آتا!"

اگلے دن جب فراز سو کر اٹھا تو اس کی ساری چیزیں بڑی قرینے سے کمرے میں سچی ہوئی تھیں اور آئینے کے پاس اس کی سیاہ نوٹ بک پڑی تھی جس میں وہ آزاد نظمیں لکھا کرتا تھا۔

ویننگ روم کے سامنے سے وہی قلی ٹرالی دھکلیتا ہوا گزر رہا تھا تو فراز اپنے خواب سے چونکا اور اپنے سوال کا جواب نہ پا کر پھر پوچھنے لگا "میں نے وہ نظم تو کسی کو بھی نہ دکھائی تھی، پھر تم نے کہاں سے سنی رُنی؟"

رعنا نے کہا "عطیہ نے تمہاری نوٹ بک سے پڑھ کر مجھے سنائی تھی۔"

"لیکن اس نے مجھ سے تو کبھی اس بات کا تذکرہ نہ کیا کیا۔" فراز نے کہا۔

"تم سے کیسے کرتی" رعنا نے مسکرا کر کہا "چوری کا مال ہر ایک کو تو نہیں دکھایا جاتا ناں۔" پھر اس نے شیشم کے قوی ہیکل میز سے

اپنا پرس اٹھا کر گود میں ڈال لیا اور سوالیہ نگاہوں سے بولی "اب تو عطیہ کا کوئی خط نہیں آتا؟"

فراز نے کہا "اس نے پہلے مجھے کتنے خط لکھے تھے جواب آتا۔ سنا ہے اس کی شادی ہو رہی ہے؟"

رعنا خاموش رہی۔

فراز نے پھر پوچھا "ہو رہی ہے ناں اس کی شادی؟"

رعنا نے سر جھکا کر کہا "تمہیں کیا، اب وہ چاہے کچھ ہی کرے۔ تم مردوں سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ شادی کروانے سے پہلے کم از

کم اپنے آپ سے ہی پوچھ لیں کہ..... "لیکن وہ پھر خاموش ہو گئی اور فراز نے آگے ہو کر پوچھا "کیا؟"

رعنا نے کہا "کچھ نہیں..... کسی کو کسی پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ لیکن ایک وقت آتا ہے..... نجانے کہاں سے آ جاتا ہے وہ وقت

.....جب یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ کسی کا حق چھینا جا رہا ہے۔"

فراز نے کچھ کہنا چاہا لیکن دندناتی ہوئی ایکسپریس کے کھڑکھڑاتے ڈبے ویٹنگ روم کے سامنے سے گزرے اور چشم زدن میں گاڑی کو چینی ماتی بریکیں چمٹنے لگیں۔ فراز ہڑبڑا کر اٹھا اور کرسی کے ساتھ لگی ہوئی اپنی چھڑی اٹھالی۔ رعنا بھی اٹھی اور اس نے اپنا پرس کلائی پر ڈال کر پھودونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال لئے۔ وہ دونوں ویٹنگ روم سے نکلے تو قلی فراز کا سامان اٹھائے برآمدے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے صاحب کو باہر نکلتے دیکھا تو انجن کی جانب چل دیئے۔ فراز نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کھڑکی سے سر باہر نکال لیا..... اور پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی رعنا سے کہا "کبھی کراچی آئیے۔"

رعنا دکھ بھرے انداز میں مسکرائی اور اپنے سینڈل کو سگریٹ مسلنے کے طریق پر گرڑتے ہوئے بولی "اگر عطیہ ہوتی تو شاید..... لیکن میرا خیال ہے....." پھر وہ چپ ہو گئی۔

فراز کھڑکی سے اور آگے جھک آیا اور بولا "لیکن آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر عطیہ ہوتی تو پھر بھی نہ آتیں؟"

رعنا کا سر اور جھک آیا اور بولا "لیکن آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر عطیہ ہوتی تو پھر بھی نہ آتیں؟"

رعنا کا سر اور جھک گیا۔ اس نے دیکھا فرش پر ایک مکوڑا دن بھر دانے دنگے کی ناکام تلاش کے بعد گھرواپس جا رہا تھا۔ فراز نے

اپنی دونوں کہنیاں کھڑکی میں جما کر قدرے زور سے کہا۔ "رغنی....."

لیکن نہ گھنٹی بجی نہ سیٹی کی آواز سنائی دی اور گاڑی کھڑانک سے اپنے پہیوں پر یوں آگے لپکی جیسے پیچھے کسی دیوانے انجن نے زور

کی ٹکر دے ماری ہو۔

رعنا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ فراز کا ڈبہ کئی گز آگے نکل چکا تھا۔ پھر اور ڈبے آئے، اور ڈبے گزرے اور سٹیشن یوں خالی ہوگی جیسے لڑائی

کے بعد کچی بارکیں!

Virtual Home
for Real People

پل صراط اور پاسپورٹ

محمد صدیق میٹرک کرنے کے بعد جب پہلی مرتبہ لاہور آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لاہور میں سبھی لوگ ہر روز نہیں نہاتے، ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے ہوئے "السلام علیکم" نہیں کہتے اور بانیں ہاتھ سے گلاس اٹھا کر پانی پی لیتے ہیں۔ کوئی مہینہ بھر تک وہ ان کو اسی طرح دیکھتا رہا اور پھر اس کو فوڈ کے محکمے میں کلرکی مل گئی۔

جس روز صدیق کو نوکری ملی ہے، اس روز اس کی عمر ٹھیک چوبیس سال دو مہینے اور پندرہ دن کی تھی اور ہونو کوری کے شوق میں صبح سویرے مسواک کئے اور نہائے بغیر دفتر پہنچ گیا تھا۔ صدیق اس دفتر کے اندرونی اور بیرونی جغرافیے سے اچھی طرح واقف تھا اور محکمے کے تقریباً سبھی لوگوں کو جانتا تھا کہ اول روز سے اس کا سفارشی خط اسی محکمے کے لئے تھا۔ آج تو خیر اس کا اس دفتر میں باقاعدہ پہلا دن تھا، لیکن وہ اس سے پہلے بھی یہاں کام کرتا رہا تھا۔ کبھی ایک گھنٹہ ایک میز پر، کبھی Despatcher کے ساتھ، کبھی دفتری کے ساتھ اور کبھی چپراسی کی غیر حاضری میں صاحب کے دروازے پر!

جب وہ اپنی نوکری کے پہلے دن دفتر سے گھر واپس آ رہا تھا تو بس میں بھیڑ کی وجہ سے اسے پائیدان پر کھڑے ہونا پڑا۔ دو سٹاپوں بعد اسے اندر جگہ مل گئی۔ ایک مانوس چہرے نے اپنا بدن سکیڑ کر اسے بیٹھنے کی تھوڑی سی جگہ فراہم کر دی۔ دونوں طرف سے بھنپنے کی وجہ سے اس نے پہلو والی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر سامنے والی جیب میں ڈال لیا اور نچنت ہو کر بیٹھ گیا۔ جس آدمی نے اس کو بیٹھنے کی تھوڑی سی جگہ فراہم کی تھی، اس کا نام منور تھا اور وہ سبزی منڈی میں غلام احمد آڑھتی کی دوکان کا روکیا تھا۔ دونوں میں تھوڑی دیر سی سی باتیں ہوئیں اور منور اگلے سٹاپ پر اتر گیا۔

منور کی جگہ لال ڈارھی والا ایک بھاری بھر کم آدمی سو سو کرتا آ کر بیٹھ گیا اور صدیق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "آپ کا اسم شریف؟" صدیق نے اپنا اسم شریف بتایا تو اس بھاری بھر کم آدمی نے خوش ہو کر کہا "میرے چھوٹے بھائی کا نام بھی محمد صدیق ہے، لیکن اس کا قدم سے ڈیوڑھا ہے۔" پھر اس نے خوش ہر کر کہا "لوگ اسے لمبے قد کی وجہ سے میرا بڑا بھائی سمجھتے ہیں۔" صدیق نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور پانچ روپے والی جیب پر ہاتھ رکھ کر باہر دیکھنے لگا۔

جب بس قرطبہ چوک پر کی اور صدیق اترنے کے لئے اٹھا تو اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پانچ کا نوٹ ٹٹولا اور ساتھ ہی ایک دلدوز چیخ ماری۔ کسی نے بلیڈ پھر کر اس کی جیب تراش لی تھی اور صدیق کی انگلیاں جیب کے پینڈے سے باہر جھانک رہی تھیں۔ اس نے ڈرائیور کی طرف منہ کر کے بلبلا کر کہا "بس روک لو جی، میں سب کی تلاشی لوں گا۔ کوئی سواری بس سے نیچے نہ اترے۔" میری جیب کٹ گئی ہے۔

ڈرائیور نے آواز دے کر کہا "سب بھائی صاحب اسی طرح بیٹھے رہیں اور اپنی جگہ سے ہلیں نہیں۔" پھر وہ کلیز کا نام لے کر پکارا "بو بے دروازہ بند کر دے، کوئی نیچے نہ اترے۔"

بھاری بھر کم آدمی نے جھک کر کٹی ہوئی جیب دیکھ کر کہا "کیا کچھ جاتا رہا ہے صدیق صاحب؟" تو صدیق نے دھاڑ مار کر کہا "میرا ایمار چوری ہو گیا ہے۔ میں تو آپ کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور کوئی میری ایمان بک پر ہاتھ صاف کر گیا۔" اس نے ایک مرتبہ پھر کٹ ہوئی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ روپے کا نوٹ باہر نکال کر بولا "یہ پانچ کا نوٹ تو سی طرح کٹی ہوئی جیب میں پڑا ہے، لیکن میرا ایمان غائب ہو گیا ہے۔"

ایک لمبے سے لفنگے لڑکے نے کھڑے کھڑے اپنی جیب میں پھونک ماری اور سر ہلا کر کہا "اپنا ایمان تو موجود ہے بھائی صاحب اللہ کے فضل سے۔"

اس لفنگے لڑکے کی بات سن کر سب اپنی اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے اور جب سن کو یقین ہو گیا کہ ان کا ایمان اپنی اپنی جگہ موجود ہے تو وہ سب مطمئن ہو کر صدیق سے ہمدردی کرنے لگے۔

صدیق کہہ رہا تھا کہ "میں آج صبح کپڑے بدل کر اور ضروری کاغذات کی فائل لے کر پہلے دن نوکری پر گیا ہوں، چلتے وقت میں نے احتیاط کے ساتھ اپنی ایمان بک اس جیب میں ڈالی ہے۔"

"بس یہی تو غلطی کی صدیق بھائی" لال ڈاڑھی والے بھاری بھر کم آدمی نے کہا "ایمان کبھی بھی باہر کی جیب میں نہیں رکھتے، ہمیشہ اندر کی جیب میں رکھتے ہیں۔" شلو کے کی جیب میں یا بنیان کے ساتھ سپیشل جیب بنوا کر، دل کے پاس۔

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بزرگو!" ایک ریٹائرڈ آدمی گردن گھما کر بولا "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایمان کو باہر لانا ہی نہیں چاہئے، ہمیشہ اندر رکھنا چاہئے تالے چابی میں۔" باہر اس کا کیا کام!"

عورتوں کے خانے سے ایک مڈل کلاس تعلیم یافتہ بی بی اپنی چوڑیوں والی بانہہ کھجا کر بولی "ہم نے تو اپنے اپنے ایمان لا کر میں رکھے ہوئے ہیں۔ گھر ہی بینک ہے۔ جب ضرورت پڑتی ہے، جا کر لے آتے ہیں۔"

ڈرائیور نے بھی قدرے غصے سے جھلا کر کہا "او بھائی صاحب! ایسی قیمتی چیز کو کوئی جیبوں میں ڈال کر پھرا کرتے ہیں۔ ٹرنک صندوق میں رکھنے کی چیز، آپ لے کر بازار میں آ گئے۔"

"کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے" صدیق نے شرمندگی سے کہا "تو پھر ہر بار گھر تو نہیں جایا جاتا ناں۔"

"ضرورت!" کالی عینک والے ایک شخص نے سر جھکائے ہوئے کہا "کیا ضرورت پڑ جاتی ہے؟ کہاں ضرورت پڑ جاتی ہے؟ کیوں ضرورت پڑ جاتی ہے؟ ایمان کوئی محول بازی ہے کہ اس کی قدم قدم پر ضرورت پڑنے لگے۔ یہ تو ایک پاکیزہ اور مطہر چیز ہے _____ ارفع اور اعلیٰ شے، لطیف و منزعہ ملکیت۔ _____ اسے ناپاک جگہوں پر استعمال نہیں کیا جاسکتا بھائی صاحب!" صدیق نے ڈرتے ڈرتے کہا "اپنے گاؤں میں تو ہم اسے ہر وقت ساتھ ہی رکھتے ہیں۔"

"اسی لئے تو آپ گاؤں والے پینڈو کہلاتے ہیں۔" ایک صاحب چڑ کر بولے "اور اسی وجہ سے ہمارا ملک ترقی نہیں کر رہا کہ سارے کا سارا پینڈو سوچے بھر گیا ہے۔"

ڈرائیور نے آواز دے کر پوچھا کہ اگر سب کی تسلی ہوگئی ہو تو وہ بس آگے چلائے، لیکن کچھ لوگوں نے پہلے تھانے جانے کی اور چند ایک نے بس آگے بڑھانے کی رائے دی۔ اس پر محمد صدیق نے جھلا کر اونچی آواز میں کہا "میرا ایمار چوری ہو گیا ہے اور آپ لوگ بس آگے چلانے کی بات کر رہے ہیں۔ میں ایک مرتبہ سب کو جامہ تلاشی کے لئے تھانے لے کر جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ جو چاہیں، کریں۔"

ڈرائیور نے غصے میں آ کر بس تھانے کی طرف موڑی اور سب کو لے کر چوکی لٹن روڈ پر آ گیا۔

حوالدار صاحب نے دو سپاہیوں کی مدد سے بس کے اندر سب کی جامہ تلاشی لی لیکن کسی سے فریاد کنندہ کا ایمان دستیاب نہ ہوا۔ ساری بس میں کسی کے پاس اپنا ایمان بھی نہیں تھا سوائے ایک بابا ماشکی کے، جس کی ایمان بک ساری عبارت مع بابا ماشکی کے نام اور اس کی علدیت کے دھل چکی تھی۔ بس ایک مہربانی رہ گئی تھی جو اپنی پوری آب و تاب سے قائم تھی اور جس کا ایک ایک لفظ صاف پڑھا جاتا تھا۔ بس رخصت کرنے کے بعد تھانیدار صاحب نے محمد صدیق کا تحریری بیان لے کر اس کی کٹی ہوئی جیب کا نقشہ بیان کے دائیں طرف اتارا اور سوار یوں کی گواہیاں بائیں طرف ڈالیں۔ پھر انہوں نے محمد صدیق کو سامنے بٹھا کر کہا "برخوردار ہم تمہاری ایمان بک تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے، لیکن اس بات کی گارنٹی نہیں دیتے کہ وہ مل بھی جائے گی یا نہیں۔"

محمد صدیق تھانیدار صاحب کی یہ بات سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ بولنے کے لئے الفاظ تلاش کر ہی رہا تھا کہ تھانیدار صاحب نے پھر کہا "دیکھو میاں صاحب زاوے! اول تو تم کو ایمان اپنے گاؤں چھوڑ کر آنا چاہئے تھا، اپنے کسی بڑے بزرگ کی تحویل میں دے کر اور اگر غلطی سے شہر لے ہی آئے تھے تو اسے ایسی محفوظ جگہ پر رکھنا چاہئے تھا جہاں کسی کی نظر نہ پڑ سکے، لیکن تم تو سامنے کی جیب میں ڈال کر اس کی نمائش کرتے پھر رہے تھے۔"

"بالکل نہیں جناب!" صدیق نے تھانیدار صاحب کی تصحیح کرتے ہوئے کہا "میں نے اپنا ایمان اپنی جیب کے اندر کر کے رکھا اور اس پر اپنا رومال ٹھونسا ہوا تھا۔ نہ تو اس کے باہر نکل کر گرنے کا خطرہ تھا اور نہ ہی اس کی نمائش مقصود تھی۔ اور پھر میری جیب اوپر سے نہیں، نیچے سے کٹی ہے۔ پانچ روپے کا نوٹ محفوظ ہے اور ایمان نکل گیا ہے۔"

تھانیدار نے پوچھا "تمہاری ایمان بک اصل صورت میں تھی یا تم نے اس میں کوئی ترمیم کی تھی؟"

"میں نے خود اس کی جلد باندھی تھی جناب عالی!" صدیق نے کٹی ہوئی جیب پر ہاتھ پھیر کیر کہا "جرمن مقوے پر سبز ابری چڑھا کر جلد تیار کی تھی اور اس پر ربڑ کا چھلا ڈال رکھا تھا کہ بک خواہی نخواہی کھلی نہ رہے..... اور گرمیوں میں تو جناب میں اے پلاسٹک کے لفافے میں ڈال کر جیب میں رکھتا تھا کہ پسینے سے اور گرد و غبار سے خراب نہ ہو۔"

"ہمیں دو باتوں کی فکر ہوتی ہے۔" تھانیدار صاحب نے بات کاٹ کر کہا، "ایک تو مظلوموں کا ہاتھ پکڑ کر ان کی داد رسی کرنا اور دوسرے لوگوں کے ایمان کی حفاظت کرنا۔ غلطی سے اگر کسی کا ایمان کھو جائے، یا آپ کی طرح سے کوئی جیب کتر وا بیٹھے تو ہر حالت میں اس کو اس کا ایمان تلاش کر کے دنیا اور اسے آئندہ کے لئے محفوظ رکھنے کے گرتلانا ہمارا اولین فرض ہے۔ اصل میں یہ ایسی کتاب ہے کہ اگر ایک مرتبہ گم ہو جائے تو دوبارہ اشوع نہیں ہو سکتی!"

محمد صدیق نے درد مند اور زبوں حالی مسافر کی طرح تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا "اب اس کے بغیر میں آسانی سے گھوم پھر سکتا ہوں کہ نہیں؟"

تھانیدار صاحب نے کہا " گھوم پھر تو سکتے ہو، لیکن آسانی کے ساتھ نہیں۔ کبھی بھی تمہاری پڑتال ہو سکتی ہے اور کوئی بھی کر سکتا ہے۔ "

محمد صدیق پڑتال کا لفظ سن کر گھبرا گیا اور بے بس ہر نی کی طرح منہ اٹھا کے کھڑا ہو گیا۔ تھانیدار صاحب نے کہا "منشی سے کہہ کر ایک عارضی پرمٹ لے لو۔ اس سے تمہاری پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔ ایمان کھوجانے کی صورت میں تھانے کی کلیئرنس ہر وقت ساتھ ہونی چاہئے پھر کوئی فکر کی بات نہیں۔"

تھانیدار صاحب نے اونچی آواز میں پکار کر کہا "منشی جی اسے ایک کلیرنس جاری کر دیں، اپنا ایمان گنوا بیٹھا ہے۔ کسی نے جیب کاٹ لی ہے"۔ پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منشی کے چھپر کی طرف اشارہ کیا اور صدیق سے کہا "جاؤ جا کر منشی سے راہداری بنوالو لیکن اسے سنبھال کر رکھنا، اگر یہ بھی گم ہوگئی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے"۔

صدیق، تھانیدار صاحب کا شکریہ ادا کر کے چھپر کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ منشی جی جی روز نامہ لکھ رہے تھے، اس لئے انہوں نے صدیق کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

رات کو سوتے وقت جب اس نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے سینے پر پھونک ماری تو اس کے منہ سے بے اختیار ایک میٹھ نکل گئی اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ نوکری کا پہلا دن _____ امنگوں بھری زندگی کی ابتدا _____ گاؤں سے دور۔۔۔۔۔۔ بے یار و مددگار _____

یکہ وتہا اور اس پر یہ مصیبت کہ چوبیس برس پرانی ایمان بک دیکھتے دیکھتے بائیں جیب سے غائب ہوگئی۔ اسے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی جیب بس میں نہ کٹی ہوں بلکہ اس سے پہلے کٹ گئی ہو۔ جب وہ بس سٹینڈ پر کھڑا تھا، یاد فتر سے نکل کر بس سٹینڈ کی طرف آ رہا تھا، یا راستے میں کھڑے ہو کر عید کارڈ دیکھنے لگا تھا..... یا پھر.....

محمد صدیق کو اچانک یوں لگا جیسے اس کی جیب دفتر میں ہی کٹ گئی ہو۔ سب لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے کام کر رہے ہوں۔ سائل

کھڑکیوں میں کھڑے ہوں۔ چہرہ اسی اندر باہر آ جا رہے ہوں اور اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کی جیب کٹ گئی ہو۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کمرے کے اندر، اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے، اپنے کاغذوں پر جھکے جھکے، اپنی پنسل سے لکھتے لکھتے کسی کی جیب کٹ جائے! اسے یاد آیا کہ درمیان میں وہ ایک مرتبہ اٹھ کر پیشاب کرنے بھی گیا تھا۔ غسل خانے میں داخل ہو کر جب اس نے قمیض کے دامن کو تھوڑی تلے دبا کر ازار بند کھولا تھا، تو اس کا ایمان جیب کے اندر موجود تھا اور اس نے تھوڑی کے نیچے ایمان بک کے دباؤ محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد پتہ نہیں کب اس کی جیب کٹی اور کب کوئی اس پر ہاتھ صاف کر گیا۔

محمد صدیق کو اس پگڑ والے کی شکل صاف دکھائی دے رہی تھی، جس کی عینک کا ایک شیشہ تڑخا ہوا تھا اور چہرے پر بھلی سے مسکراہٹ تھی۔ اس کو ایک من چینی کا پر مٹ چاہئے تھا کہ اس کے گھر میں مولود کی محفل ہونے والی تھی۔ عرضی کے ساتھ اس نے پانچ روپے کا نوٹ بھی لگایا ہوا تھا۔ کسی پن سے یا کلب سے یا سکاچ ٹیپ سے نہیں بس ایسے ہی لگایا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ کی بناوٹ اور انگوٹھے کی گھماوٹ سے عرضی کے ساتھ نوٹ لگایا ہوا تھا۔

اس نے دو مرتبہ عرضی کو غور سے پڑھا۔ چند ہندسوں اور تاریخوں کے اندراج کئے۔ عرضی والے سے مولود شریف کی تاریخ پوچھ کر لال قلم سے عرضی پر درج کی اور اٹھ کر الماری سے پر مٹ بک لینے چلا گیا۔ الماری کی طرف جاتے جاتے اس نے پانچ کا نوٹ اسی جیب میں ڈالا جہاں سا لہا سال سے اس کا ایمان پڑا تھا۔ نوٹ نیچے کرنے کے لئے اس نے باہر سے ایمان بک کی جلد پر دو تین ٹھوکے بھی مارے اور پھونک مار کر جیب کے اندر بھی دیکھا، لیکن اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ کہ اس کی جیب کا پیندا کٹ گیا، ایمان نکل گیا اور پانچ کا نوٹ ویسے کا ویسا جیب کے اندر چمٹا رہ گیا۔

اسے اپنے معاشرے کی بے ایمانیوں، بدنیتوں، بے اخلاقیوں اور بدنمائیوں پر رونا آ رہا تھا۔ اس نے درد انگیز آواز میں "اللہ جی" کہہ کر خدا کو پکارا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ابل پڑے۔ صدیق بلک بلک کر رویا، روتے روتے سسکیوں میں اتر اور سسکیاں بھرتے بھرتے گہری نیند سو گیا۔

چوبیس برس کی عمر میں محمد صدیق محکمہ فوڈ میں ملازم ہوا تھا اور چون برس کی عمر میں بوسٹن سے واپس وطن لوٹا۔ یہ سارا عرصہ اس نے دوبئی، قاہرہ، گلاسگو، نیویارک اور بوسٹن میں گزارا۔ نیویارک میں ایک فلنگ سٹیشن کے پاس اس کا چھوٹا سا کھوکھا تھا جس میں چاکلیٹ، کوکیز، چیوننگ گم، فلمیں اور آڈیو کیسٹ ملتے تھے، لیکن بوسٹن میں اس کا ایک بہت بڑا اسٹور تھا جس میں دو ہندوستانی، ایک سری لنکن اور تین پاکستانی لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ خود صدیق کی بیوی جو پہلے سردارنی تھی اور پھر امریکی نام اختیار کرنے کے بعد بھی سردارنی ہی تھی، کیش رجسٹر پر بیٹھتی تھی۔ صدیق کے دنوں لڑکے اور ایک لڑکی دل چاہتا تو سنور پر آ کر ماں کا ہاتھ بٹا جاتے ورنہ اپنے نیکرو یاروں میں گھوم کر ہلا گلا کرتے یا پھر پیلی بلیوں کے پیچھے بھاگ کر انہیں ہراساں کرتے تھے۔ تینوں بچے بڑے طاقتور، بے حد شریر اور بلا کے منہ زور تھے۔

مقامی پولیس کے بڑے افسر بھی ان کو جانتے تھے اور چھوٹے اہلکار بھی ان کی مجلسوں میں شریک رہتے تھے۔ مافیا چیف کبھی ان کے ہلے گلے میں شریک تو نہیں ہوا تھا البتہ اپنی کار سے ہاتھ نکال کر ان کو ویو وضو کر کے جاتا تھا۔ چیف کے ساتھ ان کا ایک خصوصی فوٹو بھی تھا جو انہوں

نے سٹوڈیو میں پوز بنا کر اتروایا تھا۔

تیس برس بعد موسیو محمد صدیق "نائی کون" جب واپس وطن آیا تو سب سے پہلے سیدھا داتا صاحب سلام کرنے گیا۔ داتا دربار حاضری دینے سے پہلے اس نے جوتیاں اتار کر جب سنگ مرمر کے صحن پر پہلا قدم رکھا تو اسے فرش بے حد ٹھنڈا محسوس ہوا۔ دوسرے پیر سے بھنڈارے کے چند چاول اور چنے کا ایک دانہ چٹ گیا۔ اس نے واپس ڈیوڑھی میں آکر جراب سے اپنے پاؤں پونچھے اور جوتے پہن کر بازار میں آگیا۔

تیس برس پہلے جب وہ نوکری کی تلاش میں یہاں آیا تھا تو ہر روز داتا صاحب حاضری دے کر اپنی ملازمت کے لئے دعا مانگا کرتا تھا۔ اس وقت صدیق کے تلوؤں سے اگر بھنڈارے کے چاول چٹ جاتے تھے تو وہ انہیں اتار کر منہ میں ڈال لیا کرتا تھا اور بغیر چبائے نگل جاتا تھا۔ اب اس کے تلوؤں کی چیچا ہٹ اس کے ذہن میں منتقل ہو گئی تھی اور وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا بھی اندر ہی اندر چیچا رہا تھا۔ انٹرکان کے کمرہ نمبر 513 میں سونے سے پہلے جب پیرے نے لائڈری سے اس کے کپڑے، کاؤنٹر سے ڈاک اور بک شاپ سے اس کے رنگین رسالے لاکر دیئے تو اس نے اپنے بٹوے سے دو ڈالر نکال کر زیر خان کو دیتے ہوئے کہا "ان کو بھنوا بھی لیتے ہو کہ نہیں؟"

زیر خان نے نوٹ پتلون کی ہپ پاکٹ میں ڈالتے ہوئے کہا "ڈالروں کو میں بھنواتا نہیں، جمع کرتا رہتا ہوں۔ میری بیٹی کی شادی قریب ہے اور اسد اللہ صاحب نے مجھے ڈیوٹی فری شاپ سے بہت سی چیزیں لے کر دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

"اس کے جہیز کے لئے؟" صدیق نے پوچھا۔ زیر خان نے سنجیدگی سے کہا "یس سر، اس کے جہیز کے لئے بھی اور سم تھنگ فار ہر برائنڈ گرام ٹو۔ وہ اتنا اچھا لڑکا ہے کہ اس نے میری بیٹی کو نمبر ٹوک دیا ہے اور خود نمبر ون ہو کر ہمارے گھر آنے پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہی از ویری سوئٹ سر۔"

"وہ تو سوئٹ ہے، ٹھیک ہے!" صدیق نے کا "اور ہماری دعا ہے کہ خدا اسے عمر بھر سوئٹ ہی رکھے، لیکن کچھ اپنے لئے بھی تو

چاہئے۔۔۔۔۔ اپنے بڑھاپے کے لئے، اولڈ ایج کے لئے....."

"اپنے لئے تو سر ایمان چاہئے اور ایمان کی سلامتی چاہئے۔" زیر خان نے پورے یقین کے ساتھ کہا "جاتے ہوئے اور تو کسی چیز نے ساتھ جانا نہیں، بس ایک ایمان ہی ہو گا وہ بھی اگر ہوا تو! اسی ایمان نے بابے بڈھے کی انگلی پکڑ کر پل صراط سے گزارنا ہے، لیکن اگر ساتھ ہوا تو!"

اس کے بعد بھی زیر خان کچھ بولتا رہا، لیکن صدیق کے کانوں کے دروازے اور کھڑکیاں اور دراک کا بڑا اچھا ٹک ایک ساتھ بند ہو گئے۔ رات گئے تک صدیق بستر پر لیٹا سوچتا رہا کہ اسی شہر میں کسی نے جیب کاٹ کر اس کا ایمان چرا لیا تھا اور بھری بس میں عین دل کے اوپر والی جیب پر بلیڈ پھیر دیا تھا، لیکن ایمان کی بازیابی میں کسی نے اس کی مدد نہیں کی تھی۔ جب اسے لیٹے لیٹے یہ خیال آیا کہ پورے تیس سال وہ دیار غیر میں اپنے ایمان کے بغیر ہی زندگی بسر کرتا رہا ہے تو صدیق کو ایک جھن جھنی سی آئی اور اس کا سارا بدن پسینے میں ڈوب گیا۔

صبح سویرے اٹھ کر صدیق لٹن روڈ چوکی کی طرف گیا کہ جا کر پوچھ سکے کہ وہ جو تیس سال پہلے اس نے ایف آئی آر درج کرائی تھی، اس کے جواب میں اس کا کھویا ہوا ایمان ملا یا نہیں؟ لیکن تھانے جانے کے بجائے وہ قریب ہی ایک چھوٹی سے مسجد کے سامنے رک کر مسجد کی خوبصورتی کا نظارہ کرنے لگا۔

مولوی صاحب باہر دھوپ میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ کچھ تہہ شدہ اخبار بند پڑے تھے۔ چند ایک رسالے تھے اور ساتھ ایک کتاب تھی۔ صدیق، مولوی صاحب کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر بولا "میرا نام محمد صدیق ہے اور میں امریکہ میں رہتا ہوں"۔ مولو صاحب تپک کر اپنی کرسی سے اٹھے، ہاتھ ملایا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ صدیق اسی طرح کھڑا رہا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا "آج سے تیس برس پہلے اسی جگہ پر، چوک قرطبہ سے ذرا پرے، کسی نے میری جیب کاٹ کر میرا یکمان چرا لیا تھا اور اس وقت سے اب تک میں ویسے ہی زندگی گزار رہا ہوں..... خالی خالی، بہکی بہکی، اجڑی اجڑی۔ میرے اندر کا اور میرے ارد گرد کا خلا بڑھتا جا رہا ہے اور اب میں زیادہ ہی پریشان رہنے لگا ہوں"۔

مولوی صاحب نے تشفی آمیز لہجے میں پوچھا "آپ کے پاس شناختی کارڈ ہے؟"

"جی ہے!" صدیق نے وثوق کے ساتھ کہا۔

"پاسپورٹ ہے؟" مولوی صاحب نے کہا۔

"وہ بھی ہے!"

"گرین کارڈ ہے؟"

"وہ بھی ہے!"

"تو پھر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے"۔ مولوی صاحب نے صدیق کے کندھے پر محبت بھرا دھپا مار کر کہا "ان تینوں

چیزوں کی موجودگی میں ایمان کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ جاتی، سب خیر ہے"۔

Virtual Home
for Real People

وگھو وگھو

میں اس کو پورے انتالیس سال گیارہ مہینے آٹھ دن اور پانچ گھنٹے کے بعد ملا تھا اور اس کی شکل و صورت بالکل ویسی تھی جیسی اس کی چھلی سا لگرہ کے روز تھی جب اس نے اٹھارہ موم بتیاں بجھا کر اپنا چہرہ سرخ اور ماتھا عرق آلود کر لیا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی اس کی تین سواتین سیر کی گت تھام کر کھڑا تھا جو موم بتی کو پھونک مارتے وقت اس کی پیٹھ اور کندھے سے پھسل کر میز کے کنارے سے ٹکراتی تھی اور اپنے بھار اور اپنی جھلار سے اس کی ٹھوڑی اوپر کواٹھا دیتی تھی۔ ہم ہر موم بتی بجھنے پر تالیاں بجاتے تھے۔

میں اپنے پوتے کے ولیمے کے لئے دو قصائیوں سے گیارہ بکرے کٹوا رہا تھا اور نااہلی کے اس کھنڈ پر بیٹھا تھا جو پچھلے دو سال سے لا ن کنارے پڑا تھا اور اب اس کے ساتھ دو چھولدار یوں کے رے بندھے تھے۔ بہت سارا گوشت بن چکا تھا اور ابھی بہت سا قی تھا۔ میں قصائیوں سے محبت بھری گفتگو کرتے ہوئے انہیں ولایت کے قصے سنارہا تھا۔ وہ محبت سے میری گفتگو سنتے ہوئے اچھی طرح سے سمجھ رہے تھے کہ میری نظر ان کے کام پر بھی اور ان کے ارادوں پر بھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ناخوش اور بے راز نہی خوشی اپنا پنا کام کر رہے تھے اور ایک ہی قطعہ زمین پر ایک ہی چھولداری کے اندر محبت بھرے انداز میں بیٹھے ایک دوسرے کو دل میں کوس رہے تھے۔

جب ریحانہ چھولداری میں داخل ہوئی تو Beta blocker اور انجائنا کی گولیاں پابندی سے جذب کرنے والا میرا دل پہلے تین چار متر بہ زور سے دھڑکا، پھر بالکل ساکت ہو گیا۔ جب اس نے میرے بالکل سامنے آکر "ہیلو" کہا تو میرے گردے کے اندر کی ساری پتھریاں ایک دم کڑکڑائیں اور میں نے بلبلایا اپنی کمر پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر وہ جس تیزی کے ساتھ اندر چھولداری میں آئی تھی، اسی تیزی کے ساتھ باہر نکل گئی۔

اس نے اپنی بھاری بھر کم گت کٹوا دی تھی اور اب اس کے کٹے ہوئے بال کانوں سے ذرا ذرا نیچے تھے۔ شلواری قمیص چھوڑ کر اس نے ساڑھی پہننا شروع کر دی تھی اور اپنے بدن کو ڈائمنڈنگ کے زور پر بے حد سمارٹ بنالیا تھا۔ بڑے قصائی نے گوشت بنانا چھوڑ دیا اور غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں محبت اور شفقت کی نمی تھی۔ اس کے چہرے پر آگہی کی روشنی اور زبان حال کر گر مائی تھی۔ بہت ممکن ہے اس نے بھی اپنی جوانی میں کسی خوب صورت اور نوجوان لڑکی سے علاقائی زبان میں محبت کی ہو اور وہ دونوں بڑے Native انداز میں ایک دوسرے سے چھپیاں بھی ڈالتے رہے ہوں اور پھر شاید شریکوں نے اس کی محبوبہ کو اونٹ سے نیچے گرا کر اس کے باپ کی نگاہ

ہوں کے سامنے ذبح کر دیا ہوا اور بے چارے قصائی نے خوف زدہ ہو کر کسی بے محبوبہ سے شادی کر لی ہو۔ ہو سکتا ہے _____ سب کچھ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ ہو کیوں نہیں سکتا بھلا!

ریحانہ ٹینٹ سروس والوں کی نوڑ کی ایک کرسی گھسیٹی ہوئی چھولداری میں داخل ہو رہی تھی اور اس کی ساڑھی کے پھول کے مقابلے میں زیادہ کاسنی اور زیادہ بڑے ہو گئے تھے۔ اس نے کرسی لا کر میرے سامنے رکھی اور کہنے لگی "ٹھنڈھ پر نہ بیٹھو، کرسی پر بیٹھو۔"

میں نے کہا "مہربانی! تم نے خواہ مخواہ اتنی زحمت کی۔ مجھے کھنڈوں پر بیٹھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اس کرسی پر تم بیٹھو۔" وہ اسی طرح کھڑی رہی اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی "پتہ نہیں ہم کتنے سالوں بعد آج ملے ہیں۔ مجھے تو صدیاں ہی لگتی ہیں۔" میں نے کہا "صدیاں نہیں ریحانہ، ہم پورے انتالیس سال گیارہ مہینے آٹھ دن اور پانچ گھنٹے بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں۔" ریحانہ ہنسی تو اس کے گالوں کے دونوں ڈمپل بننے سے رہ گئے۔ کہنے لگی "تم نے ایسا پورا پورا حساب کیسے لگا لیا؟" میں نے جیب سے کیلکولیٹر نکال کر کہا "اس پر حساب لگا کر صحیح جواب نکالا ہے۔ اور اگر اس میں تمہارے مائیوں بیٹھنے کے بعد کی اندھی اور اندھیاری یک منٹی ملاقات بھی شامل کر لی جائے تو پھر نو گھنٹے اور کم ہو جاتے ہیں۔" ریحانہ نے بڑے قصائی کی طرف بے پروائی سے دیکھا اور پھر کہنے لگی "اس ساری مدت میں تم نے کیا کای؟"

میں نے کہا " کرنا کیا تھا، بس عمر بڑھائی ہے۔ ایک مکان بنایا ہے۔ دو بچوں کی شادیاں کی ہیں۔ پنشن لی ہے۔ بلڈ پریشر بڑھایا ہے۔ وہ ہارٹ اٹیک لیے ہیں۔ تھوڑی سی ڈائیا بیٹس کرائی ہے۔ ذرا سامو تیا تر وایا ہے، اگلے سال بہار میں آپریشن کراؤں گا۔ اور تو کوئی خاص کام نہیں کیا۔ "

ریحانہ ہنس کر کہنے لگی "تم نے تو پھر بھی چھوٹی سی زندگی میں بڑے کام پنپا لیے، ہم تو وہیں رہ گئے بے قوف کے بے قوف۔ کچھ ہوا ہی نہیں۔ زندگی آگے نکل گئی اور ہم سٹیشن پر ویسے ہی کھڑے رہ گئے۔ کچھ ہو ہی نہیں سکا۔"

قصائی نے کہا "اندر سے ٹب منگوائیں صاحب جی۔"

میں نے کہا "یہیں صف پر ڈھیر کرتے جاؤ، نائی خود آکر بندوبست کر لیں گے"۔ اس نے بہت ہی مری سی اور ڈری سی آواز میں کہا "گوشت زیادہ ہے اور صف چھوٹ ہے۔ آگے آپ کی مرضی"۔ تو میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

جب میں نے ریحانہ سے کہا کہ مجھے اجازت دو کہ میں پھر کھنڈ پر بیٹھ جاؤں اور اپنے آپ کو اجازت دو کہ وہ کرسی پر بیٹھ جائے تو اس نے بڑی سنجیدگی سے شکریہ کہہ کر کرسی پر بیٹھنا منظور کر لیا۔

جب ریحانہ لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی تو وہ نویں میں پڑھتی تھی اور میں سینئر کا طالب علم تھا۔ جب وہ کالج میں داخل ہوئی تو میں بے اے کاسٹوڈنٹ تھا۔ جب وہ "چاٹی ریس" میں اول انعام لے کر گھر آئی تو میں اپنا پہلا مشاعرہ پڑھنے ٹاؤن ہال گیا ہوا تھا۔ جب اگلی صبح اس نے اپنا کپ مجھے دکھایا تو میں نے اس کے ماتھے سے لے کر اس کی ناک کی ٹپ تک اپنی انگلی سے سیدھی لیکر کھینچتے ہوئے کہا "یہ چاٹی ریس، یہ کھیل کھلنڈیاں، یہ جسمانی ورزشیں۔۔۔۔۔ یہ سب ہلکی چیزیں ہیں۔ ذہنی سر بلندیوں کے مقابلے میں بے معنی اور لالچی

مظاہرے ہیں۔۔۔۔۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں، گھائے کے سودے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے کل ٹاؤن ہال میں غزل پڑھی ہے اور پوچھ لو جا کر کسی سے....."

اس نے اپنا کپ میرے قدموں میں رکھ دیا اور شرمندگی سے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی "بھیا نے گھر آ کر بتایا تھا کہ آپ نے تو مشاعرہ لوٹ لیا۔ بڑے سوز سے ترنم کیا۔"

میں نے کہا "بے وقوف لڑکی! وہ خالی ترنم اور خالی سوز ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔ اس میں فکر بھی تھی اور دانش بھی، راہنمائی بھی اور نشان دہی بھی۔"۔۔۔۔۔ ریحانہ اپنی ذات میں خجالت سے پکھل سی گئی اور میری آغوش میں اس طرح سے آگئی جیسے پجاری مٹھی بند ہو کر بھگوان کے آگے سیس نوادیتا ہے۔۔۔۔۔

ریحانہ جس قدر خوب صورت تھی، اسی قدر سادہ لوح اور احمق بھی تھی۔ وہ ہنرمندی سے اور عقل مندی سے زندگی بسر کرنے کی اہل نہیں تھی۔ وہ زندگی کو اپنے اوپر سے ایسے گزرنے دے رہی تھی جیسے زندگی دانش سے یا علم سے یا عقل سے کوئی برتر اور فزوں تر چیز ہو اور اپنی مرضی سے گزرنے کے لئے بنی ہو! ریحانہ کے ساتھ میں، اس کی بات میں، اس کے انداز میں، اس کے بدن میں کوئی ہنر نہ تھا۔ دین سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، دنیا کی اسے کوئی سمجھ نہیں تھی اور وہ بڑے یقین سے نہایت بے قوفی کے ساتھ بے یقین اور بے اعتبار زندگی بسر کر رہی تھی۔

جب ہم نئے نئے ریحانہ لوگوں سے واقف ہوئے تو وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ کندھے پر وہ دو بھاری بھر کم گانٹھیں اٹھا کر جا پانی کپڑا بیچنے والا جب ان کی ڈیورڈھی میں اترتا تو ریحانہ کی ڈیوٹی لگی کہ وہ تھان ڈیورڈھی سے لے لے کر اندر امی اور خالہ کو دکھائے اور تر تیب وار بھاؤ بتائے۔ تین چار چکر کاٹنے کے بعد جب امی نے رنگ دار ساٹن کی قیمت پچھوائی تو ریحانہ نے ڈیورڈھی میں آ کر پھیری والے سے کہا "بھائی آٹھ آنے گز قیمت زیادہ بتلانا، امی ضرور قیمت کم کریں گی۔ مجھے بار بار چکر لگانے پڑیں گے۔ تمہارا بھی نقصان ہوگا" پھیری والا ہنس پڑا اور اس نے خوش ہو کر یہ بات ہم سب کو سنائی۔ میں نے حق اور سچ کی خاطر یہ بات اس کی امی اور ابو کو بتائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ ریحانہ کو صحیح، صاف اور حقیقت سے بھرپور زندگی بسر کرنے کے رموز سمجھائیں ورنہ اس کی ساری عمر مظلومیت اور بے چارگی میں گزرے گی اور اس سے ارتقائے انسانی کا قافلہ آگے نہیں چل سکے گا۔

اس روز ہم سب اپنی حویلی کے پچھواڑے چھوٹے باغ میں کھیل رہے تھے اور ہم کوئی چھوٹے بچے نہیں تھے۔ میں تیرہ غزلیں لکھ چکا تھا اور ریحانہ چائی ریس میں اول انعام حاصل کر چکی تھی۔ اچانک زور کی سیاہ آندھی اٹھی اور سارے میں رات کا سماں ہو گیا۔ آندھی کے ایڈوانس جھونکے پتوں کو بجانے اور حویلی کے دروازے کو ہولے ہولے کھڑکانے لگے۔ ہم سب خوف زدہ سے ہو گئے تو ہماری نوکرانی بیو نے کہا کہ "اگر کوئی پہلوٹھی کی لڑخی اپنی پشت پر ہنہ کر کے اٹھتی آندھی کو دکھا دے تو آندھی رک جاتی ہے اور اس کا رخ مڑ جاتا ہے۔" ہم سب تو بیو کی بات اچھی طرح سے سمجھ گئے لیکن ریحانہ الو کی طرح کھڑی ہمارا منہ تکتی رہی۔ اس نے دو تین مرتبہ بیو سے وضاحت کے ساتھ پوچھا تو بیو کے سارے بیان سے "ڈھوئی" کا لفظ نہ سمجھ سکی۔ جب میں نے بیو کی بات کا ترجمہ کر کے اسے سمجھایا تو وہ شرمائی اور گھبرا کر بو

لی "اس گروہ میں پہلوٹھی کی لڑکی تو صرف میں ہوں، لیکن میں یہ کام سب کے سامنے نہیں کروں گی۔" میری چھوٹی بہن نے کہا "ہائے ریحانہ باجی خدا نہ کرے، سب کے سامنے کیوں! وہ سامنے بابے نورے کا کوٹھا ہے، اس پر چڑھ کر آندھی کو روک دیں۔ سب کے سر سے بلا ٹل جائے گی۔"

بابا نورامالی بھی تھا، سانس بھی۔ لنگر بھی پکالیتا تھا اور گاؤں گاؤں گھوم کر خالص شہد اور گھی بھی جمع کر لیتا تھا۔ اس کے کوٹھے اور کبوتروں کا ڈربہ تھا اور اوپر ہی اس نے تنور لگایا ہوا تھا جس میں وہ کبھی کبھار بچی تیار کر کے ذیلدار کے مہمانوں کو کھلایا کرتا تھا۔ ریحانہ ازار بند ہاتھ میں پکڑے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ کہے جا رہی تھی "ہائے اللہ! خدا کی قسم۔۔۔ میں نے نہیں جانا۔۔۔ اس طرح سے آندھیاں رکی ہیں کبھی۔۔۔۔۔ میں نے واپس اتر آنا ہے آدھی سیڑھیوں سے۔" اور ہم نیچے سے چلائے "نہ۔ اللہ کے واسطے نیچے نہ اترنا۔۔۔۔۔ بڑی زبردست کالی آندھی ہے۔۔۔۔۔ سخت نقصان کر کے جائے گی۔۔۔۔۔ جاؤ شاباش۔۔۔۔۔ جاؤ۔"

میری چھوٹی بہن شرارت سے اونچی آواز میں کہہ رہی تھی "بس باجی آپ کو جانا ہے اور آنا ہے۔۔۔۔۔ کوئی دیر تو نہیں لگانی زیادہ۔"

ریحانہ "نہیں نہیں۔۔۔ ناں ناں" کہتی سیڑھیاں چڑھتی جا رہی تھی اور ہم نیچے اچھل اچھل کرتا لیاں بجا رہے تھے، جیسے عقل مند لوگ احمقوں کو الو بناتے وقت دل ہی دل میں اچھل کرتا لیاں بجا کرتے ہیں۔

اس وقت میں ٹاہلی کے پرانے کھنڈ پر بیٹھا قصائیوں سے گوشت بنوارہا تھا اور ریحانہ میرے سامنے ٹینٹ والوں کی دورنگی نواڑ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی ناک کے دائیں نتھنے پر اب بھی بھورے رنگ کا ستارے جیسا تل تھا جسے اب اصولا مسہ بن جانا چاہئے تھا لیکن وہ نہیں بنا۔ دور سے اب بھی اس کی ناک میں براؤنش گولڈ کلر کا کوکھ نظر آ رہا تھا حالانکہ اس نے ناک بندھوائی ہی تھیں تھی۔

جب اسے مانیوں بیٹھے دوسرا دن تھا تو میں رات کے وقت اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کے بدن سے ہلدی، تیل، چنبیلی، حنا اور نافے کی خوشبو آ رہی تھی۔ ماتھے اور مانگ میں سیب، چندن، کتھے اور بھور کی ملی جلی مہک تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو بڑی زور سے چوما اور پھر رک گئے۔ میں اس کے سامنے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا تھا اور اس نے میری دونوں کلائیاں بڑی مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔ اس کی امی اندھیرے میں دیا سلائی جلاتی اچانک نمودار ہوئیں اور مجھے اس طرح کھڑے دیکھ کر بولیں "اب کیا فائدہ۔۔۔ اب کیا حاصل!" میں گھبرا گیا، لیکن ریحانہ نے میری کلائیاں اس وقت بھی نہ چھوڑیں۔ پھر میں اس کی امی کو ماچس دکھاتے دکھاتے کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔

رخصتی کے وقت دولہا کار کو خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ سیاہ رنگ کی آسٹن گاڑی تھی جس کے بونٹ پر انگریزی کا "اے" کھڑا تھا اور اس کے ساتھ اسی دھات کے پر بنے تھے جو "اے" کو اڑائے لے جاتے تھے۔ گاڑی کے پورج سے نکلنے سے پہلے ریحانہ نے اپنی امی سے میرا نام لے کر کہا کہ وہ نظر نہیں آئے۔ اس کی امی نے اونچی اونچی آوازیں دے کر مجھے بلایا اور میں ڈراڈرا، سہا سہا گاڑی کی کھڑکی کے

پاس آ کر بزرگوں کی طرح کہنے لگا "اچھا ابھی ریحانہ خدا حافظ اور اللہ کے حوالے۔۔۔۔۔ خوش رہنا۔۔۔۔۔ اور اپنا خیال رکھنا۔۔۔۔۔" اس کے شوہر نے بیک ویو مرگھا کر میرا چہرہ اس میں فوکس کیا اور پھر کہا "اب اجازت دیں۔ دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ برالمبا سفر پر پیش ہے۔" اس کے ساتھ بیٹھے اس کے والد نے بھی یہی کہا کہ "لمبا سفر درپیش ہے، زنا نہ ساتھ ہے۔ اب اجازت دیجئے۔" ریحانہ نے اسی طرح سر جھکائے جھکائے آہستہ سے کہا "ایک تو لوگوں کو ہر وقت جلدی پڑ رہتی ہے۔ پتہ نہیں کس بات کی!" پھر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی جیسے وہ نہیں رویا کرتی تھیں۔۔۔۔۔

میں چھو لدا ری کے اندر پرانے کھنڈ پر بیٹھا ہوا قصائیوں سے گوشت بنوار ہاتھا اور ریحانہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی، ریشمی ساڑھی کا پلو تیزی سے اپنی کمر کے ساتھ لپیٹا تو اس میں سے بہت سی فرانسسیسی پرفیوموں کی خوشبو ایک ساتھ اٹھ کر لہر کی طرح پھیلی۔ چھوٹے قصائی نے سراو پر اٹھایا اور پھر پٹھ کی گنڈیریاں کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔

ریحانہ کی شادی ہوئی تو ایک فارن سروس کے نوجوان سے تھی لیکن وہ اپنی بے پناہ خداداد قابلیت سے چند سال کے اندر ہی ایمیسڈ ربن بن گیا۔ پھر ریحانہ کی خبر ضرور آتی رہی لیکن وہ خود نظر نہیں آئی۔ بڑے سال گزر گئے، بڑے زمانے بیتے اور بڑے ملک نکل گئے! پورے انتالیس سال گیارہ مہینے آٹھ دن اور پانچ گھنٹے کے وقفے بعد وہ میرے سامنے ٹینٹ والوں کی نواڑی کرسی پر بیٹھی تھی اور میرے دل کے اندر اس کی محبت ڈٹل واٹر بننے والے بخارات کی طرح قطرہ قطرہ بن کر اتر رہی تھی۔ روح کی ہرنالی سے ٹھنڈے مقطر مصفا قطرے میرے دل پر جھپک جھپک کر اسے دھور ہے تھے اور قلب کے نیچے ہلکے جامنی رنگ کی ایک تلتلی سی جاری تھی۔ میں خوش تھا اور شکر کر رہا تھا کہ ہم دونوں کی شادی نہیں ہو سکی۔

میرے ساتھ رہ کر اس نے بھی ہنرمند، عقل مند اور میری طرح سے زمانہ شناس اور رمز آشنا ہو جانا تھا۔ ہم لکھنے پڑھنے والے ادیب اور شاعر لوگ جس طرح ہر بات کی تہہ کو روپا پہنچ جاتے ہیں، اس نے بھی یہ فن سیکھ لینا تھا۔ ہم کو بھی جس طرح ہر اعلان، ہر بیان اور ہر گفتگو کے پیچھے اس کے اصل محرکات کا علم ہو جاتا ہے اور اصل صورت حال سے واقفیت ہو جاتی ہے، اس کو بھی میرے ساتھ اور میرے ساتھ تھیوں کے ساتھ رہ کر اس علم سے آشنائی ہو جانی تھی۔

اس نے بھی میری انسانیت سے تو محبت شروع کر دینی تھی لیکن لوگوں کو ایک ایک کر کے نکتہ چینی اور غیبت کی ٹھنکی پر کس کر کوڑے برسانے تھے۔۔۔۔۔ لفظ "انسان" سے بے پناہ الفت کرنی تھی اور قریب سے گزرتے ہوئے سچ مچ کے بندے کا دل جلانا اور اس پر گند اچھالنا تھا۔۔۔۔۔ میرے ساتھ رہ رہ کر اس نے جس حویلی کے لان میں بیٹھنا تھا، وہاں کالی سیاہ آندھی کو جھلا کر خود ہی ہر ایک کو ننگا کر دینا تھا۔۔۔۔۔ خدا کا کتنا بڑا کرم ہوا۔۔۔۔۔ کیسی مہربانی ہوئی۔۔۔۔۔

اگر ہم ساتھ ساتھ اور ایک ساتھ رہتے تو ہم کو گھر بیٹھے North Carolina ساؤتھ کوریا، ایسٹرن یورپ اور ویسٹ اور جینیا کی اندرونی خرابیوں کا علم ہوتا۔۔۔۔۔ ہم پورٹوریکسن کانگرس کے پس پردہ عوامل سے واقف ہوتے۔۔۔۔۔ مٹسو بیٹی کے آئندہ سال کے بجٹ سے آشنا ہوتے لیکن ہمیں ایک دوسرے کے کیم کے چاند کو الگ الگ دیکھنے سے آگاہی نہ ہو سکتی۔ اس نے۔۔۔۔۔ اس ریحانہ نے جو

میرے سامنے بیٹھی ہے۔۔۔۔۔ میری جراتوں سے بے پناہ فائدہ اٹھا کر میری طرح سے جری ہو جانا تھا۔ میں نے حق گوئی اور بے باکی کا ساتھ نہیں چھوڑنا تھا۔ کڑوی بات منہ پر کہنی تھی۔ منافقت کے خلاف جہاد کرنا تھا اور اس نے بھی میرے اس وتیرے کو اپنا کیش کرنا تھا۔ ڈاٹمنڈ اورس لیٹر خریدنے تھے، کارز پلاٹ لینے تھے۔ غیر ملکی سفر اختیار کرنے تھے۔ پھر اس نے ویسی نہیں رہنا تھا جن کی گاڑیاں سٹیشن پر کھڑے چھوٹ جاتی ہیں۔ اس نے زندگی سے بھی آگے نکل جانا تھا، اتنا آگے کہ وہاں زندگی کی Gravity بھی ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اس کے ویٹنی باکس میں نقب زنی کا سب سے کارگر اور مہلک اوزار انفارمیشن data Scaling اور Media Dossier ہر وقت موجود ہونا تھا اور اس نے "بنیادی انسانی حقوق" یا "پرامن بقائے باہمی" کے نام پر ہم سب کو چھیل کے، ادھیڑ کے، کاٹ کے، ہلا کے رکھ دینا تھا۔۔۔۔۔ جیسے آب خورے میں جامن ڈال کر کھڑکاتے ہیں، ویسے کھڑکا دینا تھا۔

اگر میری ریحانہ سے شادی ہو جاتی تو اس کے ماتھے اور مانگ سے چندن، کتھے، سیب اور بٹھور کی خوشبو نہیں آتی تھی نہ ہی اس کی ناک کے دائیں نتھنے پر براؤنش گولڈ کلر کا یہ تل رہنا تاہ، لونگ اور ستارے کے کٹاؤ والا۔۔۔۔۔ اس نے بڑھ کر سیاہ مہمہ بن جانا تھا اور اس کے سفید نتھنے سے کالے بیٹل کی طرح چمٹ جانا تھا۔ اچھا ہی ہوا، بلکہ بہت ہی اچھا ہوا۔

اللہ کے کرم اور اس کی مہربانیوں کے انداز نرالے ہیں۔ وہ جس کو انا اور خود پسندی، خود غرضی اور خود فروشی اور خود رائی کے چکر سے بچانا چاہے، صاف بچا کر لے جاتا ہے۔ ایسے لوگ باغ ہستی میں پھول کی طرح کھلتے ہیں۔ دائیں بائیں جھولتے جھومتے ہر ایک کو "ہیلو ہیلو" کہتے کہتے ایک دن خوشبو کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ بڑی شرافت اور خود فراموشی کے ساتھ، ہنسی خوشی، جھومتے جھومتے، گاتے بجاتے۔

میں اتنے سال کی Self-pity اور خواہ مخواہ کی خود ساختہ قربان گاہ سے باہر نکل کر پہلی مرتبہ ریحانہ کی محبت کے نشے میں چور ہو گیا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں اس کی محبت کے افروہ سے عقیدت کے چھوٹے چھوٹے تنکے اور سوکھی پتیوں کے دست بستہ بھورے چورے نکال کر اسے زندگی کے حضور پیش کر رہا تھا۔

پھر میرا دل چاہا کہ میں اس کے ساتھ ایک لمبی بات کروں، لمبی اور نہ ختم ہونے والی بات۔۔۔۔۔ اتنی لمبی کہ ختم ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح جاری رہے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم ویسے کے شروع ہونے تک، ایک رات اور آدھا دن ہم اسی طرح اس مقام پر بیٹھے رہیں اور باتیں کرتے رہیں۔۔۔۔۔ میں نے کہا "ریحانہ تمہاری منجھلی بیٹی کی بڑی دھوم ہے۔ وہ آج کل کہاں ہے؟"

ریحانہ نے قدرے لائق سے کہا "پہلے اس نے انگلستان سے ٹرائی پوس کیا تھا، پھر "برین ڈائز" یونیورسٹی میں چلی گئی۔ آج کل "برکلے" میں کچھ کر رہی ہے۔ مشکل مشکل سے کام ہیں۔ مجھے تو ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کچھ کر رہی ہے۔"

میں نے کہا "بھئی وہ تو ہمارے ملک کی ایک عظیم Mathematician بن کر ابھر رہی ہے اور تم اس سے اتنی بے خبر ہو۔"

اس پر وہ زور زور سے ہنسنے لگی، اتنی زور سے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ہنستے ہنستے بولی "تم کو جو ماسٹر بھو دیال حساب پڑھانے آیا کرتے تھے، وہ اپنی سائیکل کے اگلے پہنے پر پیر رکھ کر بریک لگایا کرتے تھے اور ہر مرتبہ بریک لگاتے وقت ان کی جوتی اتر جایا کرتی تھی

-----"وہ پھر ہنسنے لگی تو میں بھی اس کے ساتھ اس کی ہنسی میں شریک ہو گیا۔ ہم دونوں کو اپنے اپنے اینگل سے ماسٹر بھودیال سائیکل پر بیٹھنے مانس کی عینک لگائے پاؤں سے پہننے کو بریک لگاتے نظر آئے۔ آگے سے چنن کمہار کے گدھے آگئے۔ ادھر ماسٹر بھودیال کے پاؤں سے جوتی نکلی، ادھر وہ سندرسنگھ کی بھوری بھینس پر گرے۔ بھینس خوف زدہ ہو کر ایک دم اٹھی۔ میں اور ریحانہ چوبارے کی کھڑکی میں کھڑے اتنا ہنسے کہ ہنستے ہنستے ایک دوسرے سے چمٹ گئے اور ہم نے اپنی آنکھیں ایک دوسرے کے کندھوں سے پونچھ پونچھ کر خشک کیں۔

ہم دونوں کو اس طرح ہنستے دیکھ کر قصائیوں نے گوشت بنانا چھوڑ دیا اور اپنے اپنے بغدادے بوریوں پر رکھ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ اتنے میں ریحانہ کے شوہر ہزار یکسیلنسی شہباز نصیر دونوں ہاتھوں سے جلدی جلدی تالی بجاتے فیلڈ میں داخل ہوئے اور اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر بولے "بھئی تم یہاں ہو ریحانہ اور میں سارے گھر میں تم کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر عاجز آ گیا ہوں۔ چلو اٹھو۔ جلدی کرو، ورنہ دوکانیں بند ہو جائیں گی"۔ ریحانہ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "آپ خود نہیں چلے جاتے شہباز!"

"کمال ہے بھئی۔ حد ہوگئی" شہباز نے طوطے کی طرح سرگھما کر کہا "کام آپ کا اور جاؤں میں! مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ چلئے اٹھئے جلدی کیجئے۔۔۔۔۔ فوراً"۔ ریحانہ نے اٹھتے ہوئے کہا "ایک تو لوگوں کو ہر وقت جلدی پڑی رہتی ہے، پتہ نہیں کس بات کی"۔ جونہی وہ دونوں فیلڈ سے آؤٹ ہوئے تو بڑے قصائی نے کہا "صاحب جی اب تو بے منگوا دیجئے۔ بوٹی بوٹی الگ ہوگئی ہے۔" دھوکھ۔

Virtual Home
for Real People

قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا

اچھا خاصا رنگارنگ جلوس تھا جس میں بھانت بھانت کے لوگ شامل تھے۔ باقاعدہ باجہ تو نہیں تھا البتہ الغوزے، بانسریاں، گالڑ اور دائیں بائیں دو بڑے ڈھول تھے جن میں سے ایک کی آواز تو خاصی دور تک جاتی تھی۔

اب گاؤں میں تو اتنا بڑا جلوس ہی ہو سکتا ہے کہ لڑکے بالے، مرد عورتیں، گدھے کتورے ملا کر ڈھائی تین سو جاندار اپنی پوری جی داری اور شدھ توجہ کے ساتھ لپکے چلے آتے تھے اور آپس میں گفتگو بھی نہیں کر رہے تھے۔ پھر بھی ماسٹر بعدالودود خوش نہیں تھا اور اس کا چہرہ پھیکے خربوزے کی طرح اندر سے شرمندہ ہو رہا تھا۔ اس نے چہرہ گھما کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کا بیٹا تھا تو جلوس میں لیکن نہیں تھا! ماسٹر عبدود کی تین کنال، گیارہ مرلے اور چھ سرسہی زمین تھی جو شملات سے گز بھر ہٹ کر کھجور والی بستی کا ایک حصہ تھی۔ یہ زمین اس کے دادا کے زمانے سے اسی طرح چلی آرہی تھی جس میں ماسٹر عبدالودود کے ابا کو ایک چھوٹا سا پکا گھر بنانا تھا۔ جب ابا سے گھر نہ بن سکا تو اس نے یہ زمین اپنے بیٹے ودود کے نام چھوڑ دی جس کو ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ اس پر تین مرلے کا گھر بنا کر باقی مہمن پرندوں کے لیے چھوڑ دے اور ہو سکے تو ٹاہلی میں کبے اور آنخورے کا باندھ کر طوطوں اور شارکوں کے مسکن بنادے۔ ماسٹر عبدالودود کے خانوادے کو گھر بنانے کا اتنا شوق تھا کہ تین پیڑھی سے یہ زمین اسی طرح خالی چلی آرہی تھی اور اب ماسٹر عبدالودود نے اپنے بیٹے شاہ مراد کو کہہ دیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر اور پڑھ لکھ کر اس موروثی زمین پر ایک گھر ضرور بنائے اور کسی کمرے میں پانی کی بڑ بوتل لڑکا کر اس میں منی پلانٹ بھی ضرور لگائے کیونکہ منی پلانٹ لگنے سے متوسط طبقے کا گھر بھی کلیان ٹھاٹھ کا گھر ہو جاتا ہے اور لوگ اپنے دل کی خوشی سے اس گھر انے کی عزت کرنے لگ جاتے ہیں۔

جب ماسٹر عبدالودود گاؤں کے پرائمری سکول سے ہیڈ مدرس کے طور پر ریٹائر ہوا تو اس نے اپنی کمیوٹ کی ہوئی پنشن سے خاندانی زمین کے گردا گرد گز بھرا اونچی دیوار اٹھوالی اور خود قلندروں کے ڈیرے پر جا کر نیم کا ڈالا پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ جس روز اس نے ڈیرے پر بھنگ کا پہلا پیالہ پیامین اسی دن دوپہر کے وقت ماسٹر عبدالودود کی بیوی نے اپنے بیٹے شاہ مراد کو سکول لے جا کر کچی جماعت میں داخل کرایا۔ اور جس روز قلندر حاتم شاہ نے ماسٹر عبدالودود کو مراقبہ موت کرایا، ماسٹر ودود بڑا چھوڑ کر مسجد میں داخل ہو گیا اور مولوی صاحب کی غیر موجودگی

دگی میں جماعت بھی کرانے لگا۔

ماسٹر عبدالودود ازل سے ایک آزاد منش انسان تھا اور آزادی سے بڑھت کرنا تھا۔ دراصل آزادی کی الرجی اس کے خاندان میں گردش کرتی تھی اور اس کے ددھیال کے سارے بزرگ اسی آزادی کے ہاتھوں فوت ہوئے تھے۔ ان کو پرندوں سے اور ہواؤں سے اور گھٹاؤں سے بڑا پیار تھا اور وہ ہر وقت منہ اٹھائے انہی کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ وہ زندگی اور موت دونوں مجبوریوں کے درمیان آزاد رہنے کی کوشش میں اپنا آپ ہلکان کر کے فوت ہوتے تھے اور خوش رہتے تھے کہ ان پڑھ اور جاہل ہونے کے باوصف انہوں نے اپنی ساری زندگی آزادی کے ساتھ گزاری اور آزاد رہنے کے باوجود کبھی بے باک نہیں ہوئے۔

ماسٹر صاحب کے ساتھ اچانک ایک ایسا حادثہ گزرا کہ انہوں نے باقاعدگی کے ساتھ مسجد جانا چھوڑ دیا اور کچھری جانا شروع کر دیا۔ چودھری غفنفر نے ماسٹر عبدالودود کی تین کنال، گیارہ مرلے چھ سرساری زمین مع ڈھائی کنال زمین شملات دیہہ ہذا کے اپنے قبضے میں کر لی اور اس پر اپنے جانوروں کے لیے کچا طویلہ تعمیر کر لیا۔ چودھری صاحب کی مخالف پارٹی نورے بگے گجر نے ماسٹر عبدالودود سے چودھری غفنفر پر مقدمہ کروادیا اور کورٹ فیس اور محتانہ وکیل اپنے پلے سے ادا کر کے مقدمہ مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔

ماسٹر عبدالودود ہفتہ میں ایک دن تو اپنے وکیل کے ساتھ کچھری میں گزارتے تھے اور ایک دن مختلف درگاہوں پر منت کے دھاگے باندھ کر اور یہ کہہ کر بتاتے تھے کہ اگر مقدمہ جیت گیا اور زمین مجھے واپس مل گئی تو آدھی زمین درگاہ کے نام وقف کر دوں گا۔ چودھری غفنفر کے آدمیوں نے ڈانگ سونا کھڑکا کے ماسٹر صاحب کو یرکانے کی کوشش کی تو وہ اور مضبوط ہو گئے اور اپنے ایک پرانے شاگرد کی مدد سے جواب نائب تحصیل دار ہو گیا تھا، پستول کا پکالا سنسن بنا کر لے آئے۔ چودھری غفنفر نے اپنے آدمیوں کو خبردار کر دیا کہ ماسٹرودود کے سامنے سے آئے تو کنی کاٹ جایا کرو۔ اس کے پاس بھرا ہوا پستول ہوتا ہے، کوئی حرج مرج ہو گیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوگا۔

اور پھر ہوا یوں کہ ڈیڑھ برس کچی پکی تاریخیں بھگتنے کے بعد ماسٹر عبدالودود مقدمہ ہار گیا اور چودھری غفنفر نے ڈنگے پر چوٹ لگوا کر شام کو بھنگڑا نچوایا۔ ماسٹر عبدالودود اینڈ پارٹی نے دوسرا وکیل کر کے سیشن کورٹ میں اپیل کر دی اور نئے وکیل نے پہلی ہی پشی پر چودھری غفنفر کے وکیل کے چھکے چھڑوا دیئے۔

جب دو سال گیارہ مہینے کیس سیشن میں پھنسا رہا تو ماسٹر عبدالودود رچ ہو گیا اور اس نے اخباروں میں ایڈیٹر کے نام خط لکھنے شروع کر دیئے۔ کورٹ کی غلامی، وکیلوں کی اردل اور ریڈروں کی چاکری نے ماسٹر صاحب کے گرد دیواریں چننا شروع کر دیں۔ پھر آئے دن کے سفر، ایڈیٹر کے نام مراسلے، کاغذات کی نقلیں، فوٹو سٹیٹ کی مجبوری، ٹکٹ چلوانے کی چاکری، کچھری میں کھڑے رہنے کی ذلت، بیٹھنے کی پابندی، رکشا والوں کی خوشامد، سپاہیوں کی سیٹیاں، ناقابل عبور چوڑی سڑکیں، روکنے والی سرخ بتیاں، پابندیاں ہی پابندیاں، رکاوٹیں ہی رکاوٹیں، مجبوریاں ہی مجبوریاں، بے اختیاریاں، بے بسیاں۔ ماسٹرودود نے سامنے کچھری کے نلکے کو دیکھا جس کی ٹونٹی پر چڑیا آکر بیٹھی، پانی تین چار قطرے اند کھینچ کر پھر سے اڑی اور سامنے اتھ کمشنر کے چھپر پر جا بیٹھی۔ وہاں سے اڑی تو منڈیرا اور وہاں سے ابھری تو سیشن جج کے کمرے کی مٹی پر، حالانکہ اندر جج صاحب مقدمے کی سماعت کر رہے تھے اور دونوں وکیل "جی جناب عالی""جی جناب عالی

"کی درت لے میں بندھے دست بستہ سے کھڑے تھے۔ چڑیا نے سوچا چلو کہیں اور چلتے ہیں تو وہ سیشن جج کی مٹی سے اڑ کر ایک پرانی ٹوٹی ہوئی اینٹ پر جا کر بیٹھی جو گندی نالی کے پاس پڑ تھی۔ ماسٹر عبدالودود نے خوش ہو کر کہا "واہ بھئی چڑیا، واہ! مزا آیا ناں تیری آزاد پروازی کا۔"

ایک پیشی پر جب ماسٹر عبدالودود کے وکیل نے سیشن جج کو قائل کر لیا کہ اس کا موکل تین کنال، گیارہ مرلے اور چھ سرساہی کا بلاشر کت غیر مالک ہے اور وہ اس کے رکھنے، فروخت کرنے، ہبہ کرنے، تعمیر کرنے، گفٹ کرنے، دان کرنے، کھودنے، ٹیلہ یا تالاب بنانے کا پورا پورا حق رکھتا ہے اور کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ میرے موکل کے ذاتی پیدائشی حق میں کسی قسم کا بھی دخل دے تو عدالت نے وکیل کے سارے دلائل جوں کے توں کلام تسلیم کر لیے اور انگریزی سٹینو اور اردو نشی کو دونوں زبانوں میں لکھا دیئے۔ جب عدالت نے فیصلے کی اگلی اور آخری تاریخ دینے کے لیے ماسٹر عبدالودود سے پوچھا تو وہ ٹرانس میں چلا گیا اور سیشن جج کے عین اوپر مٹی پر جا بیٹھا۔ نائب کورٹ نے اسے اپنی کرخت آواز سے جھنجھوڑا تو ماسٹر ودود نے ہکلا کر کہا "جناب میں اس زمین سے دست بردار ہوتا ہوں اور بھری عدالت میں حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ میرا اس نام نہاد موروثی زمین سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تحریری طور پر عدالت کی خدمت اقدس میں عرض کرتا ہوں کہ یہ زمین چودھری غنفر صاحب کی ہے اور اگر اب تک ان کی نہیں تھی تو اب ہوئی، ہمیشہ کے لئے ہوئی اور ان کے خاندان کی جائیداد کا ایک جائز حصہ ٹھہری۔ مبارک ہو!"

عدالت میں کوئی ساڑھے سات سیکنڈ تک سناٹا رہا کیونکہ اتنے معمولی انسان کے ایسی مختصر سی زمین چھوڑنے پر زیادہ سے زیادہ اس قدر سناٹا ہو سکتا ہے۔ پھر عدالت نے مسکرا کر ماسٹر صاحب کے وکیل کی طرف دیکھا اور وکیل مخالف سے کہا "آپ ماسٹر صاحب سے مل کر فیصلہ کر لیں۔" وکیل مخالف "یس سر" کرتا ماسٹر عبدالودود کی طرف پکا اور ان کو چھٹی ڈال کر اپنے چھپرے تلے لے گیا۔ کل تین دستخطوں یعنی ایک پورے اور دو "انی شلوں" میں سارا معاملہ نمٹ گیا۔ چودھری غنفر نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا "ماسٹر جی ہم انشاء اللہ تعالیٰ کبھی آپ کے کام آئیں گے۔"

ماسٹر ودود نے کہا "میں نے تو اپنے دل کی خوشی سے یہ سودا کیا ہے، اپنی آزادی کی خاطر۔۔۔۔۔ آپ میرے کام کس طرح سے آئیں گے؟"

چودھری غنفر نے کھسیانی مونچھوں کے نیچے سے شرمندہ سا جملہ باہر کو کھینچ کر کہا "اوجی انسان انسان جو ہوا۔ آخر بھائی کے کام آتا ہی ہے ناں۔"

ماسٹر جی نے کہا "چودھری صاحب میں نے نہ تو یہ کام انسانیت کے لیے کیا ہے اور نہ ہی بھائی چارے کی نیت سے۔ میں نے تو اپنی آزادی کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ تو میری آزادی کا اعلان ہے۔ یہ آپ پر یا کسی اور پر کوئی احسان نہیں ہے۔ میں آزاد زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں اور اپنی مرضی کے فیصلے کرنا چاہتا ہوں۔"

چودھری غنفر کے وکیل نے چودھری صاحب کو آنکھ مار کر اگلا فقرہ بولنے سے روک دیا اور ماسٹر صاحب سے پوچھنے لگا "ماسٹر

صاحب اس مرتبہ آپ کی پنشن بھی بڑھی یا نہیں؟"

ماسٹر صاحب کی آنکھیں فخر سے چمک اٹھیں اور انہوں نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا "کیوں نہیں جناب، گیارہ سے تیرہ روپے تک بڑھی ہیں۔ سرکار نے اعلان کر دیا ہے اخباروں میں۔"

اس پیشی سے واپسی پر چودھری غنفر کی مخالف جماعت نورے بگے گجر پارتی نے ماسٹر عبدالودود کو گوؤں سے تین میل پہلے ہی اچک لیا اور اس کو پرانی تھیمہ والی ڈاٹ کے کوٹھے میں لے گئے۔ پہلے تو انہوں نے ماسٹر کو ہوروں اور مکوں سے دھنکا۔ پھر ڈھیلا چماتا مار کے اس کو بڑے پتھر پر بٹھا کر پوچھنے لگے "اوائے کتے آنشیا۔ ماں بھین بگیا۔ تیرے منہ میں ہاتھی کا برج نوٹ! اوائے تجھے کیا ضرورت پڑی تھی بھری عدالت میں بکواس کرنے کی۔" منشی عبدالودود نے حیران ہو کر اپنی کہنی کو دیکھا، پھر اسے اپنی ران پر شلواری سے رگڑ کر پونچھا اور کہنے لگا "بھاجی! میں نے زمین کو بھی آزاد کر دیا اور چودھری غنفر کو بھی۔" بڑا بوجھ تھا ان دونوں کا میرے اوپر۔ اور پھر میں خود بھی آزاد ہو گیا۔

"اوائے جھڈوا" بورے نے اس کے سر پر ٹھاپ مار کر کہا "وہ تیرا حق تھا۔۔۔۔۔ پیدائشی، موروثی حق۔۔۔۔۔ خاندانی حق۔۔۔۔۔ اس کو کیوں چھوڑ دیا؟"

ماسٹر ودود نے خوش ہو کر کہا "اور عدالت نے میرا موروثی حق تسلیم کر لیا تھا۔"

"اگلی پیشی پر فیصلہ ہو جانا تھا تیرے حق میں بل بتوریا۔ سٹینو نے تو ٹائپ بھی کر لیا تھا فیصلہ۔"

"اگلی پر کیوں" ماسٹر ودود نے چمک کر کہا "عدالت نے اسی تاریخ پر اقرار کر لیا تھا کہ یہ زمین میرا حق ہے اور جب تک یہ زمین باقی ہے، یہ میرا ہی حق ہے۔۔۔۔۔ میری ہی جائیداد ہے۔"

"پھیر" نورے بگے نے اس کے بازو پر ڈانگ مار کر کہا "پھر تجھے کیا موت پڑ گئی تھی اپنا حق چھوڑنے کی۔"

ڈانگ کی چوٹ سے زیادہ اس ذلت اور اہانت پر ماسٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے دل کڑا کر کہا "میرا حق میرا اپنا ہے۔ میں اس کو جس طرح چاہوں استعمال کروں۔ جس کو چاہوں ٹرانسفر کروں۔ جس کو چاہوں دے دوں۔ جب چاہوں دے دوں۔ اس معاملے میں بھی آزاد ہوں۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور کوئی مجھے نہیں کر سکتا۔"

بورے نے ماسٹر کے سر پر ایک اور ٹھاپ ماری۔

ماسٹر صاحب نے بلبلا کر کہا "اپنے حق کے معاملے میں پورا آزاد ہوں۔ میں چاہوں تو اپنا حق لوں۔ چاہوں تو چھوڑ دوں۔ کوئی مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔ میں ایک آزاد انسان ہوں۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ میں صاحب اختیار ہوں۔ تم مجھے مجبور کرنے والے کون ہو!"

جب بورے نے اپنا کپڑا پھر ایک بار اوپر اٹھایا تو نورے بگے نے اسے روک کر بڑی محبت سے کہا "دیکھ ماسٹر تو سیانا آدمی ہے اور سکول بڑھا چکا ہے۔ حق ہمیشہ مانگنے کے لئے اور منوانے کے لئے ہوتا ہے، چھوڑنے کے لئے نہیں ہوتا۔" ماسٹر نے نفی میں سر ہلایا تو

بورے بگے نے پچکار کر کہا "تو نے آج تک دنیا کے کسی شخص کو، کسی قوم کو، کسی ملک کو اپنا حق چھوڑتے ہوئے دیکھا ہے۔۔۔۔۔۔ اپنی مرضی ہے؟"

ماسٹر دود نے کہا "میں دنیا کو نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے ذلتوں کے مارے مجبور لوگوں کی زندگی پسند ہے۔ میں آزاد ہوں اور اپنے حق پر کسی اور کا قبضہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ میرا حق میرا ہے۔ میں اسے رکھوں، چھوڑ دوں، ہبہ کر دوں، گفٹ کر دوں، خیرات کر دوں۔۔۔۔ کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ نہ میں کسی کا حق مارتا ہوں نہ کسی اور کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ آکر میرا حق مارے۔۔۔۔۔۔ سارے کا سارا، آدھا بچا دھا، توڑ توڑ کر یا ایک ہی بار۔ میرا حق میرا ہے، میں اسے جس طرح چاہوں استعمال کروں۔"

نورے بہت ہی طاقت ور انسان ہوں جو اپنے حق کو اپنی مرضی سے استعمال کر رہا ہوں، لوگوں کے کہنے یا ان کے مجبور کرنے کے مطابق نہیں۔ "ماسٹر دود نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا "میں اتنا آزاد ہوں کہ اپنا حق رکھنا چاہوں تو رکھ سکتا ہوں، چھوڑنا چاہوں تو چھوڑ سکتا ہوں۔ تم لوگ کتنے مجبور، کس قدر بے بس اور اپنے اپنے حقوق کے کیسے کیسے غلام ہو کہ اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ تم سے زیادہ تو تمہارے حق طاقت ور ہیں جنہوں نے تم کو غلام بنا رکھا ہے اور جو قدم قدم پر تمہاری گردنیں مروڑ کر تمہارا حرام مغز توڑ سکتے ہیں۔ تم وہ مردود و مقہور لوگ ہو جنہیں حق کے پیر نے اپنے شکنجے میں جکڑ کر رسہ گیری پر لگا رکھا ہے۔ تم لوگ آزاد نہیں ہو۔۔۔۔۔۔ حق کے خرابکار ہو، حق کے مٹی ڈھویئے ہو۔ تم اپنے آپ کو بڑے چودھری سمجھتے ہو لیکن تم دو لے شہ کی پہیاں ہو جن کو حق کے قلندر نے درگا ہوں پر بھیگ مانگنے کے لئے پال رکھا ہے۔" ماسٹر دود نے ان کے چہروں کو غور سے دیکھا اور پھر کہا "خدا کی قسم میں نے تم سے زیادہ کمزور، دیتل اور ڈرپوک انسان اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھے۔ تمہارے حقوق تمہیں ہر وقت خواہش کی ٹنگلی پر باندھ کر ضرب شلاق کرتے ہیں اور تم ان کے آگے چوں نہیں کرتے، ہی نہیں کرتے۔ میں ایک آزاد انسان ہوں، ہوا کا جھونکا ہوں، بادل کا ٹکڑا ہوں۔ میں پھیل بھی سکتا ہوں، سکڑ بھی سکتا ہوں۔ چاہوں تو بھورا شیر بن جاؤں اور چاہوں تو شفق رنگ غزال بن جاؤں۔ جھپٹ بھی سکتا ہوں، خالی دے کر نکل بھی سکتا ہوں۔ میں بادل ہوں۔ چاہوں تو برسوں، نہ چاہوں تو ایسے ہی گزر جاؤں۔ میں آزاد ہوں۔ کوئی مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔"

دلبر شاہ، ریٹائرڈ آرٹسٹ نسیبی نیٹر جواب تک خاموش بیٹھا تھا، آہستگی سے اٹھا اور ماسٹر عبدالودود کے پاس اس کے قدموں میں جا بیٹھا۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر کہا "ماسٹر جی آپ سمجھ دار آدمی ہیں اور ہم سے بہت زیادہ جانتے ہیں اور آپ کے سامنے بات کرنا لقمان حکیم سے بات کرنا ہے لیکن میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حقوق اللہ تعالیٰ نے بنائے ہی اس لئے ہیں کہ انہیں مضبوطی سے تھام کر رکھا جائے اور کسی کو ان کے نزدیک نہ آنے دیا جائے۔ اس قادر مطلق اور ضائع عظیم نے حقوق اسی لئے وضع فرمائے ہیں کہ اپنی زندگی میں ان میں اضافہ کیا جائے اور کسی حق کے ساقط ہونے یا کمزور پڑنے سے پہلے ہی اس کی طلب کے لئے جدوجہد شروع کر دی جائے۔ آپ تو صاحب علم اور صاحب درس و تدریس ہیں اور ہم جاہلوں سے بہتر ہیں کہ رائٹس مانگنے کے لئے ہوتے ہیں، چھوڑنے کے لئے نہیں۔"

ماسٹر عبدالودود نے کہا "دلبر شاہ صاحب! مجھے! اچھی طرح سے معلوم ہے کہ بے شک رائٹس مانگنے کے لیے ہوتے ہیں اور ہر شخص

کورائٹس مانگنے کا پورا پورا حق ہے لیکن اگر کوئی اپنا حق چھوڑنا چاہے تو اس کو اتنی آزادی تو ہونی چاہئے کہ وہ اسے چھوڑ سکے اور بلا جبر و اکراہ چھوڑ سکے۔ اس پر یہ پابندی تو نہیں ہونی چاہئے۔۔۔۔۔"

لیکن ماسٹر صاحب کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے دلبر شاہ ریٹائرڈ آرٹسٹل انسیسٹی نیتراپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے پرانے محکمے کی کارکر دگی والی ایک بڑی سے گالی دے کر ماسٹر صاحب کا فقرہ کاٹ گیا۔

پھر انہوں نے ماسٹر عبدالودود کے سامنے اس کے جائز حقوق واپس دلانے اور اس کی حماقت کا ازالہ کرنے کے لیے ایک شامپ پیپر رکھا لیکن ماسٹر صاحب نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

اچھا خاصہ رنگارنگ جلوس تھا جس میں بھانت بھانت کے لوگ شامل تھے۔۔۔۔ لڑکے بالے، مرد عورتیں، گدھے کتورے ملا کر ڈھائی تین سو جاندار ہوں گے پھر بھی ماسٹر عبدالودود خوش نہیں تھا۔۔۔۔ اس نے اپنا کالک لگا ہوا چہرہ گھما کر اپنے بیٹے شاہ مراد کی طرف دیکھا جو تیسری جماعت میں پڑھتا تھا اور اس جلوس کے ساتھ ساتھ کنارے کنارے چل رہا تھا۔ شاہ مراد تھا تو جلوس میں لیکن نہیں تھا۔ ماسٹر عبدالودود اپنے بیٹے کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب کچھ ایک احمق چڑیا کی بدولت ہوا جو پہلے تو اپنی مرضی سے نلکے کی ٹونٹی سے لٹک کر پانی کے منے نگلتی رہی۔ پھر اتھ کشنر کے چھپر پر جا بیٹھی۔ وہاں سے اڑ کر عدالت کی مٹی پر پہنچ گئی۔ اور پھر وہاں سے ڈائیو لگا کر گندی اینٹ پر بیٹھ کر موری کے کیڑوں کو دیکھنے لگی۔ لیکن بگے نورے پارٹی کے لوگ منہ کے کالے والے ماسٹر ودود کو گدھے سے اتارنے نہیں دیتے تھے اور چھوٹے شاہ مراد کو جلوس سے بھاگنے نہیں دیتے تھے کہ اس کو بھی عبرت ہو اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنی مرضی سے اپنا جائزہ اور پیدائشی حق چھوڑنے والا نہ بن جائے۔ گدھے پر بیٹھا ہوا ماسٹر عبدالودود اپنے بے بس اور مجبور بیٹے کو بار بار گردن گھما کر اس لئے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی گردن میں پرانے کھوسٹروں اور سوکھے لٹڑوں کے کئی ہار تھے جن میں اس کی ٹھوڑی ڈوبی ہوئی تھی۔

کہتے ہیں جب تک جلوس چلتا رہا، شاہ مراد روتا ہی رہا۔ ماؤں کو اپنے بیٹوں سے پیار ہوتا ہے اور بیٹوں کو ہمیشہ اپنے اباے پیارے ہوتے ہیں۔ شاہ مراد آدھی رات کو سسکیاں بھرتا ہوا چپ چاپ گاؤں سے نکل گیا۔

ماسٹر عبدالودود نے سارے اردو اخباروں میں مع شاہ مراد کی تصویر کے اشتہار دیا لیکن اس کا کوئی اثر آٹار نہ ملا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاہ مراد کو خراہوں نے پکڑ لیا ہے۔ چند ایک کو یقین ہے کہ وہ دولے شاہ کی پہیوں کے ساتھ درگا ہوں پر بھیک مانگتا ہو گا۔ کئی پرانے کسان سمجھتے ہیں کہ وہ کسی بڑے جاگیردار کے ڈیرے پر ہیڈر سہ گیر ہوگا۔ لیکن اب جبکہ اس واقعے کو اکتین سال گزر چکے ہیں، میں سوچتا ہوں کہ شاہ مراد خوش ہو گیا یا اب بھی رورہا ہوگا کہ اس کے باپ نے آزادی فکر کا اظہار عملی میں کیوں کیا اور اگر کیا تو اس طرح سے کیوں کیا!

مہمان عزیز

شفقت صاحب کو ہمارے گھر رہتے پچاس سال سے اوپر کا عرصہ گزر گیا ہے لیکن ہم نے آج تک ان سے اپنا گھر چھوڑنے کو نہیں کہا، نہ اشارتاً نہ کنایتاً۔ اندر سے ہم سب ان کی حرکتوں سے اور ان کی موجودگی سے نالاں ہیں لیکن ان کے منہ پر اس کا اظہار نہیں کر سکے۔ ہم میں سے کسی کی یہ جرات نہیں کہ ان سے اتنا پوچھ سکیں کہ ابھی وہ اور کب تک ہماری زندگیوں پر سوار رہیں گے! اول اول میری بیوی نے حوصلہ کر کے چند استفہامیہ فقرے ان کے سامنے بولے تھے مگر بعد میں وہ بھی صبر شکر کر کے ہم لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ اب وہ کہتی ہیں کہ شفقت صاحب ہمارے جزو زندگی نہیں رہے بلکہ جزو بدن ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کو گھر سے نکالنا گویا اپنے کسی عضو رنیں کو خود کاٹ کر اپنے بدن سے علیحدہ کرنا ہوگا۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ وہ رہتے جائیں اور ہم سہتے جائیں۔

ہمارے گھر والوں کا خیال ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد شفقت صاحب کو اس گھر سے نکالنے میں جان کا خطرہ بھی ہے اور ایمان کا بھی، ساتھ ساتھ معاشی اور معاشرتی الجھنوں کے بڑھ جانے کا اندیشہ بھی ہے۔ پھر اتنے لوگوں نے اتنے سال سے شفقت صاحب کو ہمارے گھر رہتے دیکھ لیا ہے کہ وہ انہیں ہمارے گھر کا ایک اہم فرد سمجھنے لگے ہیں۔ بہت سے لوگ تو یہ خیال کرتے ہیں کہ اصل میں یہ گھرانہ کا گھر ہے اور ہم لوگ اس میں طفیلی مہمانوں کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

شفقت صاحب کو ہمارے گھر پر مسلط کرنے کا کام میرے ابا جی نے کیا۔ انہی کا حکم تھا کہ شفقت کو اپنے گھر پر رکھو، اب بھی اور میرے بعد بھی۔ اس کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم اپنوں کے ساتھ رو رکھتے ہو، اپنوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ وہ سلوک جو تم اپنی ذات کے ساتھ کرتے ہو۔ جس طرح سے اپنی ذات کو نیست کر رکھتے ہو، اسی طرح سے شفقت کو سنبھال کے رکھو۔ ریشم کے کوئے میں، روئی کے پھوے میں!

اگلے زمانے کے بزرگ بعض اوقات ایسے بے ہودہ فیصلے کر جاتے تھے کہ بعد کو آنے والی نسلیں ساری عمران کا خمیازہ بھگتی رہتی تھیں اور فیصلوں کی ٹیڑھ سیدھی نہیں ہو پاتی تھی۔ میرے ابا جی نے پتہ نہیں کس کمزور لمحے میں یہ جذباتی فیصلہ کر دیا کہ شفقت ہمیشہ کے لئے ہمارے گھر میں رہے گا اور اس کی دیکھ ریکھ کی ساری ذمہ داری ہماری ہوگی اور میں نے بھی پتہ نہیں کیوں سر جھکا کر ابا جی کے اس عاقبت نا

اندیش حکم کو مان لیا کہ اگر کہیں آج میرا بس چلے----- تو میں----- ایک مرتبہ----- لیکن میرا بس کیوں چلے اور کس طرح چلے اور کس پر چلے----- کہ میں تو ایک معمولی حیثیت کا بندھا ہوا بندہ ہوں اور میرے سامنے کے سارے راستے مسدود ہو گئے ہیں اور وقت بہت زیادہ گزر گیا ہے!

شفقت میں خدا نخواستہ کوئی ایسی خرابی نہیں جس کو چمٹی سے پکڑ کر خرد بین کے نیچے رکھا جاسکے اور اس میں خوف ناک بیکٹیریا کی علامتیں ڈھونڈی جاسکیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بات صرف اتنی ہے۔۔۔۔ اور وہ بھی سیدھی سی بات کہ اس کا مزاج اور اس کی شخصیت اور اس کی ساری نفسیات ہم سے مختلف ہے اور روزمرہ زندگی میں اس کی سوچ ہماری سوچ سے نہیں ملتی۔ اس کو بتایا جاسکتا ہے، سمجھایا جاسکتا ہے، ٹو کا جاسکتا ہے، روکا جاسکتا ہے لیکن اس کو اس کے ذاتی راستے سے ہٹا کر اپنی راہ پر نہیں لگایا جاسکتا۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر شفقت صاحب برف توڑنے کا سوالے کر باہر نکلے اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر بتیس گاڑیوں کے ٹائر پتھر کر کے واپس گھر آ کر سو گئے۔ شام کے وقت کھانے کے لئے اٹھے۔ صبح کا باسی اخبار دوبارہ پڑھا۔ اپنی پسند کی سیاسی پارٹی کو تین چار گندی گندی گالیاں دیں اور پھر سو گئے۔ میری بیوی نے سوئے کی تلاش میں جب گھر کا کونہ کونہ چھان مارا اور سوا شفقت صاحب کی رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی کتابوں کے اندر سے برآمد ہوا تو انہوں نے سارا راز طشت از بام کر دیا کہ میں تو اپنی چٹھی پوسٹ کرنے ڈاک خانے پیدل جاتا ہوں اور لوگوں کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں ہیں۔ مجھے لوگوں کا بلا مقصد گاڑیوں پر گھومتے پھرنا اچھا نہیں لگتا تھا اس لئے میں نے ان کے ٹائروں میں سوا بھونک دیا۔ دراصل شفقت صاحب یہ سوا ان کے دلوں میں بھونکنا چاہتے تھے مگر وہ اپنی گاڑیوں میں موجود نہیں تھے۔ صرف گاڑیاں سڑک کنارے کھڑی تھیں اور اپنی حفاظت کرنے کے ناقابل تھیں۔

کچھ لوگوں کو شفقت صاحب کی اس حرکت کا علم ہو گیا تو وہ شکایت لے کر میرے پاس آئے۔ گھر کے دروازے پر ایک بلوے کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ میں نے لوگوں کو رام کرنے کی کوشش کی تو شفقت صاحب اندر سے باہر آ گئے اور سینہ تان کر بولے کہ ہاں میں نے کیا ہے یہ سب کچھ۔ کیا بھی سوچ سمجھ کر ہے۔ اب کر لو کیا کرنا ہے اور بگاڑ لو جو بگاڑنا ہے۔ اس پر جو میرے ساتھ گزری ہوگی اس کا اندازہ آپ عقلی طور پر تو لگا سکتے ہیں، مالی اور بدنی طور پر نہیں۔

میری بیوی کا رویہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ وہ شفقت صاحب سے ناراض بھی رہتی ہے اور گھلی ملی بھی۔ چاہتی ہے کہ شفقت صاحب اس گھر سے چلے جائیں اور ہم کو آزاد چھوڑ دیں لیکن خواہش یہ بھی رکھتی ہے کہ شفقت صاحب کا سائبان ہمیشہ اس کے سر پر تیار ہے اور وہ ان کے سایہ عاطفت میں زندگی کو طویل تر کرتی جائے۔

شفقت صاحب نے میری اجازت کے بغیر ہمارے محکمے کے ایک ٹھیکیدار سے آٹھ ہزار روپے تحفہ لے کر میری بیوی کے لئے ایک سیٹ بندے خرید لئے۔ شام کو گھر لا کر اپنے ہاتھ سے اس کے کانوں میں پہنائے اور دوڑ کھڑے ہو کر کہا "بھئی میں نے آج تک رضیہ کے لئے کوئی تحفہ ہی نہیں خریدا اور ساری عمر یونہی بتادی۔ آج ابتدا ہو گئی ہے، اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔" رضیہ، جو آج تک ہر پہلی کی پہلی مجھ سے حاصل کر کے ہوئی ہے۔ محکمے کے لوگوں میں میری بابت یہ بات مشہور ہونے لگی ہے کہ میں نے بھی رشوت لینا شروع

کردی ہے اور بڑے طریقے کے ساتھ اس کا ڈول ڈال دیا ہے۔

چاروں طرف کی چہ میگوئیوں میں گھرنے کے باوصف میں شفقت صاحب کو کھڑے کھڑے گھر سے نہیں نکال سکا، صرف ان کے ساتھ بول چال بند کردی ہے۔ جب وہ اپنے کمرے سے برآمد ہوتے ہیں تو میں گھر سے باہر نکل جاتا ہوں۔

جب ماموں سراج پنجاب اسمبلی کی سیٹ کے لئے کھڑے ہوئے تو ہم نے ان کی کمپین کے لئے دن رات ایک کر دیا۔ آخری مہینے میں میں نے اپنے دفتر سے ایک ماہ کی چھٹ لے لی۔ شفقت صاحب نے بھی اپنے محکمے سے ایک مہینے کی چھٹی کر لی اور میرے ساتھ مل کر دن رات ایک جیسا کام کیا۔ ہم دونوں نے پوری پوری رات جاگ کر ووٹروں کو گشتی مراسلے روانہ کئے۔ سراج ماموں کی تقریروں کے مسودے تیار کئے۔ ان کے لئے موقع محل تاڑ کے تقریر کا رزڈھونڈے اور وہاں چھو داریاں نصب کروائیں۔ انتخابی لسٹوں میں ووٹروں کے نام اور نمبر ڈھونڈ کر ان کی پرچیاں بنائیں اور جب ووٹ ڈالنے کا دن آیا تو شفقت صاحب مخالف امیدوار کو ووٹ ڈال کر گھر آ گئے۔ شام کے وقت جب ووٹوں کی گنتی ہوئی اور ماموں سراج بری طرح سے ہار گئے تو پتہ چلا کہ شفقت صاحب نے نہ صرف اپنا ووٹ

مخالف امیدوار کے حق میں دیا تھا بلکہ متعلقہ حلقے کی ایک پوری برادری ماموں سراج کے مخالف بھگتا دی تھی۔ رضیہ کو ان کے اس فعل پر جہاں سخت حیرانی ہوئی وہاں اسے ہنسی بھی آئی اور بار بار آئی۔ اس نے ہر مرتبہ کسی حیلے بہانے میری بات کاٹ کر شفقت صاحب کے اس حیران کن رویے کی بابت پوچھا تو میں بھنا کر الٹا رضیہ کو طعنے دینے شروع کر دیئے۔ میرا خیال تھا، اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا خیال بالکل ٹھیک تھا، کہ رضیہ میرے مقابلے میں ان سے زیادہ قریب ہے اور وہ اپنے دل کی بات رضیہ کو بلا کم و کاست بتا دیتے ہیں۔

آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ شفقت صاحب ہمارے گھر میں رہتے ہیں، ہمارا دیا کھاتے ہیں، ہماری عطا کردہ آسائشوں سے فیض یاب ہوتے ہیں، ہمارے گھرانے کی نیک نامی سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے ہم سے الگ ایک خفیہ بینک اکاؤنٹ بھی کھول رکھا ہے اور اس کے کاغذات وہ گھر کے پتہ پر نہیں منگواتے۔ جب ضرورت پڑتی ہے، بینک جا کر ٹیلر سے معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ مجھ پر ان کی اس خفیہ کاروائی کا بھیدان کے بینک منیجر کی معرفت کھلا اور ساتھ ہی یہ پتہ بھی چلا کہ حضرت کافی حد تک دل پھینک واقع ہوئے ہیں اور اپنی یہ خفیہ رقم ان محبوباؤں پر صرف کرتے ہیں جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔

بینک منیجر نے مجھے ان کے لیجروں میں بار بار ابھرنے والی ارشاد نامی ایک خاتون کا پتہ دیا جن کے نام سب سے زیادہ چیک کاٹے گئے تھے۔ ان میں چھوٹی چھوٹی رقموں کے چیک بھی تھے اور بڑی مالیت کے پے ڈرافٹ بھی۔ کچھ ایسی Instructions بھی تھیں جن میں ایک خط کے ذریعے ارشاد کے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کرنے کے احکام تھے۔

یہ ارشاد وہی لڑکی ہے جو تین سال تک اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کے بعد اب اس سے الگ ہو گئی ہے۔ رضیہ کے ننھیالی خاندان میں اس کی رشتے کی کزن ہے اور بڑے خوبصورت جسم کی حامل ہے۔ رنگ تو ہلکا گندمی ہے لیکن آنکھوں میں بے حیائی اور چہرے پر معصوم بد معاشی کے اثرات بہت ہی بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ سیدھی چلتی ہوئی بھی سائیڈ ویز کو ہلتی جاتی ہے۔ جان بوجھ کر نہیں، اس کے چلنے کا قدرتی انداز ہی ایسا ہے۔ وہ رضیہ سے چینی کھانوں کی ترکیبیں پوچھنے آتی ہے اور دیر تک شفقت صاحب سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ دونوں

کوسیاست میں ایک جیسی دلچسپی ہے، لیکن دونوں کی پسندیدہ پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ اس سے بحث گرم کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جب شفقت صاحب اس کی پارٹی پر جھلاتے ہیں تو ساتھ ساتھ ہاتھ کا کفچہ ہلاتے ہوئے یہ بھی کہے جاتے ہیں کہ تو مجھے گرم کر رہی ہے ارشاد، گرم کر رہی ہے۔ میں تجھے اور تیری پارٹی کو جلا کے رکھ دوں گا۔ وہ بھی ترکی جواب دیتی ہے کہ آپ بھی تو مجھے سلگا رہے ہیں، بھجار رہے ہیں، میں بھی آپ کو اور آپ کی پارٹی کو بھسم کر کے رکھ دوں گی۔ اپنی پارٹی کے خلاف ایسا سخت جملہ سن کر شفقت صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں اور اپنے گرم گرم ہاتھوں میں ارشاد کا گلا سہلاتے ہوئے کہتے ہیں "میں چاہوں تو تم کو ختم بھی کر سکتا ہوں اور مجھ پر کوئی مقدمہ بھی نہیں بن سکتا لیکن میں ایسے کروں گا نہیں۔"

ارشاد ان کی دونوں کلائیوں کو اپنی مٹھی میں پکڑ کر گلانہ چھڑانے کی غرض سے منہ اٹھا کر کہتی ہے "میں اپنی پارٹی کے لئے ہر وقت شہید ہونے کو تیار ہوں اور ہر گھڑی مرنے کے لئے سینہ سپر ہوں۔"

"اُوئے رہنے دو" شفقت صاحب سر جھٹک کر کہتے "میں نے دیکھا ہوا ہے سینہ! اس کے لئے حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے، سینہ سپر ہونے کے لئے۔ اور تمہاری پارٹی حوصلہ ہی مفقود ہے۔"

اور جب رضیہ گردن گھا کر یہ کہتی کہ "دیکھو ارشاد اس ڈش میں نمک پہلے نہیں ڈالنا، پھینٹا ہوا انڈا حل کرنے کے بعد ڈالنا ہے" تو شفقت صاحب ارشاد کی گردن چھوڑ کر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے۔

رضیہ کا چہرہ اس بات کی غماضی تو کرتا ہے کہ شفقت صاحب میں دلچسپی لیتے ہیں اور ارشاد بھی ان کو اپنے آپ پر لہلوٹ کراتی ہے لیکن اس بات کا اس کو بالکل علم نہیں ہے کہ ارشاد کے اللے تللے کا باقاعدہ ایک کھانا کھلا ہے اور اس میں سے وہ اپنی خواہش کے مطابق رقمیں لیتی رہتی ہے۔

میری بڑا آپا کے پاس دو لوٹیلے میں چار ایکڑ کا جو رقبہ تھا، وہ شہر پھیلنے پر شہری آبادی میں آ گیا۔ جو بھاؤ ایک ایکڑ کا تھا، وہ ایک کنال کا ہوا۔ اس طرف کو آبادی کا زور بڑھا تو ایک مرلے کی وہی قیمت ہو گئی جو ایک کنال کی تھی۔ شفقت صاحب نے بڑی آپا کو شیشے میں اتار کر اور ان کی مدد کا وعدہ کر کے ان سے چار ایکڑ کا رقبہ پرانی قیمت پر خرید لیا اور رجسٹری اپنے نام کرائی۔ تیس ہزار روپے فی ایکڑ کے حساب سے ایک ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم پا کر بڑی آپا پھولی نہ سمائیں اور شکریہ ادا کرنے ہمارے گھر آ گئیں۔ اس وقت نہ میں گھر پر تھا نہ شفقت صاحب، رضیہ کو انہوں نے بڑی دعائیں دیں اور شفقت صاحب کی بڑی تعریف کی کہ اس نے مجھ بیوہ کو اپنی سگی بہن سے بڑھ کر جانا اور میری پرانی کلرز دہ سسرال زمین کو ایسے مہنگے بھاؤ خرید لیا۔ رضیہ نے کہا "آپا! آخر وہ اس گھر میں رہتے ہیں اور ہمارے ان پر اتنے احسان ہیں، اگر انہوں نے اتنی مہربانی کر دی تو کون سی بڑی بات کی۔ ہم تم جانو اور شفقت میاں جانیں لیکن میں نے تو کچھ نہیں کیا اور اس بات کا شکریہ مجھ پر واجب ہے جو میں ادا کرنے آئی ہوں۔ اور آتے ہوئے جو میں تمہارے لئے مٹھائی کا ڈبہ نہیں لاسکتی تو یہ ایک ہزار روپیہ یہاں تمہارے ڈائننگ ٹیبل پر رکھے جاتی ہوں۔ تم اور تمہارا میاں اور شفقت سبھی مل کر منہ میٹھا کر لینا۔"

آپا یہ کہہ کر بجلی کی تیزی سے وہاں سے پلٹیں اور سیدھی دروازے سے نکل گئیں۔ رضیہ ہزار روپے کے نوٹ پکڑے "نہیں آپا"

کہتی ان کے پیچھے بھاگی۔ مالی کو آوازیں دیں کہ پھانک بھيڑ دے مگر آپاکھٹ سے موٹر میں بیٹھیں اور جھٹ سے پٹ بھيڑ لیا۔ ڈرائیور آہٹ پاتے ہی "ٹوں" کر کے گیٹ سے نکلا اور رضیہ پانچ پانچ سو کے دونوٹ ہاتھ میں پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

رات کو جب رضیہ چہرے پر کریم مل کر بستر میں لیٹی تو اس نے بڑا آپا کی آمد کا سارا قصہ تفصیل سے سنانے کے بعد مجھ سے پوچھا کہ آپا کی چار ایکڑ زمین کی قیمت کیا ہوگی تو میں نے بے خیالی سے کہا کہ فی الحال تو اسی نوے لاکھ کی ہوگی لیکن دو مہینے بعد یہ قیمت بڑھ جائے گی اور اتنی بڑھ جائے گی کہ اب اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ سن کر رضیہ نے ایک خوف ناک چیخ ماری اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ آپا کی ساری زمین شفقت نے اپنے نام منتقل کروالی ہے تو اس میں بولنے کی سکت بھی باقی نہ رہی۔

اگلے چند روز رضیہ دبی دبی زبان میں اس بات کا اظہار ضرور کرتی رہی کہ شفقت صاحب کو ایسا کرنا نہیں چاہئے تھا اور بڑی آپا کو ان کی سادگی کی اتنی زیادہ سزا نہیں دینی چاہئے تھی لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ اس حقیقت کے ساتھ مصالحت کر گئی کہ اس دنیا میں ایسے ہوتا ہی رہتا ہے، ہوتا ہی آیا ہے اور شاید ہوتا ہی رہے گا۔

جوں جوں عمر بڑھ رہی تھی، شفقت صاحب کے مزاج میں حرص، غصہ، خست، بد اعمالی، منافقت اور اخلاقی کج روی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ ہر وقت کچھ چھپائے سے پھرتے تھے اور غرائے غرائے رہتے تھے۔ ان کے اندر سے ہوس کے چھوٹے چھوٹے چشمے پھوٹنے لگے تھے اور ان کی شکل قمری رنگ کے باراں زدہ پینٹ کی طرح ہو گئی تھی اور ان کی رفتار میں ایک ٹیڑھی آگئی تھی۔ ایسی صورت میں اور اس عمر میں مرد کا جبر ڈھیلہ ہو جاتا ہے اور اس سے جس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ شفقت صاحب کو ہر وقت منہ کے آگے رومال رکھتے تھے مگر تھوڑی دیر میں وہ رومال چپٹی رال سے لتھڑ جاتا تھا۔

ایک روز ہم لوگ گھر پر نہیں تھے۔ مین حسب معمول دفتر میں تھا، رضیہ شاہدہ کے یہاں مولود پر گئی ہوئی تھی۔ خانساں ذرا سا زیادہ وقت لگا کر شام کا کھانا بھی ابھی سے تیار کر رہا تھا کہ اسے شام کو اپنے گاؤں جانا تھا۔ ماریا دونوں کمرے خانسامے کے ہوتے ہوئے صاف کر کے جا رہی تھی کیونکہ باقی کمرے رضیہ بند کر گئی تھی۔ ایک غسل خانہ کھلا تھا اور ساتھ پورچ میں بھی جھاڑو دینا تھا۔ دس بجے پانی کی مشین ٹھیک کرنے والا مستری آ کر نئی بوکی ڈال رہا تھا اور دوپہر کو چپاتی بنانے سے پہلے خانساں کو دھوبی کے یہاں سے اپنا جوڑا لینے جانا تھا۔

میں نے دفتر بیٹھے بیٹھے سوچا کہ ہمارے تینوں کمرے بند ہونے کی وجہ سے ماریا نہیں ویسے ہی چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اگے دن اس کا نانا تھا اور دو دو دن وہ ویسے ہی نہیں آتی۔ کیوں نہ ہمت کروں اور امور خانہ داری میں تھوڑی سی دلچسپی لوں۔

جب میں گھر پہنچا تو خانساں باورچی خانے میں مصروف تھا۔ مستری مشین کو بوکی ڈال کر جا چکا تھا۔ جو کمرے رضیہ بند کر گئی تھی، وہ کھلے تھے اور ماریا میری بیوی کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے پاس شفقت صاحب یوں کھڑے تھے کہ ان کی ران ماریا کے کندھے کو چھو رہی تھی۔ دونوں آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد گردنیں ایک دوسرے کی طرف گھما کر اپنے اپنے عکس کی داد لے رہے تھے۔

ماریا نے کانوں میں رضیہ کے "لاپس" والے بندے پہنے ہوئے تھے اور چہرے پر بلش آن کا میک اپ کیا ہوا تھا۔ شفقت

صاحب اپنے ہاتھ میں رضیہ کی لال سوہی لپ سٹک لئے ماریا کے بچ آپ پر مصر تھے اور ماریا گردن مروڑ مروڑ کر اور تھوڑی سینے میں گھسا گھسا کر لپ سٹک لگوانے سے انکار کر رہی تھی۔ شفقت صاحب اسے چکار ہے تھے، مٹھا رہے تھے اور کندھا تھپک تھپک کر لپ سٹک لگوانے پر مائل کر رہے تھے۔

ماریا جب کسی صورت بھی نہ مانی تو شفقت صاحب نے زور سے اس کا جوڑا پکڑ کر اس کا منہ اوپر اٹھالیا اور اس کے چہرے پر زور سے پھونک مار کر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ ماریا آمادگی سے مسکرانے لگی اور ساتھ ہی جوڑے پر کھینچ پڑنے کی وجہ سے جھوٹ موٹ سی سی کرنے لگی۔

جس وقت شفقت صاحب ماریا کے ہونٹوں پر لپ سٹک کی دوہری تہہ اور دبیز کر رہے تھے عین اس وقت رضیہ کمرے میں داخل ہوئی اور ماریا کا اپنے ڈرینگ ٹیبل سٹول پر بیٹھے دیکھ کر بھیں بھیں رونے لگی۔ ماریا سٹول سے اچھلی اور پاس پڑا ہوا جھاڑوا اٹھا کر قالین پر پھیرنے لگی۔ شفقت صاحب شرمندگی سے مسکراتے ہوئے لپ سٹک کا خول بند کرنے لگے اور رضیہ اسی طرح اپنا پرس جھلاتی ہوئی سسکیاں بھرتی گھر سے باہر نکل گئی۔

اپنے میکے پہنچ کر اس نے مجھے فون کیا کہ اگر شفقت صاحب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے گھر سے نکالتے ہو تو میں واپس آتی ہوں ورنہ تم بستے بھلے اور ہم پردیس بھلے!

میں سے ہر روز فون کرتا ہوں اور واسطے دیتا ہوں لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے۔ میں نے اس کو لاکھ سمجھایا ہے کہ اس میں میرا اپنا کوئی قصور نہیں، سب میرے ابا جی کا کیا دھرا ہے جو اس منحوس کو میرے گلے کا ہار بنا گئے ہیں لیکن وہ میری ایک نہیں سنتی اور میری کوئی دلیل نہیں مانتی۔ لیکن میں بھی کیا کروں اور کس دیوار سے ٹکرماروں کہ شفقت میرا اپنا تخلص ہے!

Virtual Home
for Real People

بیک گراؤنڈ

عابد کی پوتی بشریٰ کی مہندی تھی اور لڑکے والے مہندی لے کر آرہے تھے۔ اندر شیشوں والے ہال میں ہماری طرف کے لڑکے اور لڑکیاں ہائی فائی میوزک کے ساتھ ہلا گلا کر رہے تھے اور ناچ کی نئی نئی قسموں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی بھنسیاں ڈالتے ہوئے بڑے بڑے ٹوکے مار رہے تھے۔ کچھ لڑکے لڑکیاں زمین پر اور کچھ صوفوں پر پھسکڑا مار کر ایک دوسرے کو خفیہ قسم کے لطیفے سنارہے تھے اور دوسروں کے منہ سے بوتلیں کھینچ کھینچ کر لمبے لمبے گھونٹ بھر رہے تھے۔ سارا ہال دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ خبریں آرہی تھیں کہ لڑکے والے تیار ہو رہے ہیں۔ ان کے ڈھولی پگڑیاں باندھ رہے ہیں۔ لڑکیاں لڈی کی آخری ریہرسل کر رہی ہیں۔ مہندی سچ گئی ہے۔ موٹریں قطاروں میں کھڑی ہو گئی ہیں۔ صرف لڑکے کے والد ای سی جی کرانے کلینک گئے ہوئے ہیں، جو نہی واپس آئے تو قافلہ روانہ ہو جائے گا۔

میں اسی شور و غل سے گھبرا کر، اوپر چڑھتی گول سیڑھیوں والے زاویے میں جا کر بیٹھ گیا جہاں پرانی وضع کے کچھ لوگ سیاست کی جدید صورت پر روشنی ڈال رہے تھے۔ مجھے اپنے علاقے میں تشریف لاتے دیکھ کر کچھ مرد اپنی نشستوں سے اٹھے اور ہاتھ ہلا کر اپنے قریب آنے کی دعوت دی۔ میں سر در اور اختلاج قلب کا بہانہ کر کے ان سے دور بیٹھ گیا۔ دراصل یہ محض بہانہ ہی نہیں تھا، کچھ حقیقت بھی تھی کیونکہ ابھی میں نے اپنی سبز ڈبیہ سے ایک گولی نکال کر زبان کے نیچے رکھی تھی۔ عابد کی بڑی بیٹی نے ادھر سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹا تکیہ اٹھا کر میری گردن کے نیچے ڈالا اور پائی کھینچ کر میرے پاؤں کے قریب کر دی۔ میں جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو میرے دل کی دھڑکن کچھ زیادہ ہی اونچی ہو جاتی ہے اس لئے ایسے موقع پر میں اپنے آنکھیں کھلی رکھتا ہوں لیکن نگاہیں روک لیتا ہوں۔ نظر تو سب کچھ آتا ہے لیکن دکھائی کچھ نہیں دیتا۔

تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان سی، خوبصورت، بھری بھری اور چمک دار لڑکی آ کر میرے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں بھورے بھالو کی کھال کا پرس تھا اور وہ ذرا گھبرائی ہوئی سی تھی۔ ہائی فائی میوزک کے شور میں اس نے اپنی آواز اونچی کر کے اور سر نیچا کر کے مجھ سے پوچھا "انکل میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟"

سارا صوفہ خالی پڑا تھا لیکن میں نے ذرا سا سرک کر اسے بیٹھنے کی اجازت دی تو میرے ساتھ بیٹھ کر بولی "میرا نام سوزی ہے اور میں یہاں مجرا کرنے کے لئے آئی ہوں۔"

ہمارے زمانے میں ذرا بڑی عمر کی عورتیں مجرا کرنے کے لئے آیا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک دونو چیاں بھی ہوتیں لیکن وہ سازندوں کے ساتھ بیٹھ کر مجرا دیکھا کرتیں، خود نہیں ناچتی تھیں۔ میں نے کہا "تم اکیلی آئی ہو؟" تو اس نے سر ہلا کر کہا "نہیں جی، سازندے بھی ساتھ ہیں اور وہ باہر دیگوں والے کے پاس بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہارا نام بڑا ماڈرن ہے سوزی، یہ تم نے خود رکھا ہے؟" کہنے لگی "رکھا تو می نے تھا لیکن یہ نام مجھے پسند نہیں۔ میرا اصل نام در شہوار ہے اور میں الماس کی بیٹی ہوں۔" میں نے کہا "تم نگینہ کی نواسی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بے تکلفی سے بولی "انکل ہمارے گھر آپ کی ایک تصویر ہے، نانی کے ساتھ!" میں نے کہا "اچھا! وہ ریڈیو کے زمانے کی ہوگی۔"

کہنے لگی "ہے تو ریڈیو کے زمانے کی لیکن ہے ہمارے کوٹھے کی۔ اس میں آپ اور نانی اور بھائی چھیلا ایک ساتھ کھڑے ہیں اور پنگوڑے کے اندر میں ہوں لیکن میں نظر نہیں آتی، صرف پنگوڑا ہی نظر آتا ہے۔" میں نے کہا "بھئی پھر تو تم اپنی ہو۔ تمہارے گھر والوں کے ساتھ تو ہمارے پرانے تعلقات تھے۔ میری بیوی بھی ایک مرتبہ میرے ساتھ تمہارے گھر آئی تھی۔"

"مجھے پتہ ہے انکل! "اس نے وثوق سے کہا اور پھر ذرا سا رک کر بولی "آپ جی نہیں آئیں؟" میں نے کہا "ہو ایسی محفلوں میں اب کم ہی جاتی ہیں۔ ڈاکٹروں نے منع کر رکھا ہے۔ نیند میں کمی ہو جائے تو اس کا بلڈ کاؤنٹ نیچے گر جاتا ہے۔"

سوزی نے کہا "جب ہم نے اخبار میں ان کی بیماری کی خبر پڑھی تھی تو می نے داتا صاحب جا کر ایک دیگ دی تھی اور بی بیایا صاحب جا کر دھاگا باندھا تھا۔"

میں نے کہا "یہ سب تم جیسے لوگوں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ تمہاری آپا زندہ بچ گئیں ورنہ ڈاکٹروں نے تو جواب دے دیا تھا۔" پھر میں نے بات پلٹانے کی غرض سے پوچھا "سوزی کچھ پڑھائی وڑھائی بھی کی کہ اپنی می کی طرح مدرسہ چھوڑ دیا؟"

"کی پڑھائی انکل اور بڑی اچھی کی۔ ایف سی تک پہنچی لیکن پھر کالج میں کسی نے شکایت کر دی کہ یہ گانے بجانے والوں کی لڑکی ہے، اسے یہاں سے نکالا جائے ورنہ ہماری لڑکیوں کا اخلاق خراب ہو جائے گا۔ کالج والوں نے مجھے نکال دیا اور میں گھر آ گئی حالانکہ میرے امتحان میں ایک مہینہ اور اکیس دن رہ گئے تھے۔"

"اور اب کہاں ہوتی ہو؟"

" گھر پرانگل "

"بھئی گھر پر تو انسان ہوتا ہی ہے۔۔۔۔۔ اور اسے گھر پر ہی رہنا چاہئے۔۔۔۔۔ لیکن میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔ گھر کہاں ہے؟

1

"گھروہیں ہے انکل جہاں آپ آئے تھے۔"

"تم ابھی تک شاہی محلے میں ہی ہو؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تو اور میں کہاں جاسکتی ہوں!" اس نے ہنس کر کہا "میری بیک گراؤنڈ ہی وہاں کی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "لیکن اب تو وہاں کی بہت سی بی بیاں دوسرے علاقوں میں چلی گئیں۔"

"ہاں جی چلی تو گئیں لیکن مئی کے بعد میرا کوئی اور آسرا نہیں تھا اس لئے مجھے مجبوراً وہیں ٹھہرنا پڑا۔" یہ بات تو اگر مئی اپنے

زمانے میں کر جاتیں پھر آسان تھا، اب مشکل ہے۔"

میں نے کہا "مشکل کیوں ہے، وہ گھر بیچ کر کوئی کوٹھی ادھر لے لو۔"

کہنے لگی "اس گھر کی قیمت اتنی نہیں پڑے گی کہ اس سے ایک کوٹھی خریدی جاسکے گزارے موافق۔"

میں نے کہا "حد کرتی ہو سوزی، تمہارے پیشے میں تو اتنی کمائی ہے کہ تم دس کوٹھیاں خرید سکتی ہو۔"

میری یہ بات سن کر اس کا چہرہ اتر سا گیا اور وہ خاموش ہو گئی۔ پھر سر نیچے کر کے کہنے لگی "اب کوٹھوں پر ویسی کمائی نہیں رہی انکل

جیسی پہلے ہوتی تھی۔"

"کیوں اب کیا ہوا؟"

"اب ٹائم چینج ہو گیا ہے انکل!" سوزی نے سر اٹھا کر کہا "اب گھروں میں ہی اتنی رونقیں ہو گئی ہیں کہ لوگوں کو ہمارے پاس آنے

کی ضرورت نہیں رہی۔ اگلے زمانے میں جس چیز کی تلاش میں لوگ ہمارے پاس آیا کرتے تھے، وہ اب گھروں میں ہی مل جاتی ہے، کسی کو

کیا ضرورت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتا پھرے۔"

سوزی کی یہ بات سن کر میں خاموش ہو گیا اور بڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اتنے میں ارمی اور ڈوڈو وہاں سے گزریں تو

میرے سامنے رک کر بولیں "بھی یہ کیا بوریت ہے انکل، ادھر ہمارے پاس چل کر بیٹھیں۔ آصف اور صائمہ میں جو کس کا مقابلہ ہو رہا ہے

اور آصف سک جو کس سن رہا ہے۔ ذرا اس کی حالت تو دیکھیں آکر۔"

میں نے کہا "تم چلو بیٹا، میں ابھی آتا ہوں۔"

پھر انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ سوزی سے کہا "بھئی آپ بھی ادھر آئیں ناں اور آکر صائمہ کا مقابلہ کریں۔"

سوزی نے ہولے سے "اچھا جی" کہا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔ لڑکیوں کے چلے جانے کے بعد سوزی کہنے لگی "انگل میں

انگریزی رسالے پڑھتو لیتی ہوں لیکن مجھے ان کی زیادہ سمجھ نہیں آتی۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں! پریکٹس کرتی رہو، آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ آنے لگے گی۔"

"سمجھ بھی آ جاتی ہے پر وہ محاورہ نہیں ہوتا جو شرفا کی بیٹیوں کو خود بخود ہو جاتا ہے۔ اصل میں میری بیک گراؤ نڈ خراب ہے۔"

"نہیں نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے بالکل جھوٹے لہجے میں تسلی دیتے ہوئے کہا "محاورہ دراصل اس طرح کی زندگی

گزارنے سے آتا ہے، سو تم کو آ جاتے گا۔"

اس نے کہا "میں نے انگریزی کے اک پروفیسر کی ٹیوشن بھی رکھی تھی اور وہ تھا بھی بہت لائق لیکن اس کی نیت میں کھوٹ تھا۔"

"کھوٹ کیسا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس نے انکل پہلے تو مجھے آلیور ٹوسٹ پڑھایا، پھر آنا کریتا شروع کر دیا۔ میں انگریزی تو سمجھنے لگ گئی پر مجھے ایسی انگریزی نہیں

آئی جیسی ان لڑکیوں کو آتی ہے۔ اس انگریزی میں تنکار بھی ہے اور بھید بھاؤ بھی، لہر ابھی ہے اور جھالا بھی۔ یہ تو انگریزی کو گہنے کی طرح

پہنتی ہیں، وہ مجھے نہیں آتا۔"

"اوہ کم آن سوزی" میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا "ان میں سے کسی نے بھی یہ دونوں ناول نہیں پڑھے ہوں گے۔"

"اصل میں اس پروفیسر بیچارے کا بھی کوئی قصور نہیں تھا انکل" سوزی اسی لہر میں بہہ کر کہنے لگی "وہ خوشاب کار بننے والا تھا اور ایک

کھہار کا بیٹا تھا۔ اس کی بیک گرائنڈ بھی بہت کمزور تھی۔"

میں نے کہا "تم اس معمولی سی بات کے لئے اتنی پریشان کیوں ہو!"

"یہ معمولی بات نہیں ناں انکل" اس نے سنجیدگی سے کہا "یہ زندگی کا راز ہے۔"

میں نے اس کی حوصلہ افزائی کے لئے بات کا رخ بالکل دوسری طرف موڑ دیا اور پوچھا "چلو شہری لوگ تو نہ سہی، یہ بتاؤ کہ اب

گاؤں کے وڈیرے اور سردار اور ان کی اولاد بھی گانا سننے نہیں آتی؟"

"وہ لوگ بھی گاؤں چھوڑ کر شہروں میں آ گئے ہیں اور ان کی زندگیاں بھی شہر والوں جیسی ہو گئی ہیں۔ بڑے بزرگ تو سیاست میں

چلے گئے ہیں اور ان کی اولادوں نے شہری لڑکے لڑکیوں کے ساتھ مل کر اپنے میوزیکل گروپس بنائے ہیں۔ اب وہ گانا سننے نہیں آتے،

گانے بجانے آتے ہیں۔ یہ گروپ جو اس وقت کمپنی منٹ دے رہا ہے، ایک رات کے گیارہ ہزار لیتا ہے۔ وہ بھی بڑی خوشامدوں

اور سفارشوں کے ساتھ۔"

میں نے کہا "اگر زمانہ بدل رہا ہے اور جیسا کہ تم نے خود کہا ہے کہ ٹائم چینج ہو رہا ہے تو پھر ٹیلی ویژن کے ساتھ رشتہ استوار کرو۔ اس

کی معرفت تم کو بہت اچھے موقع مل سکتے ہیں۔"

اس نے کہا "ٹیلی ویژن والوں کی ایک پالیسی ہے، وہ بازار سے کوئی لڑکی نہیں لیتے۔"

"لیکن ریڈیو والے تو لیتے ہیں!"

"ان کی فیس بہت کم ہے اور سفارشیں زیادہ مانگتے ہیں۔ جاذبہ لیلی جیسی لڑکی سہ ماہی میں ایک مرتبہ بک ہوتی ہے۔"

"جاذبہ لیلیٰ تمہارے وہاں کی لڑکی ہے؟"

"جی انکل "اس نے یاد دلاتے ہوئے کہا "بے بکھو نہیں تھی بھیرے والی، اس کی نواسی ہے۔ آپ نے تو بے بے کو دیکھا ہوگا؟"

"

میں نے بے بے بکھو کو دیکھا تو تھا لیکن اس کے ساتھ کام نہیں کیا تھا۔ صوفی صاحب اس کی بہت تعریف کرتے تھے۔ عابد صاحب نے ایک مرتبہ "روپ متی اور باز بہادر" کے پیچھے بے بے بکھو سے تنگ گویا تھا جس نے ڈرامے کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ نظامی صاحب کہا کرتے تھے بکھو بھیرے والی راگ و دیا کی ڈکشنری ہے لیکن ڈی لکس ایڈیشن نہ ہونے کی وجہ سے ہر کوئی اس میں منہ مارتا ہے اور مروڑ توڑ کر کباڑیئے کے یہاں بیچ جاتا ہے۔

میں نے سوزی کو بتایا کہ "بے بے کو میں اکثر ستارے کے پاس بیٹھے دیکھتا تھا لیکن اس سے میری کوئی خاص ملاقات نہیں تھی، صرف علیک سلیک تھی۔"

سوزی نے مجھے چھوٹے بچے کی طرح ہمک کر بتایا کہ اس نے ہمارا پرانا ریڈیو سٹیشن بھی دیکھا تھا اور وہ تین مرتبہ بچوں کے پروگرام میں آئی تھی۔ آپاشیم نے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھایا تھا اور اس سے اس کا نام پوچھا تھا۔

جب صائمہ، شفور، نیلسن اور پنی ادھر سے گزرے تو انہوں نے مجھے گھور کے دیکھا اور صفورا نے اپنی کھلی ہتھیلی پر تین چار مکے مار کر مجھے سینت ماری اور مزید کہا "تیرے ساتھ سمجھوں گی بابیا، تو سیدھا ہو جا۔"

سامنے کولن اور ڈوڈو دھاگے سے لٹکتے سیب کو کھانے کی کوشش کر رہے تھے اور سیب کر بڑے بڑے گول چکروں میں جھلائے جا رہے تھے۔ دونوں میں سے جو نہیں کوئی سیب کو چک مارنے کی کوشش کرتا، سیب اس کے دانتوں اور ہونٹوں پر سکواش کی گیند کی طرح بڑھکتا اور اوپر اٹھ کر پھر چکر کاٹنے لگ جاتا۔ اس تماشے میں تین مرتبہ کولن اور ڈوڈو کے ناک، ہونٹ اور ٹھوڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں، جدا ہوئیں، پھر ٹکرائیں اور پھر جدا ہو گئیں۔ لیکن سیب ایسا بذات تھا کہ جڑی ہوئی ناک والے دونوں سروں کے گرد چھوٹے چھوٹے دائرے بنا کر ان کا منہ چڑاتا رہا۔ بچہ لوگ خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے اور دو درو صوفوں پر بیٹھی ہوئی شادی شدہ عورتیں اپنی باتیں بھول کر اس کھیل میں غرق ہو گئی تھیں۔ ریٹائرڈ بریگڈیئر ماما ذوالفقار بالکل سیدھے کھڑے کاشن دے رہے تھے "اوئے کولن پورا منہ کھول کے چک واڈھو، فل منہ کھول کر۔ شرماؤ نہیں جوان۔ ڈونٹ فائٹ شائی۔ پورا منہ کھول کر چارج کرو۔"

لیکن اب کولن اور ڈوڈو دونوں تھک چکے تھے اور سالم ثابت سیب ڈوڈو کی لپ سٹک سے اور بھی سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے غور سے دیکھتی سوزی کی توجہ ہٹانے کے لئے پوچھا "سوزی تم نے کوئی تماشہ بین نہیں پکڑا؟" تو وہ اس بات پر اونچے اونچے ہنسنے لگی اور اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولی "تماشہ بین کوئی پکڑنے کے لئے تھوڑی ہوتے ہیں انکل، وہ تو چھوڑنے کے لئے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو میرا مطلب نہیں سمجھی۔ میرا مطلب ہے شادی کے لئے کوئی عقل کا اندھا پکڑا کہ نہیں؟"

وہ بڑی سنجیدگی سے بولی "ایک پکڑا تھا انکل لیکن وہ قابو نہیں آیا۔ ہاتھ سے نکل گیا۔"

"کیسا تھا؟"

"بہت اچھا انکل، بلکہ بہت ہی اچھا۔۔۔ تربیلا انجینئر تھا اور ہر ہفتے باقاعدگی سے مجھے ملنے آتا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔۔۔۔۔ نہیں مانا"

"تمہارے جیسی خوبصورت لڑکی کے لئے بھی نہیں مانا؟"

"دل سے تو مانتا تھا لیکن ڈرتا بہت تھا۔۔۔ کہتا تھا تم جیسی طوائف زادیاں شادی کے بعد اتنی شریف اور گھریلو قسم کی بن جاتی ہو کہ زندگی کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔ تم ویسی ہوٹ اور بچھٹ نہیں رہتی ہو، ڈپٹی نذیر احمد کی بی بیوں بن جاتی ہو۔۔۔ یہ ڈپٹی صاحب کون ہیں انکل؟"

میں نے سوزی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سیب کا کھیل دیکھنے لگا۔ اب مقابلے پر شاہد اور صائمہ آ گئے تھے۔ ڈھول زور زور سے بجنے لگے تھے اور لڑکے والے مہندی لے کر داخل ہو رہے تھے!

زر ناب گل

جب ہم چھوٹے تھے تو دریائے ستلج کے اس کنارے پر رہتے تھے اور ہمارے گاؤں کا نام علی اولک تھا! لیکن جب ہم بڑے ہوئے تو دریائے ستلج کے اس کنارے پر آ کر آباد ہو گئے، اور ہمیں پتہ چلا کہ نہ تو دریائے ستلج کے کنارے پر آباد ہونے میں کوئی خوبی تھی اور نہ ہی ہمارے چھوٹے ہونے میں کوئی برتری تھی، صرف ہمارے ہونے میں ایک راز تھا جو خالی اسی کو معلوم تھا جس نے ہمیں ہونا عطا کیا تھا۔ علی اولک کے پنساں نویس کی ایک لڑکی تھی، جس کا نام نجمہ تھا۔ نجمہ میری چھوٹی بہن زاہدہ کے ساتھ پڑھتی تھی اور زاہدہ کی ٹانگ میں ایک پیدائشی نقص تھا جس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلتی تھی۔ نجمہ کی ناک پر بھورے رنگ کا ایک سپی جیسا نشان تھا جس کو اس کی ماں لہسن کہتی تھی۔ نجمہ کا باپ اس نشان کو تولہ کہتا تھا۔ چونکہ وہ دونوں ان پڑھ تھے، اس لئے نہ لہسن کا مطلب جانتے تھے نہ تولے کا۔

ہمارے اس گاؤں میں صرف تین گھرانے پڑھے لکھے تھے۔ ایک سردار ہرپال سنگھ ریٹائرڈ صوبیدار میجر کا، جس کا لڑکا مڈل پاس تھا اور بی بی سرجیت کور گورکھی کی کتاب اٹھالیتی تھی۔ دوسرا مولوی امیر الدین فاضل دیوبند کا اور تیسرا ہمارا۔ لیکن ہم لوگ سب سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ میرے بڑے بھائی جوائف ای ایل کی تیاری کر رہے تھے، ان کے پاس آٹھ جلدوں میں بک آف نالج تھی اور میری آپا کے پاس "تہذیب النساء"، "عصمت" اور "خاتون" کی جلد بندھی فائلیں موجود تھیں۔ میرے والد شاعر تھے اور خسروی تخلص کے ساتھ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ انگریزی ڈپٹی کمشنروں کو کو جتنے بھی سپاس نامے پیش کئے جاتے، وہ میرے والد کے لکھے ہوئے اور میرے بڑے بھائی کے دیکھے ہوئے ہوتے تھے لیکن میری آپا اس میں بھی املا کی غلطیاں ڈھونڈھ لیتی تھیں کیونکہ وہ اس زمانے میں بھی پتہ کو پتا لکھتی تھیں۔

نجمہ نے جب مڈل پاس کر لیا تو اس کے ابا نے اسے بنگلے فاضلکا کے ہائی سکول میں داخل کراداجہاں مس محسنین اس کی ہیڈ مسٹر لیں تھیں۔ بائیس ہزار کی آبادی کے بڑے شہر نے نجمہ کو چار چاند لگا دیئے اور اس کی شخصیت پنساں نویس کی بیٹی سے پھسل کر افسر مال کی بیٹی پر اتر آئی اور وہ دورے سے یوں دکھائی دینے لگی جیسے کسی بڑے سیاست دان کی بیٹی ہو۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب وہ گھر واپس آئی تو سارے گاؤں میں ایک لہلہا سا ہو گیا اور وہ پرندے بھی منڈیروں پر اترنے لگے جو ہواؤں میں اوپر ہی اوپر سے گزر جاتے تھے۔ اس

کی رنگ دار قمیصوں کی پھین اور آستنیوں کی جھال کا چڑھاؤ ایسا تھا کہ گلیوں کے دہانے پر وہ ایک ٹیڑھی سی دکھائی دیتی جو اپنی جوانی کی تپش میں مینہ مانگ رہی ہو۔ یوں تو علی اولک میں بادل کے اور بھی بہت سے ٹکڑے تھے لیکن میری ٹھنڈک اور میرا پانی ان سے زیادہ تھا اور میں ہر وقت برس ہا ہا سارہتا تھا۔

جس دن وہ زاہدہ سے مل کر اور اپنے سکول کے نہ ختم ہونے والے قصے بیان کر چکنے کے بعد ہماری حویلی کی کچی سیڑھیوں کے نیچے سے گزری تو میں اس کی جھالدار کلائی تھام کر اتنا برس، اتنا برس سا کہ اس کا سارا وجود جل تھل ہو گیا۔ ہماری مشکلی پچھیری نے سانی سے منہ نکال کر گردن موڑی اور ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگی کہ اب یہ اتنے گہرے پانیوں سے باہر کیسے نکلیں گے!

میں نے تین مرتبہ گورنمنٹ کالج لاہور سے آدھا پیر یڈ چھوڑ کر فاضل کا بنگلے کا سفر اختیار کیا لیکن تینوں مرتبہ مجھے اس سے ملنے میں نا کامی ہوئی۔ مس محسنین کے اصول کچھ اس قدر تہی ہوئی کینوس کے تھے کہ جس قدر زور سے کوئی اس سے ٹکراتا تھا، اسی قدر دور جا گرتا تھا۔
_____ اکوئل اینڈ اپوزٹ _____ پتھر کی دیوار سے سر ٹکرانا بڑا آسان تھا کہ اس سے ایک گونج بھی پیدا ہوتی تھی اور ارتعاش سے ماحول بھی لرزہ براندام ہو جاتا تھا، خوب بھی نکلتا تھا اور آسودگی اور شہرت بھی عطا ہوتی تھی ساری شعر و شاعری پتھر کی دیوار سے انا کے دودو ہاتھ کی وجہ سے تھی لیکن کینوس کی تہی ہوئی دیوار ہر مرتبہ مجھے اپنی غلیل میں بھر کر آٹھ آٹھ کیاریاں، دودو لان اور تین تین سڑکیں پرے پھینک دیتی تھی۔ اس میں دُت بھی تھی، ہزیمت بھی، شرمندگی بھی اور خواری بھی!

گاؤں پھر بھی اچھا تھا۔ پھر بھی کیا، بہت ہی اچھا تھا۔ لیکن گرمیوں کی چھٹیاں پورے ایک سال بعد آتی تھیں اور ڈھائی مہینے کی مدت میں اتنا وقت ہی کہاں ہوتا ہے کہ باتیں کھل کر ہو سکیں، ساری کی ساری ہو سکیں اور کہنے اور سننے کی کوئی حسرت باقی نہ رہے۔

نجمہ میں ایک خرابی تھی کہ وہ سنتی زیادہ تھی اور بولتی کم تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تو ہاتھ تھامے بغیر کہہ نہ سکتی۔ ہاتھ تھام لیتی تو پھر اس کی زبان رک جاتی۔ جس طرح مشین میں ایک ہوڑے کے اندر دوسرا ہوڑا آنے سے رولر لاک ہو جاتا ہے، یہی حال اس کا تھا۔ میں اس سے شرارت کی کوئی بات کہتا تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھے یوں پرے دھکیل دیتی جیسے کاغذ چھپ جانے کے بعد پریس کے کمانچے اسے پرے دھکیل کر بڑے قرینے سے انبار پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کا بھی یہی قرینہ تھا۔ پرے دھکیل کر وہ مجھے اپنی ذات کے انبار میں مجتمع کر لیتی تھی۔

میٹرک میں وظیفہ پانے کے بعد وہ فیروز پور کے "مہاو دیالا" کالج میں داخل ہو گئی اور اس سے ملنا قدرے آسان ہو گیا۔ مگر اتنا آسان بھی نہیں کہ سال میں تین چار ملاقاتوں سے زیادہ ہو سکیں۔ مہاو دیالا کی ڈیوڑھی میں دو کرسیاں آمنے سامنے دال کر اور اپنی اپنی کتابیں گود میں رکھ کر آدھ گھنٹہ کی ملاقات کا وقت ملتا تھا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر اپنی کتابوں پر ہاتھ رکھ کر انسان زیادہ سے زیادہ بیان حلقی دے سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

ایک روز اپنی کتابوں پر ہاتھ رکھے رکھے اس نے نظریں اوپر اٹھائے بغیر بڑی آہستگی سے کہا "مجھے تو اس لفظ کے کوئی معنی نہیں ملے

"کون سے لفظ کے؟" میں نے اسی آہستگی سے پوچھا۔

"وہی جو تم بولا کرتے ہو۔"

"میں تو بہت سے لفظ بولا کرتا ہوں۔"

"وہ سارے نہیں، وہ اکیلا لفظ جو تم بولا کرتے ہو۔"

"میں نے تو آج تک کوئی اکیلا لفظ نہیں بولا۔"

"جس میں گل آتا ہے!"

"گل تو بہت سے لفظوں میں آتا ہے: گل گلاب، گل اندام، گل فردہ، گل چراغ، گل تازہ، گل بکاؤلی۔۔۔۔۔ پتہ نہیں تم کون سے گل

کو پوچھ رہی ہو۔"

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گئی۔ میں نے پھر پوچھا تو اس نے اسی طرح آنکھیں بند کئے جواب دیا "وہی بچے

کے نام والا!"

"اوہ" میں نے خوش ہو کر کہا "زر ناب گل؟"

نجمہ نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر تھوڑی دیر کے لئے ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

پھر اس نے ہمت کر کے کہا "مجھے تو زرناب کے معنی کسی ڈکشنری میں بھی نہیں ملے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "مس! آپ کے کالج کی لائبریری میں معمولی قسم کی ڈکشنریاں ہیں۔ ان میں یہ لفظ نہیں ملے گا۔"

"تو پھر کہا ملے گا؟" اس نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"یہاں" میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "اس ڈکشنری میں۔ یا پھر اس گود جس میں تم کتابیں رکھ کر بیٹھی ہو۔" وہ خوشی کے

بھرپور لمحے سے بوکھلا سی گئی اور اس کا چہرہ اس شخص کا سا ہو گیا جس کا مسکراتے وقت رونا نکل جائے اور وہ بے اختیار سسکیاں بھرنے لگے۔

میں نے نجمہ کو بتایا تھا کہ جب ہماری شادی ہو جائے گی اور ہمارا بیٹا پیدا ہوگا تو ہم اس کا نام زرناب گل رکھیں گے اور اس کو

تیر اندازی کا فن سکھائیں گے۔ جب وہ جوان ہوگا تو ہم اس کو خشک ناچ سکھائیں گے۔ اس کی ماں تو اپنے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو پھونک

مار کر اوپر اٹھاتی ہے، وہ جھٹکا دے کر اپنے زلفوں کو واپس لایا کرے گا۔

"ناں! ہم نہیں سکھائیں گے اس کو خشک ڈانس۔"

"کیوں؟"

"پتہ ہے کتنے چکر آتے ہیں اس ناچ میں! سارا دماغ گھوم جاتا ہے۔"

"وہ کوئی ہماری عمر کا تھوڑی ہوگا نجمہ، وہ تو جوان ہوگا نجمہ، منہ زور پچھیرا۔ اس کو چکر کدھر سے آئیں گے۔"

"نہیں" کوئی ضرورت نہیں "اس نے سختی سے کہا اور یہ کہہ کر ایسی کچی پڑ گئی جیسے اپنے ہی گھر کے فریج سے باسی مٹھائی نکال کر کھا

تے ہوئے شوہر کو اس کی بیوی آکر کہے "ہائے میرے اللہ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

نجمہ کے ہاتھ میں بھی باسی باتوں کا کٹورہ تھا اور وہ ادھ کھلے منہ کے ساتھ فرش کو دیکھ رہی تھی۔

پچھلے سال یہی دن تھے، یہی موسم تھا، ایسی ہی سیاسی فضا تھی اور آسمانوں کے ایسے ہی رنگ تھے۔ کراچی سے میرے بڑے بیٹے کی منگیتر آئی ہوئی تھی۔ آصفہ سینئر کیمبرج کا امتحان دے کر دسمبر والے داخلوں کا انتظار کر رہی تھی کہ سب نے مجھ سے پوچھے بغیر بلوکی ہیڈ جانے کا پروگرام بنالیا۔ وہ ٹوکریاں، تھرموسیں، باری کیو کی مشین جو پانچ سال پہلے ہم ولایت سے لائے تھے، باہر نکال کر ڈکی میں بھری گئیں۔ پینے کے پانی کی صاف اور مصفا بوتلیں نکال گئیں۔ تتامیاں لپیٹی گئیں اور ہمارا قافلہ منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

بھائی پھروسے ذرا پہلے ایک زنانے دار جیپ نے ہمیں اور ٹیک کیا۔ اس میں زمیندار اور زمینداروں کے جوان بیٹے سوار تھے۔ سر پر طرح دار پگڑیاں اور تن پر شیشے والی واسکٹیں تھیں، ہاتھوں میں رائفلیں اور چہروں پر نوکیلی مونچھیں۔ لیکن جب چیخ ذرا آگے نکلی تو ہم نے ایک انوکھا منظر دیکھا۔ اس جیب کے پیچھے ایک موٹے سے رسے کے ساتھ براؤن رنگ کا ایک کتا بندھا تھا جو پچاس پچپن کی سپیڈ پر تیز دوڑتی کار کے پیچھے بڑے عبرت ناک انداز میں گھسٹ رہا تھا۔ دس پندرہ فٹ بھاگتا، پھر ٹانگوں پر ساکت ہو جاتا۔ جب پنجے سڑک کی رگڑ سے جلتے تو پیٹھ اور پہلو کے بل سڑک پر گھسٹنے لگتا۔ پھر ٹپ کر اٹھتا اور بھاگنے لگتا۔ بڑے جھبرے کا کتا تھا اور اس کی گردن اور سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ جان کنی کی اذیت میں جب وہ سڑک سے اوپر اچھلتا تو اس کا سارا بدن سپرنگ کی طرح کھلتا اور بند ہوتا اور اس کیفیت میں اس کے سر کے بال پہلے آگے کو اور پھر پیچھے کو جاتے۔ یوں لگتا جیسے موتکے اس ناچ میں وہ اپنے بالوں کو خود جھٹک رہا ہے۔ ہم اس جیب سے چند فٹ کے فاصلے پر تھے اور میرا بڑا بیٹا آگے بڑھ کر رائفل بردار سرداروں کو روکنا چاہتا تھا لیکن ہم سب اس کو منع کر رہے تھے۔ میری بیوی اور میری ہونے والی بہو اپنی آنکھوں کے گرد دوپٹے لپیٹ کر کافی اونچی آواز میں رور ہی تھیں اور ہم پتھر کے بت بنے اس خونی ناچ کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے بیٹھے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر موٹر کو الی اور جیب ہماری نگاہوں کے سامنے اوجھل ہو گئی۔

جب ہم پک تک منانے کی غرض سے ہیڈ بلوکی اترے تو کسی نے بھی سامان ڈنخی سے نہ اتارا۔ کسی نے کوئی بات نہ کی۔ سب یوں کھڑے تھے جیسے اپنے کسی عزیز کو دفن کرنے کے بعد قبرستان کے کنارے واپس لوٹنے والے کھڑے ہوں۔

پھر ہم نے دیکھا دریا کنارے سوکھے سرکنڈوں کے بل کھاتے سمندر میں آگ اور دھوئیں کا ایک ستون اٹھا اور بڑے بڑے آتشیں لائبروؤں نے ایکڑ بھر رقبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہم سب ادھر دوڑے۔ بہتے دریا کے کنارے آگ کا دریا بھڑک رہا تھا اور آسمان کو لپکتے شعلوں کے اوپر ایک گزاری غوطہ مار کر آگ کی تہہ میں اترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرکنڈوں کے اندر اس کا گھونسل تھا اور اس کے بچوں نے کل ہی اڑنا سیکھا تھا۔ بھڑکتے ہوئے شعلے بے سرے ڈھولوں اور ٹوٹی ہوئی نوبتوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا گٹاری کے دونوں بچے آخری مرتبہ، آخری زور لگا کر اوپر ابھرے اور پھر ڈھیلوں کی طرح بھڑکتی ہوئی آگ میں گر گئے۔

ہم سب اس چتا کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے اور ہمارے ارد گرد کسی قریبی سکول سے پک تک پر آئی ہوئی لڑکیاں اونچے اونچے رور ہی تھیں گٹاری زمین سے آگ کی طرف اور آگ سے آسمان کی طرف پرواز کرتے ہوئے اپنی پوری طاقت سے چیخ رہی تھی۔

میں نے اس سے پہلے کسی جانور کو اتنی اونچی آواز میں کفر کے کلمات کہتے نہیں سنا تھا۔

ایک لڑکی نے روتے ہوئے کہا "مس دونوں بچے جل کر راکھ ہو گئے۔"

مس نے بڑے تحمل کے ساتھ بڑی ملائم آواز میں کہا "ہاں کلثوم، دونوں زرناب گل ہو گئے۔"

میں نے چہرہ گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ جو گلابی لہسن ہوتا تھا، اب بالکل سیاہ ہو گیا تھا اور موٹے فریم کی عینک کے نیچے سے ہو

کر آگے نکل گیا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ کاش اس نے اپنے بال رنگ لئے ہوتے!

میں نے اپنی بیوی سے کہا "ان سے ملو، یہ نجمہ ہیں۔"

وہ میری بیوی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی "میں رادھا رام سکول میں ہیڈ مسٹریس ہوں اور یہ میری ملازمت کا آخری سال ہے۔"

پھر اس نے زور کی تالی بجا کر کہا "بچیو! واپس واپس واپس!!!"

لڑکیاں بس کی طرف لپکیں اور نجمہ ہم سے خدا حافظ کہے بغیر انہیں لے کر بس میں سوار ہو گئی۔

گٹاری اب بھی اسی طرح جھلسی ہوئی فضاؤں میں چیخ رہی تھی حالانکہ اب چیخنے والی کوئی بات ہی نہ رہی تھی!

Virtual Home
for Real People

دم بخود

مادھو کے مرنے میں صرف چند گھنٹے رہ گئے تھے اور اس کی جوان بہن پکی سڑک پر ننگے پاؤں کھڑی تھی۔ گود میں مادھو تھا، آنکھوں میں آنسو، کانوں میں پیتل کے بندے اور ہاتھ میں پانی کی بھری ہوئی شیشی۔ وہ مرتے ہوئے مادھو کو اپنے سینے سے لگائے اور پانی کی شیشی پر نگاہیں جمائے کسی ایسی دردناک فلم کا اشتہار سی لگتی تھی جس کا آج آخری شو ہو!

جب ہم مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو سب سے پہلے گاگو کسائی نے گافتری کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے اسے ہلایا اور پھر کہنے لگا "کیا حال ہے پتر مادھو بیٹھے کا؟" گافتری سسکیاں بھر کر رونے لگی تو گاگو بولا "ہے ناں بے قوف، تھڑ دلی۔ اللہ مولیٰ نے کل سویر تک فضل کر دینا ہے اور اس نے بھاگے پھرنا ہے۔" پھر اس نے بسم اللہ پڑھ کر شیشی کے کھلے منہ میں پھونک ماری اور مادھو پر دم کر کے آگے بڑھ گیا۔

دوسرے نمازیوں میں سے بھی چند ایک بزرگوں نے شیشی پر دم کیا اور گافتری کے سر پر پیارے کر آگے چلے گئے۔ میرے ابا چونکہ بوٹ پہن کر مسجد میں آتے تھے اور سیڑھیوں پر بیٹھ کر آرام سے تسمے کھولتے اور باندھتے تھے اس لئے سب سے آخر میں ہم باہر نکلے۔ ابا جی نے آیت الکرسی پڑھ کر شیشی پر دم کیا اور تین مرتبہ یا جی یا قیوم اونچی آواز میں کہہ کر مادھو پر پھونک ماری۔

ہمارے قصبے میں اکثر، مغرب کے وقت بہت سی غیر مسلم عورتیں اور لڑکیاں پانی پر دم کرانے کے لئے مسجد کے دروازے پر موجود ہوتیں۔ نمازی ایک ایک کر کے ان کے گلاسوں، کٹوروں اور بوتلوں پر دم کرتے اپنی اپنی راہ نکل جاتے۔ میں اس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اگر میرا ایک سال مارا نہ گیا ہوتا تو میٹرک پاس کر چکا ہوتا، لیکن میری کبھی یہ جرات نہ ہوئی کہ ابا جی سے پوچھوں کہ مغرب کے وقت یہ عورتیں کہاں سے آ جاتی ہیں اور ان کے گھروں پر کیا مصیبت ٹوٹی ہے جو انہیں ہر روز ہی پانی پر دم کرانے کے لئے جانا پڑتا ہے۔ پھر دم کئے پانی سے یہ ضروری تو نہیں کہ مریض اچھا ہی ہو جائے۔ کئی مر بھی جاتے ہیں۔ کچھ دائم المرض بھی ہو جاتے ہیں۔ کئی ایک تھوڑا عرصہ تجربہ کرنے کے بعد چھوڑ بھی جاتے ہیں۔ لیکن یہ ساری باتیں میرے استفسار کا حصہ نہ تھیں۔ میں اپنے ابا جی سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ دم کرانے آتے کیوں ہیں؟ مجھے ان کے چھوڑ جانے پر اعتراض نہیں تھا، ان کے چلے آنے پر تعجب تھا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے وہ ہمارے

طرف ہی کیوں چلے آ رہے ہیں۔ لیکن آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے اپنے ابا جینوں سے ایسے سوال پوچھے نہیں جاسکتے تھے۔ وہ غیر ترقی یافتہ زمانہ تھا اس لئے اپنے بڑوں سے غیر ضروری باتیں نہیں کی جاسکتی تھیں۔

اگلی شام مین گاتری کو پھر مغرب کے وقت مسجد کے دروازے پر کھڑے پایا۔ مادھوا بھی تک زندہ تھا اور ایک جو تک کی طرح اس کے سینے سے؛ پٹا ہوا تھا۔ میراے حساب سے اسے رات کے وقت فوت ہو جانا چاہئے تھا لیکن وہ بدستور سانس لے رہا تھا اور باقی تھا، گلاس کے تن بدن میں زندگی کے آثار موجود نہ تھے۔ نمازیوں نے ایک بار پھر مادھو پر اور اس کے ساتھ آئی ہوئی شیشی پر دم کیا اور آگے نکل گئے۔ گاتری ہمارے قصبے کے دید جی ماتھر صاحب کی بیٹی تھی اور مادھو اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ ان کا چھوٹا سا گھر انا ایک چھوٹے سے گھر میں قیام پذیر تھا اور ماتھر صاحب اپنے گھر پر ہی مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ میں نے ان کے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے کئی مرتبہ دور دراز سے لائے ہوئے مریضوں کو چار پائیوں پر اور ڈولیوں میں پڑے دیکھا تھا۔ ان کے لواحقین گلی میں زمین پر بیٹھے یاد یواروں کے ساتھ ڈھول گائے کھڑے ہوتے اور ان کے چہروں پر مایوسی کے نقوش کے علاقہ اور کوئی لکھت نہ ہوتی اور ان کے بند گے ہوئے ہاتھوں کے رخ آسمان کے سوا اور کسی طرف نہ ہوتے۔

گاتری کی عمر مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔ وہ سبز کناری کی میلی سی دھوتی باندھے اور بالوں میں پیتل کے کلپ لگائے مسجد کے دروازے پر کھڑی تھی اور اس کی گود میں زندہ بچ جانے والا مادھو تھا جس کے سر پر کیسری ٹوپی، پاؤں میں نیلے رنگ کے موزے اور گلے میں پرانی دھجی سے بندھا ایک میلا سا تعویذ تھا۔ آج گاتری نے اپنا چہرہ پورا اٹھایا ہوا تھا اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے سفید گردن کرتی کے گریبان تک صاف عیاں تھی۔ آج اس کے ہاتھ میں شیشی کے بجائے پیلے کانچ کا ایک چھوٹا سا گلاس تھا اور پاؤں میں سلپروں کے بجائے اپنے سائز سے ذرا سی بڑی چپل تھی۔ اس روز ابا جی کسی وجہ سے مسجد نہ آ سکے تھے اور میں اکیلا ہی مغرب پڑھنے آیا تھا۔

جب سب نمازی گاتری کے گلاس پر دم کر کے آگے نکل گئے تو مسجد کے دروازے پر میرے قدم من من کے ہو گئے اور زمین نے میرے قدموں کو چنک کی طرح پکڑ لیا۔ سب نمازیوں کے چلے جانے کے باوجود گاتری اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑی رہی۔ میں نے زور لگا کر اپنی منمنی آواز میں کہا "ابا جی تو آج نہیں آئے۔"

مادھو ذرا سا ٹھنکا تو اس نے اپنے بھائی کو گودی میں جھلا کر اپنا گلاس میرے آگے کر دیا۔ مجھے آتا تو بہت کچھ تھا لیکن پیلے کانچ کے بڑھے ہوئے گلاس کو دیکھ کر مجھے سب کچھ بھول گیا۔ میں نے پورا زور لگا کر ہولے سے گلاس میں "پھو" کیا تو اس نے پہلو پھر کر مادھو کو میرے آگے کر دیا۔ مادھو کمزور تو اب بھی تھا لیکن اس کی صحت بحال ہو گئی تھی۔ کیسری ٹوپی میں وہ چھوٹا سا بوز نہ دکھائی دیتا تھا، جو اپنی بازی گرماں کے کرتب دکھا چکنے کے بعد اس کے پیٹ سے دوبارہ چمٹ گیا تھا۔ میں نے الحمد شریف پڑھ کر مادھو کے سارے وجود پر کھمبھی سی چھو کی تو گاتری کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ میں نے کچھ پڑھے بغیر ایک زور کی پھونک گاتری کے چہرے پر ماری تو اس کی دونوں آنکھیں روشن ہو کر چہرے کو لودینے لگیں۔ پہلے وہ کبھی اتنی خوب صورت نہیں تھی جتنی مغرب کے بعد ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی راہ پر جاتے ہوئے اسے واپس مڑ کر دیکھا۔ وہ اور مادھو ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔

دوسری مرتبہ جب میں گاتری سے ملا تو اس نے پھر سبز کنی والی دھوتی باندھی ہوئی تھی مگر اس مرتبہ اس کی دھوتی پہلے کے مقابلے میں زیادہ کسی ہوئی تھی اور اس کے پاؤں ایک نرتکا کے انداز میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ اس کے بائیں گال پر ایک چھوٹا سا پھاہا لگا تھا جس کے نیچے ایک طاقت ور کیل کا ابھار تھا۔ یہ گرمیوں کی چھٹیوں کی بات ہے اور میں شہر کے بڑے کالج سے تین مہینے کی چھٹیاں گزارنے گھر آیا تھا۔ جب میں آہستہ روی کے ساتھ ان کے دروازے کے اندر جھانکتا ہوا آگے بڑھا تو ماتھرجی نی آواز دے کر مجھے پکارا۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ ماتھرجی نے گرج دار ہانک لگا کر کہا "میاں ادھر کدھر دیکھ رہے ہو، میں نے تمہیں پکارا ہے۔"

ماتھرجی ایک بڑے سے تسلی میں گرم گرم کاڑھا بانس کی گھچی سے ٹھنڈا کر رہے تھے۔ گاتری ان کے پاس پیڑھی پر بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں ململ کا ایک براسا نکڑا تھا۔ مجھے آہستگی سے اندر آتے دیکھ کر انہوں نے کہا "سارا دن آوارہ کر دی کرتے ہو، کچھ کام بھی کیا کرو۔ اس ڈبے پر بیٹھو اور ادھر سے یہ کپڑا پکڑو۔" گاتری نے اپنی پیڑھی چھوڑ کر کہا "آپ ادھر آ جائیں، ڈبے پر میں بیٹھ جاتی ہوں۔" "جس کو میں نے جہاں کہہ دیا ہے، وہی جگہ اس کے لیے ٹھیک ہے۔" ماتھرجی نے گھچی باہر نکال کر گاڑھی دھار کو اپنی انگلی اور انگوٹھے سے چچایا اور پھر بولے "گھبرانا نہیں، گرم نہیں ہے۔ اور کنارہ چھوڑنا بھی نہیں ہے۔ پلو پکڑتے ہیں تو خوب مضبوطی سے پکڑتے ہیں۔ سمجھے!"

میں نے "جی سمجھ گیا"۔ ڈبے پر بیٹھ کر ایک طرف سے ململ کا کنارہ میں نے پکڑا اور دوسری طرف سے گاتری نے۔ ماتھرجی نے کاڑھے کا ایک ڈونگا بھر کر ململ کی جھولی میں ڈالا اور بولے "یہ چین پر اش ہے۔ اس کا نسخہ مکھنوں میں بھی نہیں ملتا۔ ہمارے گھرانے کا خاص کمال ہے۔ بنگالیوں کو بھی اس کا علم نہیں۔"

گاتری نے مسکرا کر کہا "بابو جی کے گھرانے کا ہر کمال خاص کمال ہوتا ہے۔"

بابو جی نے ڈونگا روک کر کہا "پوچھ لے اپنی ماں سے کہ اس کے مقابلے میں ہمارا گھرانہ کیسا تھا۔ میرے بابا تو یہاں نیوتہ نہیں دیتے تھے پر گاؤں والوں نے انہیں مجبور کر دیا۔"

میں نے حوصلہ کر کے کہا "ماتھرجی مجھے تو چاچی جی کے قد بت سے ان کا گھرانہ بڑا معلوم ہوتا ہے۔"

ہنس کر بولے "اس کا قد بت تو ہمارے گھر آ کر بڑا ہوا اور نہ گاتری کی پیدائش سے پہلے تو یہ بالکل چڑیا سی تھی تمہاری چاچی۔"

گاتری نے کہا "باتوں میں نہ پڑ جائیں، کپڑے کی طرف بھی دھیان رکھیں۔ آپ کے ہاتھ سے پلو پھسلا جا رہا ہے۔" میں نے چونک کر دیکھا تو واقعی میری طرف کے کونے کی ایک چنٹ ڈھیلی ہو کر اوک سی بنائے کھڑی تھی۔ میں نے جلدی سے اوک کی طناب کھینچی اور چوکس کے ساتھ کنارہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

مادھوگلی ڈنڈا ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا تو ماتھرجی نے کہا "اوئے مڈے سلام کر بھیا کو جس کی پھونک سے تم کو نیا جیون ملا ہے۔"

میں نے کہا "ناں ماتھرجی، ناناں۔ میں کون ہوتا ہوں جیون کو ہینڈل کرنے والا۔ اس کو نیا جیون تو اسی نے دیا ہے جس نے پہلا

جیون دیا تھا۔"

"پر آپ لوگوں نے پانی پر بھی توسی کا نام پڑھ کر پھونکا تھا۔" گاتری نے کہا "آپ لوگ نہ ہوتے تو اس وقت مودھو بھی نہ ہوتا!"

"یہ لوگ بھی نہ ہوتے اور تیری دھرو دوتا بھی نہ ہوتی تو میرا گھرانہ ہیرا گھپ ہو جانا تھا۔ جس بینتی کی مورت بن کر تو ہر شام مسجد کے دوارے کھڑی ہوتی رہی ہے، اس پر تو بھگوان کو ترس آنا ہی تھا۔ میں تجھے برگد کی اوٹ سے ہر شام دیکھتا تھا اور روتا تھا۔"

"پھر تو آپ کے آنسو کام آئے بابو جی" گاتری نے چمک کر کہا۔

"میں مادھو کے لئے تھوڑی روتا تھا مورکھ" ماتھرجی نے چڑ کر کہا "میں تو تیرے لئے روتا تھا کہ بھائی کے لئے کس طرح ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔"

"اتنی دیر کھڑے ہونا کون سا مشکل ہے ماتھرجی" میں نے شرارتاً کہا "مغرب کی نماز تو بہت مختصر ہوتی ہے۔"

ماتھرجی نے اچھی بھلی باتوں کے رخ کو موڑ کر اچانک مجھ سے پوچھا "اچھا جی، تم کیا پڑھ کے دم کرتے تھے مادھو پر؟"

میں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا "ماتھرجی میں تو ہمیشہ الحمد شریف پڑھ کر ہی دم کیا کرتا تھا۔"

الحمد شریف کا نام سن کر انہوں نے ڈونگا واپس کاڑھے میں ڈال دیا اور کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے "میرے پتاجی رات کو سوتے وقت الحمد شریف کا ورد کیا کرتے تھے اور پھر ورد کرتے کرتے سو جاتے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے یہ سورۃ یاد کرانے کی کوشش کی لیکن ایک تو میری زبان نہیں پلٹی اور دوسرے مجھے داھر مک باتوں کا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ بات بچ ہی میں رہ گئی۔ کپرا کھینچ کے رکھو، سارا ماوا بنا چھٹے اندر گر رہا ہے۔"

میں نے کپڑے کا کونہ پھر سے ٹھیک کیا اور کھسیانا سا ہو کر پوچھنے لگا "ماتھرجی! دم درد کا واقعی کوئی اثر ہوتا ہے یا انسان نے اپنے دل کی تسلی کے لئے یہ سہارا ڈھونڈ لیا ہے؟"

"ہمارا مودھو تو آپ کے سامنے ہے۔" گاتری بولی "مہینہ بھر بابو جی نے اس کا علاج کیا۔ پھر شہر لے جا کر ٹیکے لگواتے رہے۔ جو دوا جس نے بتائی، اس کو دی پر یہ تو نگھرتا ہی چلا گیا۔"

"بات یہ ہے" ماتھرجی نے ہماری جھولی میں کچی پھیرتے ہوئے کہا "یہ سب بھگوان کے بھید ہیں اور اصل علم اسی کے پاس ہے۔ پر جب کوئی اس کی چوٹ پر گھٹنے ٹیک کے اور سیس نوا کے اپنا آپ پورے کا پورا اس کے حوالے کر دیتا ہے تو وہ اپنی مرضی بھی تبدیل کر لیتا ہے۔ ہم سے تو یہ کام نہ ہو سکا۔ نہ مجھ سے نہ اس کی ماں سے، پر گاتری نے بینتی کر کے بھگوان کی اچھی بادلوالی۔"

میں ابھی کچھ دیر اور وہاں بیٹھتا لیکن کاڑھا سارے کا سارا چھن گیا اور میرے کرنے جو گا اور کوئی کام باقی نہ رہا۔ میں اٹھنے لگا تو گاتری نے کہا "میں آپ کے لئے مالٹے لاؤں؟ ہمارے گھر بہت ہی اچھے مالٹے آئے ہیں، ریڈ بلڈ۔"

میں نے کہا "مجھے کل سے زکام ہے اور۔۔۔۔۔"

"زکام ہے!" ماتھرجی نے کڑک کر کہا "تو پھر تمہارے لئے ہر کھٹ چیز منع۔ سنگترے، مالٹے اور نیبو کے تو قریب بھی نہیں جانا۔ نام تک نہیں لینا ان کا۔ مالٹا تو ریشہ بڑھا دیتا ہے، سر اور گردن پکڑ لیتا ہے۔ اس کو اندر سے املاش کی اوولیہ لاکر چٹاؤ۔"

گاتری امتاش کی جوارش لے کر آگئی تو میں نے ماتھرجی کی آنکھ بچا کر اپنا منہ چھج کے آگے کر دیا۔ وہ ٹھٹھکی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ بابو جی سر نیچے جھکائے پونچھا پانچھی کر رہے ہیں تو وہ مجھے جوارش چٹانے لگی اور ہر چاٹ کے بعد چھج گھا کر آگے کرنے لگی۔ پرسوں جب میری پوتی کی حالت بہت ہی خراب ہوگئی تو میں گھر سے کانچ کا ایک گلاس لے کر مسجد چلا گیا۔ وضو کی ٹونٹی سے اس میں پانی بھرا اور نماز کے بعد ہر نمازی سے اس پر دم کروایا۔

واپسی پر جب میں نے پڑھا ہوا پانی اپنی بہو کو دیا تو اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور بڑی محبت سے کہا "ابو وائرس اور جراثیم پر یہ پانی کس طرح سے اثر انداز ہو سکتا ہے، اس میں تو اپنے بہت سے جراثیم ہوں گے۔ میں نینا کو ابلا ہوا پانی دیت ہوں، وہ بھی نکال دیتی ہے۔ یہ پانی تو اس کے لئے بہت ہی خطرناک ہوگا۔"

جب میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ احترا مابولی "میں اس کو زمین پر نہیں گراؤں گی، اپنی منی پلانٹ کے پودے میں ڈال دوں گی۔ مجھے پتہ ہے پڑھے ہوئے پانی کو زمین پر نہیں پھینکا کرتے۔"

میں چپ چاپ اس کے کمرے سے یوں باہر نکل گیا جیسے میں آخری مرتبہ گاتری کے گھر سے نکلا تھا!

Virtual Home
for Real People

بدلی سے بدلی تک

اس وقت رات کے بارہ ساڑھے بارہ ہوں گے جب ایک بدلی دبے پاؤں آگے بڑھی اور بستی پر برسنے لگی۔ چھتوں کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ چار پائیاں گھسنے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ بچے زور زور سے چلانے لگے۔ محمود جلدی سے اٹھی اور بوکو گود میں اٹھا کر ننگے پاؤں برساتی میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے ہولے سے اپنے خاوند کو پکارا اور پھر ٹھکتے ہوئے بچے کو تھپکنے لگی۔ اس کا خاوند جو گرمیوں میں بھی چادر اوڑھ کر سونے کا عادی تھا، چادر بھیگ جانے سے ہڑبڑا کر اٹھا اور نیند میں اپنی چار پائی گھسیٹتا ہوا برساتی میں آ گیا۔ محمود نے ہولے سے کھنکار کر کہا "میری چار پائی بھی کھینچے لائیے گا۔ میں بوکو لئے کھڑا ہوں۔" اس نے سوئی ہوئی آواز میں "کیا" کہا اور باہر جا کر اس کی چار پائی بھی گھسیٹ لایا۔ پھر وہ بورے کی طرح اپنی چار پائی پر گرا اور وہی سیلی چادر لپیٹ کر دراز ہو گیا۔ محمودہ بوکو کند گے سے لگائے اپنے بستر پر جھکی اور گیلے بستر پر ہاتھ پھیر کر پھر سیدھی کھڑ ہو گئی۔ بوکو تھپکتے ہوئے اس نے اپنی نگاہیں بہت دور ایک چوبارے کی دیوار میں جلتی ہوئی بتی پر جمادیں، جو برستی ہوئی بوندوں کے پیچھے دیوالی کے آخری چراغ کی طرح جھللا رہی تھی۔ بواب کافی بھاری ہو گیا تھا، اس لئے محمودہ یکے بعد دیگرے ایک ٹانگ پر جسم کا بوجھ ڈال کر اسے تھپکتی رہی۔ پیلا سا قمقہ چھینٹوں کے پیچھے ٹمٹار ہاتھ اور وہ اوپر کے دھڑکودائیں بھائیں جھلاتے، زبان ہلائے اور لب کھولے بنا اپنے بچے کو لوری دے رہی تھی۔ جب وہ تھک گئی اور اس کے کٹنوں سے پٹھوں کے کرکنے کی آواز آنے لگی تو اس نے آگے بڑھ کر اپنے خاوند کا کندھا چھوتے ہوئے کہا "بوکو اپنے ساتھ لٹا لیجئے۔ میرا بستر بالکل بھیگ گیا ہے۔" کندھے پر دباؤ محسوس کر کے اس کے خاوند نے ہی اوں اوہ کرتے کر دت بدلی اور تین چار مچا کے مار کے پھر خاموش ہو گیا۔ بچے کو اس کے پہلے میں لٹا کر محمودہ اپنی چار پائی کی طرف لوٹ آئی اور بستر پر ایک مرتبہ پھر ہاتھ پھیر کر برساتی میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کونے میں ٹین کی کرسی پر ایک کھٹولی کو جھلنگا پر اتھا۔ بان کے ڈھیر کو آہستہ سے اٹھا کر اس نے کرسی نکالی اور اپنی چار پائی کے قریب ڈال کر اس پر بیٹھ گئی تھیں۔

اس نے اپنے پاؤں چار پائی کی پٹی پر رکھ لئے، دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا لیا اور سوچنے لگی کہ اب تو پیٹ میں کوئی خاص درد نہیں اٹھا۔ بوکو اٹھائے رکھنے سے یونہی ذرا سی تھکن محسوس ہونے لگی ہے، ورنہ پیٹ تو بالکل ٹھیک ہے۔

پانچ سال پرانی ایک رات گر بہ پانی سے برساتی میں در آئی اور محمودہ کے گرد بحر ظلمات کی دھند بن کر لپٹ گئی۔ اس رات جب گھر

کے جملہ افراد چھت پر سرور ہے تھے، وہ آہستہ سے اٹھی تھی اور بیٹھک کا دروازہ کھول کر گلی میں سوئے ہوئے لوگوں کی چار پائیوں سے بچتی بچاتی ناصر کے یہاں پہنچ گئی تھی۔ ناصر بھی اپنی چار پائی چھوڑ کر نیچے آ گیا تھا کیونکہ اس نے محمودہ کو اپنے بستر سے اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اس کا ارادہ بھی بھانپ گیا تھا۔

تین دن پہلے محمودہ برآمدے میں ناصر کی ماں سے باتیں کر رہی تھی اور کھیرے کی قاش ایسے ہاتھ میں پٹکی کی ڈنڈی گھاگھا کر اسے ہوا کر رہی تھی۔ ہر مرتبہ وہ پٹکی ذرا روک کر گوشہ چشم سے ناصر کی طرف دیکھتی، جو کوٹھڑی میں کرسی پر بیٹھا اسے تکیے جا رہا تھا۔ ناصر کی ماں قرآن شریف پر سبز رنگ کا نیا غلاف چڑھا رہی تھی، محمودہ پٹکی جھل رہی تھی اور ناصر ٹکلی باندھ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا سر میز پر مارا۔ اس کھڑاک پر محمودہ نے پھر اس کی طرف دیکھا اور ماتھے پر بل ڈال کر سمجھایا کہ ناں، یوں نہ کرو۔ مگر ناصر نے اس کی تحکمانہ التجا پر کوئی توجہ نہ دی اور کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کتنی دیر تک محمودہ نے اسے نہ دیکھا اور وہ اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔ جب اس کی ماں سوئی میں دھاگہ ڈالنے کی کوشش کرنے لگی تو محمودہ نے ننکھیں سے ادھر دیکھا اور اس کے ادھر دیکھتے ہی ناصر نے دیوار میں ٹکر ماری۔ محمودہ سہم گئی اور پٹکی چار پائی پر رکھ کر کہنے لگی "لاؤ خالہ، میں دھاگہ ڈال دوں۔"

خالہ نے سوئی اور دھاگہ اسے دے دیا اور خود کتریں سمیٹنے لگی۔ دھاگہ لے کر محمودہ نے کہا "خالہ یہ تو نسواری رنگ کا ہے، اس کپڑے پر تو برا لگے گا۔ سبز یا زہرے رنگ کا نہیں ہے؟" خالہ نے دھاگہ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "بھول پڑے میری عقل پر، اپنی طرف سے تو میں سبز دھاگہ میں نکال کر لائی تھی اور یہ بن گیا نسواری۔" بیٹ اب رنگ بھی تو نہیں پہچانا جاتا۔ "وہ آہستہ سے انھیں اور سبز دھاگہ تلاش کرنے لڑکوں والے اندر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی محمود لپک کر ناصر کے پاس پہنچ گئی اور دانتوں سے انگوٹھا کاٹ کر کہنے لگی "جاؤ، میں نہیں تمہارے ساتھ بولتی۔"

محمودہ نے باہر جھانکی لگا کر کہا "یوں نہ کیا کرو۔ اچھے ہوئے نا۔ ایسے کرو گے تو میں یہاں آیا ہی نہیں کروں گی۔" ناصر نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور کرسی پر بیٹھ کر سر میز پر ڈال دیا۔ محمودہ کوٹھڑی سے کھسک کر پھر چار پائی پر آ بیٹھی اور سوئی کے ناکے میں پھونکیں مارنے لگی۔

ناصر نے جب آہستہ سے دروازہ کھولا تو محمودہ دبلیز پر کھڑی تھی۔ جب وہ اندر ڈیوڑھی میں داخل ہو چکی تو ناصر نے پھر دروازہ بھیڑ دیا اور وہ بغیر کچھ کہے بیٹھک کے بیچ قالین پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ محمودہ نے ہولے سے کہا "آخر کب تک یہ حلیہ بنائے رکھو گے؟"

ناصر بے حد جذباتی ہو گیا اور رونی آواز میں بولا "مجھے مار کیوں نہیں دیتی؟ مجھے ختم کیوں نہیں کر دیتی ہو؟ میرا گلا کیوں نہیں گھونٹی؟" محمودہ نے مسکرا کر کہا "اچھی بات ہے۔ ابھی لو۔ ابھی تمہارا گلا دبائے دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے قاش سا ایک ہاتھ اس کی گدی پر رکھا اور دوسرا گلے پر۔ دونوں ہاتھوں کو ہولے سے دبایا۔ پھر اس کا سر اپنی طرف کھینچ کر اور ایڑیاں اٹھا کر اپنے ہونٹ ناصر کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ اور اتنی حوصلہ مند لڑکی کی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں پانی بن گئی۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے ناصر سے کہا "میں نے پرسوں تم

سے کہا تھا کہ ایسے نہ رہا کرو، مگر تم مانے ہی نہیں۔ ذکیہ کہہ رہی تھی کہ دو دن تم کالج بھی نہیں گئے اور کمرے میں ہی بیٹھے رہے۔ کیوں نہ گئے بھلا؟"

ناصر نے کہا "مجھے پڑھنا اچھا نہیں لگتا" اور صوفی سے کھسک کر اس کے پاؤں میں بیٹھ گیا۔

محمودہ نے کہا "کالج نہیں جاؤ گے اور اسی طرح بھوت پریت بن کر کمرے میں بند رہو گے تو آخر کب تک؟"

"جب تک تم بٹھائے رکھو گی۔" ناصر نے اس کے گھٹنوں پر سر ڈال دیا اور کہا "جب تک تم بٹھائے رکھو گی محمودہ۔"

"تو پھر تم کہہ کیوں نہیں دیتے؟" محمودہ نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"تم اباجی کو نہیں جانتی ہو۔" اس نے سراٹھا کر کہا "وہ بڑے ظالم ہیں، بڑے ظالم۔۔۔۔"

ابھی اس نے فقرہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ ایک بدلی دبے پاؤں آگے بڑھی اور بستی پر برسے لگی۔ چھتوں کی بتیاں ایک ایک دو دو کر کے جل اٹھیں اور گلی میں سوئے ہوئے لوگ اپنی اپنی چار پائیاں اٹھا کر اندر بھاگنے لگے۔ اس اچانک گڑبڑ سے گھبرا کر محمودہ اور ناصر ڈیوڑھی میں آگئے۔ اور جب محمودہ کو معلوم ہوا کہ بوندیں برسے لگی ہیں تو اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھا اور وہ درد سے دوہری ہو کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اپنی دونوں مٹھیاں کس کر اس نے پیٹ میں دے لیں اور نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں دبایا۔ ایک تیز دھار فولادی چھری اس کے پیٹ میں آہستہ آہستہ گھومنے لگی اور اس کے ماتھے پر ٹھڈے پسینے کے قطرے قطار اندر قطار جمع ہونے لگے۔ بیٹھے بیٹھے اس کے پیٹ کی گھڑی سے ایک ہاتھ نکالا اور ناصر کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ آہستہ آہستہ اس کے ناخن ناصر کی جلد میں دھسنے لگے اور درد سے بے تاب ہو کر وہ کنگرو کی طرح زانوؤں کے بل کھڑی ہو گئی۔ خوف بھری ملتجیانہ نگاہوں سے اس نے ناصر کی طرف دیکھا، مگر اندھیرے میں اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اس کا گلا خشک ہوتا جا رہا تھا اور ڈر کے پھندے کی گرہ ہولے ہولے پکپکی جا رہی تھی۔ چھت پر ناصر کی والدہ اور بہن چار پائیاں اندر برساتی میں کھینچ رہی تھیں۔ جونہی چھت سے چار پائیاں گھسنے کی آواز نکلتی، محمودہ کے پیٹ میں بھی ویسی ہی صدا بلند ہوتی اور اس کے ناخن ناصر کی جلد میں اور گہرے اتر جاتے۔

مگر بدلی جم کے نہ برسی اور ہوا سے اپنے کاندھوں پر اٹھا کر بستی سے دور لے گئی۔ محمود گرتی پڑتی ایک ایک قدم پر خارزار کا دھوکہ کھا تی اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی اور جب اس نے بیٹھک کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھلا ہی تھا۔ اس نے آہستہ سے کھٹکا چڑھایا اور بیٹھک میں صوفی پر لیٹ کر دامن سے اپنے آپ کو ہوا کرنے لگی۔



جب محمودہ کی مگنی کا سوال پیدا ہوا تو ناصر ڈر نہیں اور اس نے اپنی ماں سے جی کی بات صاف صاف کہہ دی۔ حسب توفیق ہلکی سی دھمکی بھی دے ڈالی۔ اس کے ظالم اباجی بھی گھبرا گئے اور ناصر کے بڑے بھائی کو تار بھیج کر بلوایا گیا۔ کئی دن تک اس معاملے کو سلجھانے کے لئے گھر میں چھوٹی بڑی نشستیں منعقد ہوتی رہیں، لیکن ناصر کے منہ کی لوٹی اتر چکی تھی اور معاملہ جوں کا توں رہا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اسے

بھائی کے ساتھ بھیج دیا جائے تاکہ بستی سے پرے جا کر اس کی طبیعت بہل جائے۔ چونکہ بڑے بھائی کے اس فیصلہ کے سامنے اسے گردن پھیرنے کی ہمت نہ پڑی اس لئے وہ سگ باش برادر خردمباش کہتا ہوا ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ بزرگوں کے خیال کے مطابق اس کا جی بہل گیا اور بھائی صاحب کی نگرانی میں اسے کالج داخل کروادیا گیا۔

ایک سال بعد محمودہ کی شادی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں اس ناصر کو تلاش کرنے لگیں جو دیواروں سے سر ٹکرایا کرتا تھا، اس کے پاؤں پر آنکھیں ملا کرتا تھا اور لفظ "محمودہ" کو متعدد روشنائیوں سے لکھ کر چوما کرتا تھا۔ محمودہ کے خاوند میں اور ناصر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اپنے خاوند کو دیکھ دیکھ کر اسے بار بار ناصر یاد آنے لگا جو بڑا ہی سادہ لوح، الہڑ، غصیل اور بات پر روٹھ جانے والا محبوب تھا۔ شام کے وقت جب وہ اور اس کا خاوند سیر کے لئے نکلتے تو پارک کی روشوں پر وہ کئی مرتبہ مڑ کر دیکھتی کہ اختر کے شعروں کی طرح ٹھہری ہوئی کرب ناک چاندنی میں اہنی تاروں کی باڑ کے پاس شاید کہیں ناصر ہی کھڑا ہو، جو اسے چھپ کر دیکھنے آیا ہو۔ لیکن اسے اپنے اس خیال پر خود ہی ہنسی آ جاتی اور جب اس کا خاوند پوچھتا تو کہہ دیتی "کوئی خاص بات نہیں۔ سکول کے زمانے کی ایک یاد بھر آئی تھی۔" اور اس طرح اس کے خاوند کو محمودہ کے سکول اور اس کی یادوں پر غصہ آنے لگتا۔

محمودہ کا اندازہ تھا کہ اس کی شادی کے بعد ناصر نگری نگری پھرے گا اور گھر کا رستہ بھول جائے گا۔ مگر ناصر گھر کا رستہ نہ بھول سکا اور ان نگریوں کو بھول گیا جو محمودہ نے بسائی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شادی کے بعد اس کی داستان محبت کا ایک آدھ باب اس کے خاوند تک ضرور پہنچے گا۔ وہ عمر بھر ساری کہانی سننے کے لئے اصرار کرتا رہے گا اور وہ مکررتی رہے گی۔ زبان سے انکار کرتی جائے گی لیکن آنکھوں سے بیان کرتی رہے گی۔ اور جہاں اس کے خاوند کو جذبہ رقابت سے تکلیف پہنچے گی، وہاں مسرت بھی ہوگی میری بیوی کوئی معمولی عورت نہیں، لو گ اس کے آستان ناز پر سرنیاز بھی جھکاتے رہے ہیں۔ لیکن یوں نہ ہوسکا۔ اس کے خاوند نے اس سلسلے میں کبھی گفتگو ہی نہ کی۔ اور اگر کی بھی تو اس میں استفسار کا پہلو نہ پیدا ہوا۔ محمودہ کا خاوند نہ الہڑ تھا نہ غصیل اور نہ ہی بات بات پر روٹھنے والا محبوب۔ وہ تو اول سے آخر تک سر کاری ملازم تھا۔ سر سے پاؤں تک سنٹرل ایکسائز انسپکٹر! ہاں کبھی کبھار چھٹ کے دن تھوڑی دیر کے لیے وہ خاوند بھی بن جاتا۔ اور اگر ذرا اور فرصت ملتی تو بوکوبا بھی! _____ کبھی کبھی تو محمود کے جی میں ایسی بری بات بھی آئی کہ اگر اب کہیں ناصر مل جائے تو اپنے خاوند اور بوکو چھوڑ کر اس کے ساتھ بھاگ جائے۔ مگر یہ بات، بات ہی رہی کیونکہ شادی کے بعد تو اسے ایک مرتبہ بھی ناصر سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا اور نہ ہی نا صراس کی طرف ملتفت ہوا۔ اسے ناصر کی ٹھنڈی گرمیوں پر رہ رہ کر غصہ آنے لگا اور وہ بڑی قہقہے کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ مرد کی ذات بے وفا ہی ہوتی ہے۔

آج اس واقعہ کے پورے پانچ سال بعد محمودہ ٹین کی کرسی پر بیٹھے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہ کیا ہوا! آج میرے پیٹ میں درد کیوں نہیں اٹھا؟ آج میرے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ کیوں نہیں آیا؟ اور آج ناصر میرے لئے کیوں لرز نہیں رہا؟ حالانکہ _____ حالانکہ _____ اس نے بوندوں کی ٹپا ٹپ کو غور سے سنتے ہوئے جی میں کہا آج تو بدلی بر سے چلی جاتی ہے، آج تو گلی میں سوئے ہوئے لوگ بڑی شدت سے ہڑ بڑا کر بھاگے تھے اور آج تو چھتوں کی بتیاں کتنی دیر تک جلتی رہی تھیں۔ پھر یہ کیا ہوا؟ آج ویسا خوف کیوں طاری نہیں ہوا؟ وہ روح

فرساطرب آگیں خوف! حالانکہ بوندیں ویسی ہی موٹی ہیں اور موسم ویسا ہی بکیلا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر پیٹ میں مٹھیاں دیتی، گرتی پڑتی ناصر کے ساتھ بھاگ جائے۔۔۔۔۔ اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔ مگر وہ کیسے جاتی اور کس کے ساتھ بھاگتی! ناصر تو اس کی ساتھ والی چار پائی پر چادر لپیٹ کے سو رہا تھا اور نیند میں مچا کے مار رہا تھا۔

www.HallaGulla.com



Virtual Home
for Real People

چاند کا سفر

گورنمنٹ کالج کی طرف مراجعت کے کئی راستے ہیں اور سارے راستے اپنے اپنے رخ پر چل کر اس منزل تک پہنچتے ہیں جو ہر راوین کے من کا مندر ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے سب سے مشہور، شیر شاہی اور جرنیلی سڑک تو برتری، تحفظ، منفعت اور پاوری سڑک ہے جس پر جم غفیر رواں ہے۔ لیکن کچھ راستے جذباتی وادیوں سے ہو کر بھی اس منزل طرف جاتے ہیں۔ ہم دونوں کا گورنمنٹ کالج سے بندھن ایک بہت کمزور اور کچے سے دھاگے سے بندھا ہے۔ ایک گم نام اور بے نام پگڈنڈی ہے جو خود رو جھاڑیوں اور گھنگیر لے رستوں سے الجھ الجھ کر بڑی مشکل سے من مندر تک پہنچتی ہے اور پھر وہاں سے تب تک اٹھنے کو جی نہیں چاہتا جب تک کہ کوئی وہاں سے اٹھانہ دے! نکال نہ دے!!

بونو قدسیہ نے اور میں نے گورنمنٹ کالج کو کبھی بھی ایک درس گاہ نہیں سمجھا۔ نہ کبھی ہم اس کی علمی روایت سے متاثر ہوئے اور نہ کبھی اس کے استادوں کے تجرعلی سے مرعوب ہوئے۔ اس کی قدامت، اس کی عمارت اور اس کی شخصی وجاہت بھی ہمیں مسحور نہیں کر سکی۔ اس سے کبھی کچھ لیا نہیں، مانگا نہیں، دیا نہیں، دلویا نہیں۔ پھر بھی اس کے ساتھ ایک عجیب سا تعلق قائم ہے جسے ہم آج تک کوئی نام نہیں دے سکے۔ دراصل ہم دونوں گورنمنٹ کالج کو درس گاہ نہیں مانتے۔ اس میں "سین" کے حرف کو دافر سمجھتے ہیں!

جب ہمارا پہلا بیٹا پیدا ہوا تو ہم من آباد میں رہتے تھے اور اپنے مکان کا کرایہ بڑی مشکل سے ادا کرتے تھے۔ میں ریڈیو میں ملازم تھا اور بانو پشاور کے لئے درسی کتابیں لکھ کر ساتھ، ستر روپے مہینہ گھر بیٹھے کمالتی تھی۔ بچے کے دودھ کا ڈبہ بیالیس روپے میں آتا تھا اور وہ ایک مہینے میں تین ڈبے ختم کر جاتا تھا۔ اس زمانے میں مٹی کے تیل کا چودہ بتیوں والا چولہا آگیا تھا اور ہمارا ایندھن کا خرچ کم ہو گیا تھا۔ بانو جب گورنمنٹ کالج کی سٹوڈنٹ تھی تو اس کی روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔ میں جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو گھر کا سودا لانے کے علم سے ناواقف تھا۔ شادی کے بعد ہم دونوں نے یہ دونوں فن سیکھ لئے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔ جب اسنق ڈیڑھ سال کا ہوا تو جون کے مہینے میں سخت بیمار ہو گیا۔ اسے اسہال اور قے کی شکایت ہوئی جو تین دنوں کے اندر اندر بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ محلے کی بڑ بوڑھیوں کے کئی نسخے آزمائے لیکن کسی سے افاق نہ ہوا۔ بچے کی حالت تشویش ناک ہو گئی تو ہمیں کسی نے بتایا کہ اسے ڈاکٹر بروچہ کے پاس لے جاؤ۔ بڑی گرمی میں سہ پہر کے چار بجے ہم "سالم تانگہ" کرا کر اسے ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر میکلوڈ روڈ لے گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے بچے کو الٹا پلٹا کر دیکھا۔ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کے پوڑے کھول کر معائنہ کیا اور پھر بانو سے مخاطب ہو کر بولے "بابا تم لوگ کیسا پیرنٹ ہے جواب اس کو ہمارے پاس لایا ہے۔ اس کا میں کیا ٹریٹ منٹ کروں؟" بانو زور زور سے رونے لگی اور جاہل فقیر نیوں کی طرح ہاتھ باندھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلتی تھی اور وہ خوف کے مارے روئے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کاؤنٹر پر جا کر پانچ چھ دواؤں کے امتزاج سے دودھیا رنگ کا ایملشن تیار کیا۔ اپنی میز کی دراز سے دس پڑیاں نکال کر دیں اور پھر ایملشن کی ایک خوراک مین ایک پڑیا گھول کر مجھے بچے کو مضبوطی سے پکڑ کر گود میں لٹانے کا حکم دیا۔ بڑی بے دردی کے ساتھ انہوں نے انیق کے جڑے میں انگلیاں کھبو کر اس کا منہ کھولا اور دوائی اس کے منہ میں انڈیل دی۔ بچہ اپنی نحیف آواز میں بڑے کرب کے ساتھ رویا تو میں نے اسے کندھے سے لگا دی۔ گود میں لے کر تو میں اسے کھڑا تھا لیکن بانو قدسیہ خوف سے کانپتی ہوئی اسے تھکے جا رہی تھی۔ اتنے میں بچے نے منہ بھر کر قے کی۔۔۔۔۔ گرم اور بدبودار تھوڑی سی میرے کندھے پر گری اور باقی ساری فرش پر۔

ڈاکٹر صاحب نے جھلا کر کہا "بابا تم کیسا پیرنٹ ہے، بچے کو سنبھالنا نہیں جانتا۔ سارا فرش خراب کر دیا۔ یہ کلینک ہے، کوئی تم لوگ کا گھر نہیں۔" ہم دونوں ہی ڈاکٹر صاحب کی ڈانٹ سے گھبرا گئے۔ ہمیں ڈاکٹروں کا اور ہسپتالوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پھر ہماری مالی حالت بھی معمولی سی تھی۔ شکل و صورت سے بھی ہم سہم ہی سہم تھے اور بچہ کافی بیمار تھا۔ بانو قدسیہ نے اپنا آدھا دوپٹہ تو سر پر محفوظ رکھا اور باقی کے آدھے دوپٹے سے ڈاکٹر صاحب کا فرش صاف کرنے لگی۔

اس نے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکے ہوئے تھے اور بائیں ہاتھ کو آگے بڑھا کر جھکے ہوئے بدن کا سارا بوجھ اس پر تول رکھا تھا وہ روئے بھی جا رہی تھی، شرمندگی سے سر بھی جھکائے جا رہی تھی اور سسکیوں سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے نارنجی اور کاسنی پھولوں والی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ سبز رنگ کی شلوار تھی اور پاؤں میں ہوائی سیلپر تھے جس میں سے ایک فرش پر ٹاکی مارتے ہوئے اتر گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا فرش پرانی اینٹوں کا تھا جن کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ کچھ اینٹیں بچے کو ہو گئی تھیں، کچھ سیم کی وجہ سے اوپر کو ابھرائی تھیں۔ اس اونچ نیچ کے درمیان دوپٹے سے جگہ صاف کرنا مشکل کام تھا لیکن بانو نے اپنے روزمرہ تجربے کے زور پر ساری جگہ اچھی طرح سے صاف کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے چور آنکھ سے اپنے فرش کو اس کی اصل حالت میں دیکھ کر کہا "بابا تم کیسا لڑکی لوگ ہے، سارا دوپٹہ خراب کر لیا۔ اب اس کو باہر جا کر دھوؤ۔ اچھی طرح سے صاف کرو، اس میں جراثیم چلا گیا ہے۔ بچے کے پاس نہیں لانا یہ کپڑا۔" میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب باہر نکلا ہے؟"

کہنے لگے "کیوں نہیں ہے۔ یہ ساتھ باجو میں گھوڑوں کے پانی پینے کا حوض ہے نہیں، اس میں پانی ہی پانی ہے۔ جا کر دھوؤ۔" میں بچے کو کندھے سے لگا کر کھڑا رہا۔ بانو نے آدھا دوپٹہ کھیل میں ڈال کر کھنگال لیا۔

ایسے وقت میں اور اس قدر شدید گرمی میں سڑک کنارے پیدل چلنا تو شاید اس قدر مشکل نہیں تھا لیکن ایک بیمار بچے کو کندھے سے لگا کر کلینک سے ذلیل و خوار ہو کر اور زمین سے بوٹ کے پرانے ڈبے کا گتا اٹھا کر اس سے مریض بچے کے چہرے کو چھاؤں کر کے چلنے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے کچے پڑے ہوئے تھے اور شرمندگی کی وجہ سے ہمارے سرواں پر نہیں اٹھتے تھے۔

سڑک پر کوئی سواری نہیں تھی اور ہمیں بس پکڑنے کے لئے ابھی بہت دور تک چلنا تھا۔ بچے کا بخار گرمی کی وجہ سے بڑھ رہا تھا اور با نوبار بار اس کے ماتھے اور لٹکتی ہوئی بے جان ٹانگوں کو چھو رہی تھی کہ بخار ہو رہا ہے یا بڑھ رہا ہے۔

اس دھوپ اور گرمی میں ہم اسی طرح سے چلتے رہے۔۔۔۔۔ تھکے تھکے، خوف زدہ، مایوس، بے مراد اور اکیلے۔ بیمار بچے نے کئی مرتبہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن گرمی کی شدت اور روشنی کی چمکوں نے اس کے پوٹے کھلنے نہ دیئے۔ ہم چلتے چلتے سوچتے سوچتے، چپ چاپ تے جی پی او کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں تار گھر کے پاس کئی تانگے کھڑے تھے۔ درخت کی چھاؤں تلے بیمار بچے نے آنکھیں کھول کر ایک سفید گھوڑے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈولتا ہوا سر ساکن کر لیا۔ میں نے تانگے میں بیٹھتے ہوئے کہا "گورنمنٹ کالج" اور بانو حیرانی سے میرا منہ تکتے لگی۔

کالج چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ پرندے شاخوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اونچی بلڈنگ کے سائے دور دور تک پھیل کر درختوں کے سائے سے مل گئے تھے۔ سارے میں ایک خوشگوار خاموشی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اپنے کلاس روم کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ انیق بانو کی گود میں لیٹا ہوا ایک اونچے درخت کی شاخوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں کو قریب سے دیکھنا چاہا تو مجھے بانو کے دوپٹے سے کھٹی کھٹی بوسی آئی۔ میں نے بچے کے چھوٹے سے ماتھے پر اپنا بڑا سا تھکا ماندہ چہرہ رکھا تو مجھے ایک بیماری ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ بچے نے مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو ماں کی جنت گم گشتہ لوٹ کر اس کی جھولی میں آ گئی۔ بانو نے اس کے پاؤں کو، ماتھے کو اور گلے کو چھو کر خوشی سے میری طرف دیکھا اور کہا "بالکل خواجہ منظور کی طرح مسکرایا ہے" خواجہ صاحب اپنی ساری زندگی میں صرف ایک بار مسکرائے ہوں گے لیکن بانو کے ذہن میں ان کی مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے سٹل ہو کر ایک فریم میں جڑی جا چکی تھی۔ پھر ہمارے ذہنوں میں اپنے ایام طالب علمی کا ایکشن ری پلے شروع ہو گیا اور طوطے اپنی چونچوں میں ڈالیا پکڑ کر ہاتھ چھوڑ کر کرتب دکھلانے لگے۔

بیمار بچہ اپنی ماں کی گود سے پھسل کر پہلے ایک سیڑھی پر کھڑا ہوا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر دوسری پر اتر ا اور پھر خود ڈمگاتے قدموں سے روش پر چلا گیا۔ وہ کوئی ڈیڑھ گز تک ایک طرف اور کوئی دو گز کے قریب دوسری جانب چلا اور پھر تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

ابھی ہمیں سیڑھیوں پر بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ نیلی پکڑی باندھے اور ہارہ میں چابیوں کا موٹا سا گچھا اٹھائے ایک شخص ہمارے طرف آیا اور قریب آ کر پوچھنے لگا "کون لوگ ہو تم"

میں نے کہا "ہم لوگ ہیں۔"

اس نے کہا "یہاں آنے کا اور بیٹھنے کا حکم نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کس کا حکم نہیں؟"

"پرنسپل صاحب کا" اس نے درشت لہجے میں کہا اور ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اٹھانے لگا۔ میں کہنے والا تھا کہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر زمین پر بیٹھے ہوئے اپنے بچے کو اٹھایا اور آہستگی سے چلنے لگی۔ میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا اور ہم تینوں آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم آگے کو جا رہے تھے اور گورنمنٹ کالج پیچھے کو ہٹا جا رہا تھا۔ ہم

نے پیچھے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ کئی بے ہودہ، نکمے، بد ہیئت اور بے کار لوگ درگاہوں سے اٹھادیئے جاتے ہیں اور ان کے بعد فرش دھلادیئے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن ان کے دلوں کے فرش پر درگاہوں کی صورتیں ویسے ہی قائم رہتی ہیں۔

اصل میں گورنمنٹ کالج تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ اس کی طرف رخ نہ بھی ہو تو بھی یا تری اسی کی طرف کا سفر ہی کر رہے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جب Space Shuttle زمین سے چاند کی طرف چھوڑا جاتا ہے تو اس کا رخ چاند کی طرف نہیں ہوتا، پھر بھی اس کا سفر چاند ہی کا ہوتا ہے اور اس کی منزل چاند ہی ہوتی ہے۔



Virtual Home
for Real People

سہیل کی سالگرہ

بڑی مارکیٹ کے سامنے، سڑک کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے سینکڑوں لوگوں میں سے وہ یوسف کے سامنے آکر رکھا اور بولو "بارہ چودہ کے کمرے پر ایملشن کروانا ہے۔ گراؤنڈ تیار ہے۔ مال موجود ہے۔ شام تک کر لو گے؟"

یوسف نے مسکرا کر جواب دیا "کیوں نہیں سر۔ پندرہ برس سے یہی کام کر رہا ہوں۔ میرا باپ مشہور سفیدی والا تھا۔ ہمارا خاندانی پیشہ ہے۔ کروں گا کیوں نہیں۔"

ابرا صاحب نے کہا "چالیس روپے ملیں گے۔"

یوسف نے کہا "آپ چالیس بھی نہ دیں۔ کام ملنا چاہئے اور ہاتھ کی صفائی دیکھنی چاہئے۔ باقی اس دنیا میں کیا رکھا ہے سرجی

!"

سرجی جب اس کو اپنی کار میں سوار کرانے لگے تو یوسف کا کلیجہ کانپ گیا۔ ایسی نئی اور خوبصورت کار اس نے نہ تو کبھی سڑک پر دیکھی تھی اور نہ ہی اس کو خواب میں نظر آئی تھی حالانکہ یوسف جب بھی دیکھتا تھا، کار ہی کے خواب دیکھتا تھا۔ اور یہ شاید اس کے ماموں کی وجہ سے تھا جو کافی مشہور ڈینٹر تھا اور جس کے پاس بہت سی کاریں آتی تھیں۔

ابرا صاحب کی کار میں بیٹھتے ہوئے یوسف نے اپنا ڈبہ بچے کی طرح سینے سے چمٹا لیا اور اس کے اندر کے دونوں برش بالوں کے رخ کھڑے کر دیئے۔ موٹر میں احتیاط کے ساتھ بیٹھنا تو بڑے بڑوں کو نہیں آتا، یوسف بے چارے کا تو یہ صرف چوتھا موقع تھا کہ وہ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر اپنا آپ سنبھال کے رکھے اور اپنے گندے ڈول کو سوائے اپنے کپڑوں کے یا اپنے وجود کے اور کسی شے سے لگنے نہ دے۔

گاڑی سٹارٹ کر کے جب ابرا صاحب نے ہٹن دبا کر شیشے اوپر چڑھائے تو انہوں نے مسکرا کر پوچھا "پہلے بھی اتنی بڑی گاڑی

میں بیٹھے ہو؟"

یوسف نے کہا "نہیں سرجی۔" اور پھر شرمندہ سا ہو گیا۔

کمرہ بارہ چودہ سے ذرا بڑا تھا اور اس کی گراؤنڈ اتنی تیار نہ تھی جتنی یوسف کو بتائی گئی تھی۔ برش کی کھینچ سے دیواروں پر کہیں کہیں لس آتی تھی اور یوسف کو ریگ مال لگا کر وہ جگہ پھر سے تیار کرنی پڑی تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد جب یوسف نے کمرہ تیار کر دیا تو بیگم صاحب اس کے کام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ ابرار صاحب کو بھی اس کی آرٹسٹک صلاحیتوں پر کچھ فخر سا ہوا۔ انہوں نے چالیس روپے یوسف کو تھما کر بڑے خوشگوار انداز میں "تھینک یو" کہا اور اس کا کندھا تھپک کر بولے "اسی جگہ بیٹھتے ہونا ہر روز آکر۔" یوسف نے کہا "....." بیٹھتا تو اسی جگہ ہوں سرجی، مگر مجھے واپس چھوڑنے کا کوئی بندوبست کر دیجئے۔ میرا گھر اس جگہ سے بہت ہی دور ہے۔"

ابرار صاحب نے کہا "اگر تم تیز تیز قدم اٹھاتے نہر کا پل کر اس کر کے دائیں بائیں دیکھے بغیر بڑے ٹاور تک پہنچ جاؤ تو تمہیں آدھ گھنٹے میں بس سٹاپ مل جائے گا۔"

یوسف نے کہا "آج میرے بیٹے کی سالگرہ ہے سرجی اور اس نے گھر پر اپنے دوستوں کو بلایا ہوا ہے۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچا تو اس کی فنکشن رہ جائے گی۔ مجھے ابھی راستے میں کیک بھی خریدنا ہے۔"

بیگم ابرار نے انگریزی میں اپنے شوہر سے کہا "ہمارا کچلر پیٹرن کتنی تیزی سے بدل رہا ہے ابرار! اب مزدور لوگ بھی کیک کاٹ کر اپنے بچوں کی سالگرہ میں منانے لگے ہیں۔ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔!"

ابرار نے کہا "اس وقت نہ تو کوئی ڈرائیور ہے اور نہ ہی چھوٹے صاحب گھر پر ہیں اور نہ ہی میں شام کے بعد گاڑی چلا سکتا ہوں۔ اس لئے تم کو ایسے ہی جانا پڑے گا۔"

بیگم ابرار نے پھر انگریزی میں کہا کہ "ابرار! واپس چھوڑ کے آنا تو ہماری ذمہ داری نہیں ہے ناں" تو ابرار نے جواباً کہا "سویٹ ہا رٹ! دراصل ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کو ہینڈ سم معاوضہ ادا کر دیا گیا ہے، پسینہ سوکھنے سے پہلے۔"

جب یوسف گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ بازار میں ابھی کچھ لوگ دوکانوں کے سامنے بیٹھے تھے، لیکن اس کے گھر کی گلی بالکل سنسان ہو چکی تھی۔ جب یوسف نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی تو اس نے کیک کا ڈبہ آگے کر لیا تاکہ سہیل ڈبہ دیکھ کر اسے کچھ کہے نا۔ رضیہ نے دروازہ کھولتے ہی کہا "ابھی روتے روتے سویا ہے۔"

یوسف نے کہا "میں تو سارا راستہ بھاگتا آیا ہوں۔ نہ کوئی بس نہ لاری۔ کام ہی اتنی دور ملا۔ رکشے کے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ کیک تو بہت ہی مہنگا ہوتا ہے رضیہ!"

رضیہ نے کہا "اب یہ کیک کس کام کا! سہیل بے چارے کی جو بے عزتی ہوئی تھی، وہ تو ہو گئی۔"

"اس کے دوست آئے تھے؟" یوسف نے پوچھا۔

"کیوں نہیں آئے تھے۔ سارے ہی تھے۔ نو دس۔ اور جب انہوں نے تالیاں بجائیں تو سہیل میرے ساتھ چٹ کر زور زور سے رونے لگا۔ میں نے کہا، ہائے ہائے! کوئی اپنی سالگرہ کے دن بھی روتا ہے۔ وہ مجھے دھکا دے کر اندر کوٹھڑی میں بھاگ گیا اور اندر

سے دروازہ بند کر لیا۔"

"اگر مجھے دیر ہو گئی تھی تو تو ہی کچھ کر لیتی رضیہ۔"

"لو میرے پاس کون سے پونڈ رکھے تھے جو میں کوئی بندوبست کر لیتی!"

"کسی سے ادھار سودھار ہی لے لیتی۔"

"اسی طرح سے تو کیا میں نے۔" رضیہ نے فخر سے کہا "جب سارے لڑکے تپائی کے گرد کھڑے ہو گئے تو اللہ نے میرے دماغ میں اپنے فضل سے ایک بات ڈال دی۔ میں کمے کاندروں کی دوکان سے ایک ڈبل روٹی ادھار لے آئی۔ چھری تو سہیل صبح سے دھو کے، صاف کر کے، چمکا کے بیٹھا تھا۔"

"بڑی ڈبل روٹی لانی تھی۔" یوسف نے بات کاٹ کر کہا۔

"ہا! تو میں کوئی بو وقوف ہوں جو چھوٹی لاتی، بڑی لائی تھی۔ ساڑھے چار روپے والی۔۔۔ پر اس کو پتہ نہیں کیا ہوا۔ جب میں نے ڈبل روٹی تپائی پر رکھ کر اسے کاٹنے کو کہا تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کے دوست اللہ رکھے تالیاں بجائیں اور یہ روئے جائے۔"

الو کہیں کا!"

"تو پھر کس نے کاٹی ڈبل روٹی؟"

"میں نے کاٹی، اور کس نے کاٹی تھی۔ سب سے دو دوسلاں کھائے بڑے شوق سے..... اور....."

"اور سہیل نے؟"

"یہ تو بھاگ کر اندر گھس گیا کوٹھڑی میں۔ اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں مامے رفیق کو بلا کر لائی تو انہوں نے آکر

دروازہ کھلوا یا _____ سچیں بڑا ہی رویا ساری شام _____ ٹھریں تیرے لئے لاون گرم کردوں۔"

"رہنے دے! دفع کر!" یوسف نے چڑ کر کہا "میری بھوک ہی ماری گئی ہے۔"

"ہا۔۔۔ تیری بھوک کیوں ماری گئی یوسف! صبح اٹھ کر جب کیک دیکھے گا تو آپی سب کچھ بھول جائے گا۔"

یوسف اسی طرح منہ تھتھائے دروازہ کھول کر چپ چاپ باہر گلی میں نکل گیا اور تین سوئے ہوئے کتوں کے آگے کیک رکھکر بولا "

لوکتو کھاؤ۔ موج اڑاؤ۔"

پھر اس نے ہر کتے کی طرف اشارہ کر کے تین مرتبہ زور زور سے کہا:

"کتا! کتا! کتا!! کتا!!!"

اور صبح پھر کام پر جانے کے لئے گھر واپس آ کر سو گیا۔

www.HallaGulla.com



**Virtual Home
for Real People**